join eBooks Telegram
خاص نمبر
سوغات

join eBooks Telegram

(۱۲ - ۱۳ - ۱۴)

خاص نمبر

JULY 1962
OCTOBER 1962
JANUARY 1963

مدیر

محمود ایاز

قیمت: چار روپے

فون نمبر: 71986

۲۷/ کلائن روڈ - بنگلور ۵

مطبوعہ: رفتار پریس بنگلور ۱

join eBooks Telegram

سہ ماہی سوغات

خاص نمبر	قیمت : چار روپے
مقامِ اشاعت	۲۷؍ کلائن روڈ۔ بنگلور ۵
طباعت	رفتار پریس۔ بنگلور ۱

سالانہ چندہ	آٹھ روپے
معہ رجسٹری خرچ	دس روپے
فی شمارہ (عام)	دو روپے

خریداروں کو سوغات بک پوسٹ کے ذریعہ روانہ کیا جاتا ہے۔ جو حضرات سالانہ چندہ کے ساتھ رجسٹری کا خرچ روانہ کریں گے ان کو سوغات بذریعۂ رجسٹرڈ بک پوسٹ بھیجا جائے گا۔ بصورتِ دیگر ادارہ رسالہ کی عدم وصولی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

محمود ایاز، طابع، ناشر، مدیر نے رفتار پریس بنگلور ۱ سے چھپوا کر ۲۷؍ کلائن روڈ بنگلور ۵ سے شائع کیا۔

join eBooks Telegram

ملکیت و دیگر تفصیلات بابت
سہ ماہی سوغات بنگلور ۵

فارم (۴) چار، دفعہ (۸) آٹھ

مقام اشاعت : ۲۷ ر کلائن روڈ، بنگلور ۵

وقفۂ اشاعت : سہ ماہی

مالک، طابع، ناشر، مدیر: محمود ایاز

قومیت : ہندوستانی

پریس : رفتار پریس، بنگلور ۱

مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و دانست میں صحیح ہیں۔

محمود ایاز

مالک، طابع، ناشر، مدیر

[illegible]لور۔ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء

join eBooks Telegram

فہرست

join eBooks Telegram

ناول

نظمیں

join eBooks Telegram

غزلیں

join eBooks Telegram

join eBooks Telegram

راجندر سنگھ بیدی

افسانے

ببّل

لمبی لڑکی

جوگیا

مضمون

مختصر افسانہ
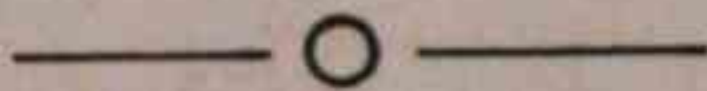
بیدی کا فن — محمد حسن

بھولا سے ببّل تک — باقر مہدی

دل کی بستی — شیام لال "ادیب"

(بیدی کے ناول پر تبصرہ) — خیر النساء

join eBooks Telegram

راجندر سنگھ بیدی

join eBooks Telegram

راجندر سنگھ بیدی

ببّل

درباری لال، شام گھڑی میں بیٹھا، سیتا کے ساتھ بیکار ہو رہا تھا۔

کسی کے ساتھ بیکار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں ایوننگ نیوز یا غالب کی غزلیں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

— سیتا نے تو کہا تھا وہ ٹھیک چھ بجے آر ورا سینما کی طرف سے آنے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہوگی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ کاسنی ہوگا، لیکن ——

درباری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب مہیشوری اُدیان ہوگیا ہے۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنا لئے تھے اور پھر ایکا ایکی ہاتھ کھینچ لئے، جواب تک کھنچے ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن ایکسچینج میں ان کا نوکر ساتھی مہتا صاحب کے مکھن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتا تو وہ جواب میں ہنس دیتے —— ایسی ہنسی جو آدمی تین چار لاکھ روپیہ اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے!

پھر، بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی تھی جنہوں نے بیس[۲۰] سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھابی بنایا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن، ستونتی ناگر، ایک لکھ پتی اسماعیل صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ گلی، محلے، پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو "پرسونا نان گریٹا"، اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر صلح ہو گئی۔ لڑکے کے رشتہ دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے لڑکے کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری موہن رکھا گیا ہے۔ لیکن سرداری موہن یا صالح محمد اپنا نام ہمیشہ ایس ایم تواب ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر غصہ نکالنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا

اس لئے درباری لال کے حواری حبیب بھی ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے ——"کیوں بے صاحب"؟

آج صاحب یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی۔ اس سے بہاری اور بھابی گن دتی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ عورتیں مثالی مرد اور مرد مثالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھنے لگے۔ درباری برآمدے میں بیٹھا اپنے بارے میں ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایکا ایکی وہ لپکا اور اپنے منہ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا " میں، درباری لال مہتا، ولد گردہاری لال مہتا، ساکن بمبئی ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا"۔۔۔۔۔ سب اس آواز پہ چونک گئے، عورتوں اور بچوں کی تو جان ہی نکل گئی۔

درباری اس واپس اپنی جگہ پر آکر ایوننگ نیوز کے ورق الٹنے لگا۔ اور پھر آزورا سینما کی طرف سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پہ دیکھنے لگا، جہاں اسے کاشنی رنگ کی ساڑھی کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آکر شامل ہو گئی تھی۔ درباری گھر بھر کا بانکا تھا جس طریقے سے وہ بالوں پہ ہیئر ٹانک لگاتا، محنت سے ان کو بٹھاتا۔ قینچی لے کر، آئینے کے سامنے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک نکالنے میں صرف کرتا، سب بانکپن کی دلیلیں ہی تو تھیں۔ بات دراصل یہ ہے شادی سے پہلے، عمر کے اس مرحلے میں لڑکے لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں کی سی۔ پھر شادی ہوتی ہے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جا کر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں۔۔۔۔۔ درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں، یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں اور مرد کہتے تھے —— بربادی کی!

برآمدے میں سکھ ترکھان نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل، بے قاعدہ اور کھُردری سی لکڑی کو چھیلتا، اس پر رندہ کرتا رہا تھا اور اسی لئے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چھپلیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں۔۔۔۔ جبھی سامنے ڈان باسکو اسکول میں گھنٹی بجی اور سفید سفید قمیص اور نیلی نیلی نکریں پہنے ہوئے لڑکے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، ہاسٹل کے کمروں سے نکلے۔ شاید وہ شام کی دعا کے لئے گرجے کی طرف جا رہے تھے۔ اسکول کی گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے، ابھی تک فادر، بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا۔ اس نے بھی سیٹی بجا دی، کھیل ختم کر دیا مگر ستیا نہ آئی۔۔۔۔۔۔

آزورا سینما کی طرف سے ادھر آنے والی سڑک پر کچھ گائیں السائی سی بیٹھی تھیں اور جگالی کر رہی تھیں۔ پھر اس جانب سے ایک کار اندر کی طرف مڑی اور دائیں طرف کی بلڈنگ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ جبھی ایک موٹی سی عورت آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے پیچھے مدراسی ہوٹل اڈپی کا مالک راما سوامی

join eBooks Telegram

آرہا تھا۔ وہ بھی موٹا تھا۔ اگرچہ وہ موٹی عورت اور اڈپی کا مالک راما سوامی ایک دوسرے کافی فاصلے پر تھے، تاہم یہاں، درباری کے ہاں سے یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو ٹھیلتے دھکیلتے کوئی عجیب سا کھیل کھیلتے آرہے ہیں۔

سیتا کی بجائے اُلٹی طرف سے مِصری چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح، آج بھی اس کی گود میں بچہ تھا — ببل!

بچہ اگر تندرست ہو تو دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتا ہے اور ببل ایسا ہی بچہ تھا۔ گول مٹول، نرم نرم، جیسے اسفنج کا بنا ہوا۔ اس نے یوں تو کئی دانت نکال لئے تھے لیکن نیچے کے دو دانت نسبتاً بڑے سے تھے، کمینہ ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا۔ آج تک کوئی ایسا دکھائی نہ دیا، جو ببل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

"ببل" درباری نے پکارا اور ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دئیے۔

میں تو کہتا ہوں، سورج کی کرن بھی کسی تختہ پر اس طرح سے نہیں کھیلتی جیسے مسکراہٹ بچے کے چہرے پر کھیل جاتی ہے۔ مسکراتے ہوئے ببل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بسی کی تحریک سے ایکا ایکی درباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں، مِصری سے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو" درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لئے اندر لپک گیا، وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔

بچے اس صبر کو نہیں جانتے جو تہذیب کے ساتھ آتا ہے۔ ببل کے چہرے پر ایک پُرخلوص مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور پل بھر میں وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو —— یہ ساری دنیا دھوکا ہے۔ پھر جیسے وہ مایوس ہو رہا تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببل کی ماں، مِصری ایک بھکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور ببل ایک منجھے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیص کو کھینچنے لگتا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا، نظریں بچاتا، پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببل کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ مِصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی اور دکاندار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی۔۔۔۔۔ ببل روتا چلاتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببل اور اس کی ماں مِصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کرمرا لے آئے بیچنے کا سوال

ہی کہاں پیدا ہوتا تھا؟ کرمُرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دوٗنی یا چوٗنی مل جاتی تھی جس سے ببّل کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنا کرمُرا چاہئے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی اور نہ کسی دوکاندار کو دیتی تھی۔ کرمُرا وہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پپولتے ہوئے ہمک ہمک کر، اچھل اچھل کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا...... آج جب درباری نے ببّل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی بار میں کرمُرے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے، لپکنے لگا۔ درباری چونکا۔ کہتے ہیں نا، آدمی اچھا ہے بُرا، بچے کو سب پتہ چل جاتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے درباری نے سوچا — میرے من میں کیا پاپ ہے — ببّل اسے جانتا ہے؟... درباری نے ببّل کو بہت روکا، پیار دُلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اوں اوں کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گرا ہی جا رہا تھا۔

درباری نے کہا — "کمینے.... سالے..."

اندر سے صاحب یا سرداری کی آواز آئی، "کیا حکم ہے حضور؟"

"آپ کو عرض نہیں کیا، نمیغ گنجور" درباری نے اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر ببّل کے پیارے، دُلارے سے گالوں پہ چپت لگاتے، اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولا "اتنا خود غرض؟.. سلام نہ دُعا، شکریہ نہ دھنیہ واد... کام نکل گیا تو اب تو کون اور میں کون؟...."

مصری، فٹ پاتھ کی زندگی نے شرم اور حجاب کو جس کے لئے ایک تکلف بنا دیا تھا، بے باکی سے بولی "یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بابوجی!" اور پھر ببّل کو چھاتی میں چھپا تی، وہیں کھڑی مصری اپنی دوٗنی یا چوٗنی کا انتظار کرنے لگی۔

ببّل ہمیشہ کی طرح "الف" نہیں تو "ب" ننگا ضرور تھا کیونکہ بدن پر کمر کے نزدیک وہ ایک کالا سا تاگا پہنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویذ لٹک رہا تھا۔ اس "لباس" میں خوش، ماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا جو دُنیا بھر کے بچوں کے لئے محفوظ ترین جگہ ہوتی ہے۔ جہاں ایک بار پہنچ کر وہ ایک بہت بڑے فاتح کی طرح مڑ کر دیکھتا ہے، اس احساس کے ساتھ جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں پہنچ گیا ہے جہاں نہ تو کوئی دشمن اور نہ دوست اسے کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر نظروں کے تیر و ترکش تانے وہ قلعے کے کنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدال فوج کا جائزہ لیتا ہے، یورش سے پہلے ہی جس کے چھکے چھوٹ چکے ہوتے ہیں.... پھر ایکایکی، کسی پروں والے، خیالی گھوڑے پہ بیٹھا وہ کسی شہسوار کی طرح لپکنے لگتا ہے۔ آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر..... اور منزلیں تسخیر ہو ہو کر اُس کے پیروں میں پڑی ہوتی ہیں!

مصری ایک پکّے، بلکہ کالے رنگ کی جوان عورت تھی اور ببّل گورا چٹا..... یہ کیسے ہوا؟ ——

join eBooks Telegram

درباری نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ بیچاری غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔ عصمت ان کے لئے ایسے ہی ہوتی ہے جیسے نادار کے لئے آئس کریم بار ہیں کسا ٹا۔۔۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھ آنے روپے کے عوض تبل دے گیا ہوگا۔ وہ ضرور ان لوگوں میں سے ہوگا جو اپنے جوہرِ حیات کی بے قدری کرتے ہیں اور زندگی کی تذلیل۔۔۔ جنہیں اس بات کی بھی پروا نہیں کہ لڑکا ہوا تو زندگی بھر ان کا اپنا لہو، اپنا گوشت پوست، اپنے دادا کا پرپوتا، اپنا بیٹا بھیک مانگتا پھرے گا۔ عورتوں کی دلالی کرے گا اور لڑکی ہوگی تو اپنے بزرگوں کی پت کو بیچے گی، پیشہ کرے گی۔

"آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے، بابوجی" مصری بولی" ورنہ یہ ہل کٹ۔۔۔ کسی مرد کے پاس نہیں جاتا"

"کیوں، کیوں؟" درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مالم نہیں" مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے تبل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی" ان عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے"

درباری جی کھول کے ہنسا" بدمعاش ہے نا۔۔۔ ابھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے، بڑا ہو کر تو قیامت ڈھائے گا"

مصری خوب شرمائی اور خوب ہی اترائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی گود میں ان گنت گوپیوں والے کنھیا کو کھلا رہی ہے۔ اور مصری کے تصور میں جو گوپیاں تھیں، وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی جیسے تبل مصری کا من تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے اردگرد ناچ رہی تھیں۔۔۔ تبل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر اور ایک کے ساتھ!

درباری نے جو مصری بائی کے ساتھ تھوڑی سی آزادی لی تھی، اسی سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا ——
"اس کا باپ کیا کام کرتا ہے، مصری؟"

"اس کا باپ؟" —— مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا —— "نہیں ہے"

اس جواب میں بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بھی تھا کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسف کو دور کرتے ہوئے بولی —— "ایک بار وہ پھر آیا تھا۔۔۔ مجھے یوں ہی لگا، جیسے وہی ہے۔ لیکن۔۔۔ میں کیا کہہ سکتی تھی، بابوجی!۔۔۔ میں نے تو اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔۔۔ جب تک میں نے اس بچے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوبو، کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا

join eBooks Telegram

—— ببل!.... جب سے میں نے اس کا نام ببل رکھدیا ہے...."

اور مصری پھر سوچنے لگی —— "اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟"

درباری بھی سوچنے لگا —— "ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں.... پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ ہو!"

درباری نے آج اٹھنی مصری کے ہاتھ پر رکھنے کی بجائے ببل کے ہاتھ پر رکھدی۔ ببل نے سکے کو ہاتھ میں لیا، زور زور سے بازو کو ہمکایا اور پھر اسے پھینک دیا۔

اٹھنی سڑک پر کے بین ہول میں گرنے ہی والی تھی کہ جیسے مصری کی تقدیر کو، ایک خشک، بے بضاعت سے آم کے چھلکے نے روک دیا۔ مصری نے جھک کر اٹھنی اٹھائی اور ببل کو سینے سے لپٹاتے ہوئے بولی لچا ہے نا.... "اور پھر اسے چومتے ہوئے وہ درباری لال سے بولی "سچ پوچھو، بابو جی! ۔ تو میرا مرد یہی ہے ببل!"

"تیرا مرد ——؟"

"ہاں" مصری نے ببل کو سنبھالا جو اپنی ماں کے سر پر سے پلو کھینچ رہا تھا اور کہنے لگی "یہ کماتا ہے، میں کھاتی ہوں!"

مصری بہت باتونی تھی۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی۔ ببل اور بھی کرمرا مانگتا لیکن درباری کو اپنی نظروں کے افق پر کاسنی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے مصری کے آبنوسی حسن اور ببل کی گوری چٹی معصومیت کو جھٹک دیا اور —— "میں چلا، صاحب بھائی.... اچھا بھابی" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے لکڑی کے چھلکے اڑے ہوئے دکھائی دیئے جنہیں درباری نے جھک کر باہر پھینکا اور سیتا کے پاس جا پہنچا....

شیواجی پارک میں، سمندر کے کنارے، کلب اور بھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ گئے۔

سیتا اٹھارہ ۱۸ انیس ۱۹ برس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تھی پر باپ مرچکا تھا۔ گھر کی حالت کچھ اتنی خراب بھی نہ تھی کیونکہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کی ماں لہجونتی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے "رُباب شے کرایہ اگاہے تاکہ"، سیتا کے کہنے کے مطابق، دروازے پر ہر مہینے جو بھیڑ یا

join eBooks Telegram

دکھائی دیتا ہے، نظر نہ آئے . . . . اور جیتا سکھی ہو جائے۔ لچھمن داس سے سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو وہ شک اور وسوسے کا اظہار کرنے لگی لیکن جب اسے پتہ چلا درباری کا پورا نام درباری لال مہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دے دی کیونکہ بمبئی میں جو لوگ مکانوں کا کرایہ اُگاہتے ہیں، انہیں مہتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قد درمیانہ تھا لیکن بدن کا تناسب ایسا جو مردوں کے دل میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے۔ اور کوئی بجوڑ دسی بیٹی ان کے ہونٹوں پہ چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خراش اچھی تھی لیکن اس کا پاس آنے ہی سے پتہ چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نم سی رہتیں کیونکہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لئے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ ان دھنسی ہوئی آنکھوں ہی کی وجہ سے تھا کہ سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے، یہ الگ بات تھی، لیکن جانتی وہ سب تھی۔

ہاں، سیتا کے بال بہت لمبے تھے جن کے کارن درباری اسے پوچھا کرتا — "تمہارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟" اور سیتا کہتی — "میں خود جو ہوں بنگالن . . . میرا نام سیتا موجمدار ہے . . . ." اور پھر وہ ہنسنے لگتی۔ سیتا خوش تھی کہ اس کا قد صرف اتنا ہے جس سے وہ اپنے حسین، کالے، چمکیلے اور لچکیلے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے وجود کی رُوح تک کو کسی کے حوالے کر کے اپنے سارے دُکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے —

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چاہتی تھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جائے۔ کمر کے گرد ہاتھ پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو باتوں میں لگانا چاہا۔ بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا نکالی اور درباری کے مُنہ کے پاس کرتے ہوئے بولی — "دیکھو . . . . میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں؟"

"کیا لائی ہو؟" درباری نے پوچھا اور ان جانے میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا۔

سیتا نے ڈبیا کو پرے ہٹا لیا اور بولی "ایسے نہیں . . . . میں خود دکھاؤں گی" اور پھر اسے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی "سونگھو!"

شامتِ اعمال درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا۔ اور اسے چھینکیں آنے لگیں

join eBooks Telegram

محبت کا سارا کھیل رُک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا اور سیتا پاس بیٹھی ہنستی جا رہی تھی۔

"یہ ___" درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا "کیا مذاق ہے"؟

سیتا کہنے لگی "تم اسے مذاق کہتے ہو۔۔۔۔ بیس روپے تولہ کی نسوار ہے"۔

"نسوار؟"

"ہاں" سیتا بولی "تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو"۔

درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی "یاد ہے، پہلی بار تم مجھے کہاں ملے تھے؟"

"یاد نہیں" درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا "صرف اتنا ہی پتہ ہے، تم سے کہیں پہلی بار ملا تھا"۔

"وہاں" سیتا نے سامنے، مہاتما گاندھی سومنگ پُول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم نہا رہے تھے اور چھینک رہے تھے۔ میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اُس دن دفتر میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور ہم یونہی گھومتی گھماتی اُدھر جا نکلیں۔۔۔"

"اُدھر کیوں؟"

"یونہی" سیتا نے کہا "چھٹی ہوتے ہی نہ جانے ہم سب لڑکیوں کو کیا ہونے لگتا ہے؟ ہم گھر بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ پھر ہوتا ہواتا تو کچھ نہیں، اور پتہ چلتا ہے ___ ہم کوکا کولا پی رہی ہیں!"

سیتا ہنسی تو ساتھ درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "ہم سب تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں کیونکہ تم چھینکتے ہوئے بورڈ سے فوارے تک اور فوارے سے کنارے تک آ جا رہے تھے اور ایسا کرنے میں سکڑ پیر تک دُہرے، تہرے ہوئے جاتے تھے ___ بچے کی طرح۔ میرا جی چاہا، بھاگ کے تمہیں پکڑ لوں اور تولیے سے تمہارا منہ، تمہاری ناک پونچھوں اور پیچھے ایک چپت لگا کے کہوں ___ اب جاؤ، بھیگو۔۔۔۔"

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا ___ "دوسری لڑکیاں کون تھیں؟"

"ایک تو کمُد تھی" سیتا بولی "دوسری جُولی۔۔۔۔ وہاں، کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے پاس رہتی ہے۔ تیسری ___" اور پھر ایکا ایکی رُکتے ہوئے کہنے لگی "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ایسے ہی" درباری نے جواب دیا "تمہاری سہیلیاں تمہاری جُوتی کی بھی ایسی نہیں ہیں"۔

"تم نے دیکھی ہیں نا؟"

"دیکھی تو نہیں"

سیتا کا چہرہ جو تھوڑا کھِل اٹھا تھا۔ ماند پڑ گیا۔ جبھی ایک چھینک نے درباری کے چہرے پر پر تولے لیکن رُک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا "آج دن ڈوبتا ہی نہیں"

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اپنے ساتھ بھیل پوری کے بے شمار تیل، گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے خودے لا رہی تھیں۔ پھر بیچ میں کہیں تو سکے بھی دکھائی دیتے تھے جو دور اندر، دخانی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے سمندر میں پھینک دیئے تھے۔ تیل کا الزام بھی خشکی پہ ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈیزل بہتے بہتے پہنچکر اس کے ایک بڑے سے حصے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا۔۔۔۔۔ سیتا نے مڑ کر دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہیوں کے پرے اس کے چکنے چہرے پر چھوٹ رہے تھے۔

۔۔۔۔۔ دن ڈوب تو رہا تھا۔ اس نے اپنے لانبے لانبے بازو دنیا کے دونو کناروں سے سمیٹے اور انہیں بغل میں دبا کر، ایک گہرے، گیمری رنگ کی گٹھڑی سی بنا، دور پچھم کے گہرے پانیوں میں اُتر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تیج زمین کی گولائیوں میں گُم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی روشنی تھی جو آسمان کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہولے ہولے، دھیرے دھیرے، بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ــــ لو، اب تمہارا راج ہے۔ جاؤ، موج اڑاؤ۔۔۔۔۔

وہی چھینک جس نے درباری کو سیتا سے کوسوں دور پھینک دیا تھا، ایک ہی وار میں اس کے بہت ہی قریب لے آئی۔۔۔۔ سیتا کانپنے لگی اور درباری بھی۔۔۔۔

اندھیرے کا تسلط ہوتے ہی پُول اور کلب اور سڑک پر کے قمقمے تو ایک طرف، پھیری والوں کے چھابوں اور ریٹیلوں پر ٹمٹمانے والے دیئے بھی بڑے لگنے لگے۔

جبھی، جیسے دیواریں سے آواز آئی ــــ "درباری!"

"اس کا مطلب ہے" درباری نے کہا "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں!"

"پیار کا مطلب ــــ یہ تھوڑے ہوتا ہے؟"

"میں سب جانتا ہوں"۔۔۔۔ اور درباری اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے ٹھیک کرنے

لگا۔ سیتا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اور التجا آمیز لہجے میں بولی "کیا کر رہے ہو، چاند؟" ..... اور ریت پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی، جو غصے سے ہانپ رہا تھا

درباری نے اپنے پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لئے۔ اور بولا "! Bitch ..... بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے ــــ"

"میں کچھ نہیں سمجھتی" سیتا نے وہیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر پھر سے درباری کو پکڑتے ہوئے کہا ــــ "میں تمہاری ہوں، چندا..... نس نس، پور پور تمہاری ہوں۔ پر میں، ایک بدھوا ماں کی بیٹی..... مجھ سے شادی کر لو، پھر...."

"کوئی شادی وادی نہیں" درباری بولا "تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں؟ کیا منتر پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اوٹ ضروری ہے؟" اور درباری لال رُک گیا، جیسے اب بھی اسے امید تھی....

"ہاں ضروری ہے" سیتا روتے ہوئے بولی "یہ دنیا ٹھیک نہیں، تم نے نہیں جانی؟"

درباری کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا "میں اس پیار کو نہیں مانتا جس میں بیچ کوئی بھی پردہ کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری ہے تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سویم سیکھ درت ہوتے ہیں، ایسا شاستروں میں لکھا ہے"

"لکھا ہوگا" سیتا بولی "سب تمہاری طرح اس بات کو مانتے ہوتے...."

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا" درباری نے غصے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا، جو ریت میں دھنس گئے۔ اور پھر وہ انہیں کھینچ، ریت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔

سیتا پیچھے لپکی ــــ "سنو" ..... ابھی درباری نے دیوار کی حد نہیں پھاندی تھی۔ اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے اور اندھیرے کو گلے لگا سکتے تھے۔

ایک دو لڑکے فضا میں تعجب دیکھ کر رُک گئے۔ پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ، سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا میں ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی

اب کے سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑے بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں اُن پر رکھ دیں۔ اور نم آنکھیں بھی، ہونٹ بھی۔ درباری پیروں تک جل رہا تھا اور اندر کی آگ سے لرز رہا تھا۔ پیر چومتی ان پر آنسو گراتے ہوئے سیتا نے تھوڑا اٹھ کر درباری کی طرف دیکھا اور کہنے لگی "تم سمجھتے ہو، میں کسی برف، کسی پتھر کی بنی ہوں؟ میرا تم میں گھل مل جانے کو جی نہیں چاہتا؟ تم مجھ سے لگتے ہو تو کیا میرا انگ

انگ ٹوٹنے، دُکھنے نہیں لگتا؟ ..... پر تم کیا جانو، ایک عورت کے دُکھ....."

اور پھر کسی ان جانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی" میں نہیں کہتی یہ دُکھ تم نے دیئے ہیں۔ یہ بھگوان نے دیئے ہیں، بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے....."

"میں سب جانتا ہوں" درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مرد سب سہہ سکتا ہے، توہین برداشت نہیں کر سکتا!"

"کس کی توہین؟"

درباری نے جواب دینے کی بجائے سیتا کے ٹھوکر ماری اور وہ پیچھے کی طرف جا گری۔ خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی طرف نکل گیا

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا۔ ماں کی چھاتی میں مُنہ چھپا کر وہ سب بھول گئی تھی۔ جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا حظ ایک قسم کا آرام آتا ہے ایسے ہی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دُکھ دُور ہو رہے تھے..... وہیں ریت پر پڑی پڑی سیتا دبی دبی سسکیاں لیتی رہی۔ بیچ میں کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مدد کے لئے تو نہیں آ رہا جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لئے اس دیش کا ہر نوجوان چلا آتا ہے؟..... سامنے دیئے کی لَو میں کوئی چیز چمکی۔ سیتا نے اٹھائی تو وہ چاندی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی اور اب اس میں ریت چلی آئی تھی.....

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار ضرور کرتا تھا، لیکن اس حد تک نہیں، جس حد تک سیتا کرتی تھی۔ سیتا تو جیسے اس دنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لئے آئی تھی۔ اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کوئی اِدھر سے سندیسے میں انگوٹھی پھینکے..... لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک دیکھ میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اب تو انگریزی "فن" چلا آیا تھا، جس سے درباری پورا لطف اُٹھانا چاہتا تھا۔

گھر میں جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ ترکھان چھٹی کر گیا تھا۔ صاف ستھرے برآمدے میں بیٹھے ہوئے، درباری خالی خالی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی کاشی اور کبھی سر دئی، کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے تھے۔ پاس درباری

کا بھائی محمود یا بنواری سرکنڈے اور ٹین سے بنے ہوئے ایک بد وضع کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لئے اندر سے ستونتی یا کنیز بھاگی ہوئی آئی اور آتے ہی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا۔ بچہ رونے، مچلنے لگا

"ہے ہے ...." درباری نے احتجاج کیا "کیا کر رہی ہو آپا؟"

"تم چپ رہو جی" وہ بولی "تم سے ہزار بار کہا ہے، مجھے آپا مت کہا کرو .... دیدی کہتے کیا سانپ سونگھتا ہے؟"

"اچھا جی" درباری بولا "اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو کیسے رو رہا ہے......

ایسے تو لارڈ کچنر بھی پورا بیڑہ ڈوب جانے پر نہیں رویا ہوگا.... دو اسے کھلونا"

"کیسے دوں.... کہیں آنکھ پھوڑ لے"

"سب بچے اُلٹے سیدھے کھلونوں سے کھیلے ہیں، کتنوں کی آنکھ پھوٹی ہے؟"

"جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بچہ بھی ہے؟"

"سب ماؤں کو اپنا بچہ، سب سے زیادہ شیطان معلوم ہوتا ہے"

اور محمود یا بنواری بڑی بیزاری سے رو رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر اُٹھا لیا تھا۔ درباری نے طاق پر سے جاپانی بلی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگنے اور قلابازیاں کھانا شروع کر دیتی تھی جسے دیکھ دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی محظوظ ہونے لگتے تھے۔ لیکن بچوں کا نہ جانے کیا ہے، انہیں وہی کھلونا چاہیئے جو کسی نے چھینا ہے .... درباری نے بڑے بڑے منہ بنائے، کیسے کیسے خوخو، خاخا کیا۔ منہ میں اُنگلی ڈال کر ہنومان بنا۔ پھر جاپانی ڈاکر، آغا.... لیکن وہ رو رہا تھا۔ اسے اپنا وہی کھلونا چاہیئے تھا۔ درباری کا جی چاہا اسے تھپڑ مار دے۔ اگر بچے کے اور رونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور مار دیتا۔ درباری نے ایکا ایکی جھلّا کر کہا "اب بند بھی کر، جالے...."

اندر سے آواز آئی .... "رونے دے، یار"

بچہ رو رہا تھا۔ آخر دیدی بھاگی آئی، اُلٹے پیروں ـــ "ہے رام"

"ہائے اللہ کیوں نہیں کہتیں؟"

"بھگوان کے لئے ـــ تم چپ رہو"

"خدا کے لئے چپ ہو سکتا ہوں"

پھر ستونتی یا کنیز جیسے کھلونا چھین کر لے گئی تھی، ویسے ہی لوٹا بھی گئی ـــ "لے، میرے باپ"

join eBooks Telegram

اس نے کھلونے کو بچّے کو ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور پھر جیسے اس کی حالتِ زار دیکھ بھی نہ سکتی ہو، اسے اٹھایا، چھاتی سے لگایا، بوسے دیئے۔ قمیص سے اس کا منہ پونچھا، ناک صاف کی۔ چوما چاٹا۔۔۔۔ اور اس کے کہے مطابق "بڑی ٹھنڈ پڑی"۔۔۔۔۔ پھر بہت گالیاں اپنے آپ کو دیں" ہائے، مرجائے ایسی ماں۔۔۔۔ نہ رہے اس دنیا میں، لال کو کتنا رُلایا ہے۔۔۔۔۔"

اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی برس پڑی" دیکھو تو، کیا مزے سے بیٹھے ہیں"

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے!

درباری بولا ــــ" اب چاہے ہاتھ نہیں اگر دن بھی کاٹ لے"

"کاٹ لے" دیدی بولی" مروں گی میں۔۔۔۔۔ تم لوگوں کو اتنا سا بھی وہ نہ ہوگا"

"ہوگا یا نہیں" درباری بولا" کہتے ہیں ــــ نادان بھی وہی کرتا ہے جو دانا کرتا ہے، لیکن ہزار جھک مارنے کے بعد۔۔۔ پہلے ہی چھیننے کی بے وقوفی نہ کی ہوتی"

"ہاں، میں بے وقوف ہوں" دیدی کہتی ہوئی بچّے کو اندر لے گئی" ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا دو الگ باتیں ہیں"

اور دیدی کے کاندھے پر سر رکھے بدمعاش محمود یا بنواری ہنستا ہوا دکھائی دیا، جیسے اپنی طاقت اور قدرت کو اچھی طرح سے جانتا ہو۔

جبھی سامنے آرورا سنیما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نارنجی سارنگ دو تین بار لہرایا۔ درباری نے جلدی سے کپڑے ٹھیک کئے، سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا ــــ

موڑ پر سیتا کھڑی تھی۔ اس نے ایک بار درباری کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی اندر کی طرف دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں

"کہیے حضور۔۔۔ کیا حکم ہے؟" درباری نے پوچھا

سیتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی ہو۔ درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا" اگر چپ ہی رہنا ہے، تو پھر۔۔۔" اور وہ لوٹنے لگا

"سنو" سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی" مجھے معاف کر دو۔ اُس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی"

درباری نے رُک کر اس کی طرف دیکھا ــــ" اب تو نہیں ہوگی؟"

سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا

"جہاں کہوں گا، میرے ساتھ چلو گی؟"

join eBooks Telegram

سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور مُنہ پھیرے کرتی ہوئی، ساری کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دوڑہ جیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھُردرے سے ہاتھ پھیلائے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا —— "تُو تو ایسے ہی ڈرر ہی ہے .... تجھے دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میں کوئی بڑا اونچ آدمی ہُوں"

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی۔ بولی —— "نہیں نہیں.... ایسا کیوں ؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیواجی پارک میں، دیوار کے نیچے.... دن ڈوب چکا تھا آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر منعکس ہونے والی روشنی کو اِدھر زمین پر پھینکدے۔ اس لیے اندھیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپیٹ لیا۔ سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پُول کے اِردگرد دیئے ہوئے جنگلے خاکے بنے اور پھر معدوم ہوگئے۔

درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے، سیتا منفعل سی بیٹھی رہی۔ درباری ایک دم جھلّا اُٹھا اور بولا —— "کچھ ہنسو، بولو بھی نا" سیتا کو ہنسانا پڑا۔

درباری نے سیتا کی کھوکھلی ہنسی کی نقل اُتاری اور سیتا سچ مچ ہی ہنس دی.... درباری حوصلہ پاکر بولا "تمہیں کیا سچ مچ مجھ پر وشواس نہیں ؟"

"یہ بات نہیں" سیتا بولی "تم مجھ سے شادی کربھی لوگے، تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ سمجھو گے میں ایسی ہی تھی...."

نہیں سیتے! میں نہیں سمجھوں گا.... کبھی نہیں سمجھوں گا"

جبھی کچھ لوگ ہاتھ میں لوہے کی سلاخیں لیئے چلے آئے۔ درباری چونکا۔ اس کی تسلّی ہوئی جب اُنہوں نے سلاخیں ریتے میں مارنی شروع کردیں۔ وہ بیوڑے کے اس دفینے کو دیکھ رہے تھے جو دو ایک دن پہلے انہوں نے ریتے میں دبایا ہوگا اور اب، سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اُٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔ مڑ کر دیکھا تو دیوار کے اُوپر، بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں ٹھٹّھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی لجا رہی تھی، پسینہ پسینہ ہو رہی تھی وہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی۔ آج اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی اور اسکے لئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔

جبھی کچھ من چلے "اے میرے دل کہیں...." گاتے ہوئے پاس سے گزرے۔ پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری چانا ہوکر اُٹھ گیا۔ اس نے خونیں آنکھوں سے اِردگرد کے منظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دی، اور

join eBooks Telegram

بولا — "چلو سیتے، یہاں نہیں، جوہو چلیں گے۔"

"جوہو؟ ....."

"ہاں — اُٹھو، کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔"

سیتا چپ چاپ، اُٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی

سیتا اور درباری جوہو کے بیچ اِدھر اُدھر پھر نہ سکتے تھے کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا، چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا۔

لیکن اُس دن جوہو کے سب ہوٹل سب کاٹیج گاہکوں سے بھرے پڑے تھے!

کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو اکھڑا اکھڑا، بے تعلق۔ زبان میں ایک عجیب طرح کی لکنت تھی جیسے کوئی نشے والی چیز منہ میں رکھ لی ہو جس سے زبان پھول گئی ہو۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تاڑدیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپیرا ہاؤس ہوتے ہوئے ہارن بائی روڈ پر جا پہنچی جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔ ایک ہوٹل پر پہنچتے ہوئے درباری نے منیجر سے پوچھا — کوئی کمرہ ہے؟"

منیجر نے غور سے درباری کی طرف دیکھا جیسے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کر کے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی، زمین کی طرف دیکھتے ہوئے، تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خام، بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار وہ دیوانے سے ہو رہے تھے۔ یہی منیجر نے پوچھا — "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"جی؟" درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا "اورنگ آباد سے"

"خوب" منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"جی سامان تو نہیں ہے"

معاف کیجئے" منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نہایت ہی نجس اور غلیظ شے ہو اور پھر بولا "اپنے پاس کوئی روم نہیں"

"کیا مطلب؟ ابھی تو ٹیلیفون پر —؟"

بیرہ تب جو ایک ٹرے پر ویفر، مونگ کی دال، سوڈے کی بوتلیں اور چابی لیے جا رہا تھا، بول پڑا —

join eBooks Telegram

"یہ ہوٹل عزت والے لوگوں کے لئے ہے، صاحب"

درباری کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وثوق سے جانتا تھا، اس بیچے کا ٹپ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ مینجر صاحب کی عزت پانچ روپے سے ..... اور آج یہ سب کے سب ایکدم نیکی اور عزت اور شرافت کے پتلے بن بیٹھے تھے۔ وہ عزت اور شرافت کے پتلے تھے یا نہیں۔ لیکن، ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی کر گزرنے کے لئے مشّاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے جس کے سامنے مدِمقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھوٹی پڑ جاتی ہے..... درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا —— وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا ——

لوٹتے ہوئے وہ گالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں، جنہیں وہ ہوٹل کے منتظمین کو سنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی،

"چلو سیتا" درباری نے کہا "پھر کبھی سہی"

اور وہ ٹیکسی پر بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیئے .....

زندگی بے کیف ہو گئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرو ہو گئے، اور بہت سے ہیرو، پیروں میں آگرے،

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی ہی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا مضمحل سا۔ اس شام کی شکست اور بے حرمتی کے بعد ایک تسکین کا سا احساس تھا جو تسکین بھی نہیں تھی۔ یہ آگ ..... یا تو پیدا ہی نہ ہو گی۔ اسی لئے بڑے خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انسان کی اولاد کی طرح انہیں جھٹک نہیں سکتے۔ ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتے کیونکہ ہر دو صورتوں میں ایسے جرموں کی سزا موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے پر چپکے دبکے پڑے رہیں گے، اور اس وقت آلیں گے، جب آپ مکمل طور پر نہتے ہوں گے، بالکل بے دست و پا۔ —— غسل دی جانے والی میت کی طرح۔

درباری اُس وقت برآمدے میں بیٹھا ڈان باسکو کی دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جنکی چھاؤں میں محلے کے امراء کی موٹریں سستا رہی تھیں۔ کچھ تو یہ اُن امیر مزدوروں کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ جھگڑے ہی سے ان کی پوری تسلی ہو جاتی تھی۔ اور کچھ گاڑیاں ایسے لوگوں کی تھیں جنہوں نے انہیں چلتے پھرتے قحبہ خانے بنا رکھا تھا۔ ان کے ڈرائیوروں کو سرِشام تاڑی چمکانے اور جیب

join eBooks Telegram

رہنے کی تنخواہ چپکے سے دے دی جاتی تھی ۔ یہ بیرہ نمبر ۲۴ تھے ۔

درباری نے کھینچ کھانچ کر اُس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی کا کار میں افزائش پانے والی اُمید سے تعلق پیدا کر لیا ۔ لیکن کیا فائدہ ؟ امید کو چمکانے دمکانے سے کار تھوڑے ملا کرتی ہے ؟ باپ گرد ہاری لال مہتا تو پیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتے تھے ۔ اگلے جنم میں بھی سانپ بن کر دفینے پر بیٹھ جانے کا ارادہ تھا ۔

صاحب بھائی سردار ی لال مع اپنے بیوی بچوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے ۔ پیچھے ٹھنڈے بازوؤں والی بے بچہ بھابی رہ گئی تھی جس کی بھیّا سے تکرار ہی رہتی تھی ۔ وہ کہتی تھی — تم میں نقص ہے ، اور وہ کہتے — تم میں ۔ وہ کہتی تم ڈاکٹر کو دکھاؤ ، وہ کہتے ، تم اپنا معائنہ کراؤ ۔ اور ناپید بچے مایوسی سے انہیں دیکھتے رہتے اور اپنا سر پیٹ لیتے ۔

درباری مکمل طور پر بور ہو چکا تھا ۔ وہ جانتا تھا اور تھوڑی دیر گھر میں رہے گا تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئے گی ۔ اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ ہاں ، کچھ دن تو زندگی دیکھ لے ۔ آخر تو ایک نہ ایک دن ہر کسی کی شادی ہوتی ہی ہے —

کس کے ساتھ شادی ؟ سیتا لیک کر اس کے دماغ میں آتی تھی ۔ سیتا ویسے ٹھیک تھی ، لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں ۔ وہ بہت ایثار والی لڑکی تھی ، شکل صورت سے بھی بُری نہ تھی لیکن بیوی —؟ بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے ۔ اسے کچھ تو چلبلا ہونا چاہیئے ۔ اِدھر اُدھر جھانکنا چاہیئے تاکہ مرد کان سے پکڑ کر کہے —

" اِدھر " اور پھر یہ ہوا کی بیٹی ؟ — مرد سے یوں چمٹتی ہے ، جیسے وہ اس کا شوہر نہیں ، باپ ہے ۔

— میں کہاں کہاں کر ایسے اُٹھا ہتا پھروں گا ؟

ہاں تھوڑی دیر کے پیار کے لئے سیتا سے اچھی کوئی نہیں ۔ کیا جسم پایا ہے !

جبھی مصری دکھائی دی ، اور ببّل دکھائی دیا . . .

مصری دُور ہی سے " بابوجی " کی طرف اُنگلی کرتی ہوئی آ رہی تھی اور ببّل دہیں سے غوں غوں غاں غاں کرتا ہوا ہُمک رہا تھا ۔ پھر یکایک ببّل میں زندگی اُچھلی ، جیسے گیند زمین میں سے اُچھلتا ہے اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہو گیا ،

آج ببّل خدا کے نہیں ، انسان کے لباس میں تھا ۔ ایک مسیلی سی بنیان پہن رکھی تھی ۔ ہاں ، نیچے اللہ ہی اللہ تھا ۔

پاس آتے ہی ببّل نے دونو ہاتھ پھیلا دیئے — کمینہ ! جیسے میں اس کے لئے کمرے ہی تو کھڑا ہُوں ، جیسے اندر جانا اور باہر آ کر اس کے حضور باجگذاری کرنا اس کے صبر کی آخری حد ہے ،

join eBooks Telegram

درباری کرمُرا لے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا — مصری ایک عورت ہے، اور تبل اس کا بچہ۔ اور یہ سب کتنا مقدس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر محض تکلف کی چیز،

جبھی درباری کا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں گھومتا تھا اور گھوم پھر کر وہیں آجاتا تھا۔ پھر کوئی کشف کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور سمٹنے لگیں۔ درباری لال نے آج وہیں سے کرمُرا تبل کو دے دیا تھا۔ جانے کیا پاپ تھا جو آج درباری تبل کو گود میں نہیں لے رہا تھا۔ جیسے وہ خبر مار رہا تھا۔ لیکن وہ ربڑ کی گیند۔ تبل — جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر پھر لوٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اسے کرمُرا نہیں چاہیئے تھا۔ اُسے کرمُرا بھی چاہیئے تھا اور آسمان کی بادشاہت بھی۔ تبل حیران ہو رہا تھا — آج یہ بابو مجھے لیتا کیوں نہیں ؟

"آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں، مصری؟" درباری نے پوچھا

"یہی کوئی چودہ آنے"

"کیوں، صرف چودہ آنے کیوں ؟"

"آج میرا مرد ناگ پاڑے چلا گیا تھا"

"تیرا مرد ؟" درباری نے حیران ہوتے ہوئے کہا "تم نے کوئی مرد کر لیا ہے ؟"

مصری ہنسی۔ اور تبل کو دونو بازوؤں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی۔ "یہ ہے میرا مرد، میرا کماؤ مرد...... اسے آج اُس کی موسی پارے کی چوپاٹی لے گئی تھی۔ یہ بنیان رہی جو یہ ہل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں کندھے جھٹکتا ہے، جیسے پوری دھرتی کا بوجھ لاد دیا"

درباری سمجھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی تک وہ تبل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا۔ اور تبل کرمُرا وغیرہ سب بھول کر شور مچا رہا تھا،

مصری بولی "ننگا رہنے کی عادت پڑ گئی، تو بڑا ہو کر کیا کرے گا ؟"

"یہ ایسے ہی پیارا لگتا ہے، مصری"

تبل جیسے ہُمک ہُمک کر کہہ رہا تھا — "جھوٹ! ... پیارا لگتا ہوں تو پھر لیتے کیوں نہیں ہو ؟"

اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا — "ہو، ہو، ہو ...."

"تبل ہوتا ہے تو تم کتنا کما لیتی ہو ؟" درباری نے پوچھا

"یہ ؟" مصری تبل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھک گئے تھے "یہ ہوتا ہے تو مجھے تین بھی مل جاتے ہیں، چار بھی مل جاتے ہیں —"

درباری نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا

join eBooks Telegram

"یہ کیا بابو جی؟" وہ بولی اور اس کا چہرہ سُرخ ہونے لگا

"تم لونا" درباری بولا۔ اور پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا "جلدی سے لے لو، نہیں کوئی دیکھ لے گا"

مصری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب اس کا چہرہ قرمزی ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور اپنے سینے میں اُڑس لیا۔ اور اس خفرے کا انتظار کرنے لگی جواب دہ سال میں مشکل سے تین چار بار سُنتی تھی۔ لیکن، مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا جب اس نے درباری کی بات سُنی ـــــ

"تم تو جانتی ہو، مصری" درباری بولا "میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں ـــ تبل سے.... اگر تم اسے ایک دن کیلئے مجھے دیدو.....؟"

مصری کچھ نہ سمجھی۔

درباری نے کہا..." میں اسے کلیجے سے لگائے رکھوں گا، مصری ـــــ ایک ماں کی طرح، تمہاری طرح، یہ مجھا تنا اچھا لگتا ہے اتنا اچھا لگتا ہے کہ ـــ بہت ہی اچھا لگتا ہے" اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر تبل کو لے لیا، تبل ایک دم خوشی سے اُچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ گردن کے لئے گردن کو یوں اِدھر اُدھر گھمانے لگا جیسے مور چلتے وقت اپنی گردن کو ہلاتا گھماتا ہے... پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائیکل کی طرح سے چلنے لگے۔ درباری نے کرمرے کے کچھ دانے تبل کے منہ میں ڈالے جنہیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا۔ کبھی کہتا چھوڑ دو، نیچے اُتار دو۔ کبھی پکڑ لو، چھاتی سے لگا لو، بیچ میں اس نے ماں کی طرف دیکھا، ہنسا بھی۔ لیکن منہ درباری کی طرف کر لیا۔ ماں کو چڑانے لگا، جیسے درباری کو چڑایا کرتا تھا۔

مصری ابھی تک بھونچکی کھڑی تھی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی دونوں ہستیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کہیں آپ کے کپڑے خراب کر دیے تو؟"

"تو کیا ہُوا؟" درباری نے کہا "بچوں کی ہر چیز امرت ہوتی ہے"

مصری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پہلے اسنے سوچا تھا۔ زندگی میں بہت ہی نایاب چیز، تھوڑی دیر کے لئے اسے مردل گیا۔ اب اسنے سوچا، میرے بچے کا باپ مل گیا۔ اور پہلی چیز سے دوسری کتنی بڑی تھی۔

"میں اسے کھلاؤں گا پلاؤں گا، مصری" درباری نے وعدہ کیا "تم رات دس بجے کے قریب اسے لے جانا"

"جی اچھا" مصری نے سر ہلا دیا۔

مصری چلی۔ پھر رک گئی۔ مڑ کر بچے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوؤں میں کھیل رہا تھا اور اپنے ارد گرد درباری کی بند مٹھی کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کے نہ کھلنے پر جھلا رہا تھا۔ مصری نے آواز بھی دی، ببل نے دیکھا بھی۔ مگر اسے آج کسی بات کی۔۔۔ پروا نہ تھی۔ باپ کی پروا نہ تھی تو ماں کی بھی نہیں،

مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ رک کر پھر دیکھنے لگی۔ اور جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ببل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ کچھ دور جا کر اس نے نیفے میں سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے،

درباری ببل کو لئے اندر آیا، ببل کو کمرے کی بہت سی چیزوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ ہر شے کو وہ منہ میں ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ میں بچے کو دیکھ کر حیران ہو اٹھی۔ ناک پر انگلی رکھتی ہوئی بولی "ہائے رام، یہ کیا؟"

"ببل، ماں! ـــ مصری کا بیٹا" درباری بولا "مجھے بڑا پیارا لگتا ہے"

"اس کی ماں کہاں ہے؟"

"گئی۔۔۔ میں نے تھوڑی دیر کھیلنے کو لے لیا ہے، ادھار۔۔۔ ایک بار پیدا کر دیا، پھر ماں کا کیا کام؟" درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"جا رے جا" ماں بولی "تجھے آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرورت ہوتی ہے، پھر جیسے اپنے آپ تیرے ایسے لونڈے بن جاتے ہیں"

"اچھا ماں" درباری نے کہا "میں اسے پودار کالج کے سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا، جہاں پاس ہی مجھے جگ موہن کی کتابیں بھی لوٹانی ہیں، تو ذرا اسے پکڑ"

ماں نے جھرجھری لی "ہا ـــ گندا" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "میں تو اسے ہاتھ نہیں لگاتی"

بھابی جو کچھ دیر پہلے آ کھڑی ہوئی تھی، بولی "اتنا ہی شوق ہے، تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے؟ شادی کر لیتے؟"

"نہیں" درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا "مجھے دوسروں ہی کے بچے اچھے لگتے ہیں"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی ـــ "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے؟"

درباری نے ببل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی توجہ جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی

join eBooks Telegram

طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور ببل چمچے کو منہ میں ڈالتا، چوستا رہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت نکال رہا تھا،

اکیلا ایکی ببل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں، پھر بھابی کی طرف پھیلا دیئے۔ ماں تو چھی چھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر جیسے اندر کے کسی اُبال نے اسے مجبور کر دیا اور لپک کر اس نے ببل کو اٹھا لیا۔ اور اسے سینے سے لگا کر چلنے لگی، جیسے کسی اپار سکھ اور شانتی کے جھولے میں پڑی ہے۔ ببل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے ببل کو نہلا دھلا کر ایک بھکارن کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنا لیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سینکڑوں ریشمی اور سوتی فراک بنا ڈالے تھے۔ اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے، میں اس کے لئے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی۔

اندر پہنچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اُوپر ٹیگور، پریم چند اور لارنس کی کچھ کتابیں۔ پھر دھیسے سوٹ کیس بند کیا اور بیٹھک کی طرف مڑا۔

بیٹھک میں پہنچا تو ببل ہمیشہ کی طرح بھابی کی چھاتیوں میں اسر دیئے ہوئے تھا۔ درباری کے پہنچتے ہی اس نے منہ نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل، جانے کس جذبے، اگر بس گنتی سے اس نے اپنے پورے پہ درباری کی طرف پھیلا دیئے۔ درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببل کو اٹھایا، دوسرے میں سوٹ کیس تھاما اور "اچھا بھابی۔۔" کہہ کر باہر نکل گیا۔

دادر پہنچ کر ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان سے درباری نے ببل کے لئے ایک قمیص خریدی اور ساتھ ایک نکر بھی۔ قمیص تو جیسے تیسے ببل نے پہن لی لیکن نکر پہنتے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا، چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا، برابر اپنی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا ابھی ہمکا پھر گرا۔ درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا۔ اور پھر منہ اُٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو —— عجیب آدمی ہو، ایک بچہ بھی پکڑنا نہیں آتا۔

پھر اکیلا ایکی بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اُوپر کی طرف ہمکا بجلی کے زور سے درباری نے ہاتھ اُوپر کیے ہی تھے کہ ببل نے پاس چلتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جا ڈالی۔ دوکاندار نے لپک کر ہاتھ ہٹا لیا، نہیں تو جناب کی انگلی اُڑ گئی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا اور جب درباری نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ شکایت کے لہجے میں پہلے درباری اور

پھر دوکاندار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی طرف ہاتھ اُٹھا کر جیسے کہہ رہا تھا ــــ اسنے مجھے مارا!

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی تیل کچھ جھلا سا گیا۔ دراصل اسے نکر کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ "زندگی بھر" یوں کسا نہ گیا تھا۔ دربادی نے اسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تنکے کی طرح اکڑ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو تم گاڑی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ نہیں مجھے لیکر چلو ــــ بازار میں، جہاں لوگ آجا رہے ہیں بجتے بجاتے زور سے اُوپر نیچے ہو کر آخر نکر نکال ہی دی۔ اور اس پہ کودتے ہوئے اسے یوں چرمر کر دیا کہ کوئی استری اس کے بل نہ سیدھے کر سکتی تھی۔ اور اب ــــ نکر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دُنیا کو دیکھا اور دکھا رہا تھا!

دربادی جب سیتا کے ہاں پہنچا۔ تو وہ گھر پر نہ تھی۔ دربادی نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے بتایا وہ پربھا دیوی میں کمُد سے ملنے گئی ہے۔ پربھا دیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن کمُد کے گھر کا کیسے پتہ چلے، پوچھتا تو ماں کہتی ــــ کیوں! کام کیا ہے؟ اس لئے خاموش ہی رہنا اچھا تھا۔

اس پہ ایک اور مصیبت ــــ ماں بتانے لگی، پہلے ملے پہ رہنے والے سندھی نے "نوسٹ" دے دیا ہے۔ نوٹس دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت تو حالات نے اسے نوٹس دے دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ماں کی بوڑھی باتیں سنتا رہا۔ اور بتاتا رہا یہ تیل اس کا بھانجا ہے۔ بڑا پیارا دلارا بچہ ہے۔ لیکن ماں کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار کہا۔ کیوں رے؟ تیل نے جواب بھی دیا، لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔ تیل کو ماں کی بولی معلوم تھی، لیکن ماں تیل کی بولی بھول چکی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے لے بیٹھی ــــ کمیٹی کہتی ہے، ہر سال اتنے پیسے مرمت پر لگایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کرائے، کیا کیا کانون پاس ہو گئے ہیں۔ کانگریس سرکار تو ڈوبنے کو آئی ہے۔ اشٹ گرہی میں کیا ہوگا؟ میں تو جگادھری لوٹ جاتی ہوں۔ ۔ ۔ تم شادی کب کروگے؟

کوئی ہی دیر میں ماں بور ہو گئی۔ ہاں، ماں بور ہو گئی۔ بولی ــــ سیتا پتہ نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم ٹیکسی پر تو آئے ہی ہو مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔"

"میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا، ماں جی ــــ"

"کدھر جا رہے ہو؟"

"شہر کی طرف"

"ٹھیک ہے" ماں بولی "دہا بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے۔ ۔ ۔ ہنڈولے آرہے ہیں نا، مجھے مولی خریدنی ہے۔ مولی جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟"

درباری سٹپٹا کر رہ گیا۔ ببل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو دل ہی دل میں، ماتھے پہ ہاتھ مار کر بولا "چلو ماں جی، میں آپ کو پارلی چھوڑ دوں راستے میں کُندہ کا گھر ہے نا؟"

"ہے تو" ماں اٹھتے ہوئے بولی "پر آگ لگے ـــ یہ بازار بمبئی کے ۔۔۔ بیس بار گئی ہوں تو بیس بار ہی گھر بھول گئی ـــ"

"چلو، اکیسویں بار بھی بھول جانا"

"پر تم ـــ سیتا کو لے کہاں جا رہے ہو؟"

"دیدی کے پاس ۔۔۔۔ کہا نا"

"سُنا ہے وہ مسلمان ہے؟"

"کیا بات کرتی ہیں، ماں جی؟" درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پہاڑ کو تھام لیا "ستونتی نار کسی مسلمان عورت کا نام ہو سکتا ہے؟"

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پہ درباری پر مسلط ہو جائے، سیتا چلی آئی۔ بہار کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتے ہی پتے، پھول ہی پھول لئے۔ اس نے آترن گرے رنگ کی ایک چولی چست کی ہوئی تھی اور بیگی چاولوں کے کلر کی سی ہینڈ لوم ساڑی لپیٹ رکھی تھی، جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی۔ خود وہ بہار کا جھونکا تھی، لیکن درباری کیلئے پت جھڑ کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے۔۔۔ اور جو ڈال پہ رہ گئے تھے، سوکھ کر، آپس میں ٹکرانے، دل کو دھڑکانے لگے

سیتا نے آتے ہی پہلے ببل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں ـــ "کس کا بچہ ہے؟" اور پھر لپک کر بچے کے پاس جا پہنچی "ہے، کتنا پیارا ہے، ببلو سا"

"ہاں" درباری نے کہا "ببل ہی اس کا نام ہے، تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے کیا معلوم؟" سیتا نے تالی بجاتے، ببل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا "ہر بچے کی شکل ہی سے اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ تمہیں نہیں چلتا؟"

ببل نے پہلے شک و شبہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہو۔ اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اٹھا دیئے۔ سیتا نے اُسے اٹھایا، چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا بھول گئی۔ بس، رشتہ قائم ہوتے ہی ببل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور "اں۔۔۔ اں۔۔۔" کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، اس میں کچھ ہے، میرے لئے؟

درباری کی نگاہوں میں خواب بھتے اور جب سیتا نے دیکھا تو اسکی نظروں میں سجیلی تھیں اور بچے۔ شاید ببل سیتا کی آنکھوں میں سے منعکس ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ آتا دلے ہوکر کہا "گھنٹہ بھر سے میں تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں' دیدی نے بلوایا ہے"

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا — "ماں نے — ؟

"ہاں بیٹا" .... ماں کے اجازت دیتے ہوئے کہا،

"ٹھہرو .... میں اس کے لئے کچھ لیکٹ ....."

درباری نے اور بے صبری سے کہا" ہوتے رہیں گے، تم چلو .... میرے پاس آتنا سا بھی وقت نہیں ہے"۔ .... اور سیتا ببل کے گال۔ اپنے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئی — " اے تو تو تھوتا سا، موتا سا، گوتا سا ببلو ہے ...."

اور سیتا دل میں آتنا سا بھی وسوسہ لئے بغیر چل دی۔ باہر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی "اس میں چلیں گے ؟"

درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پیچھے کی طرف لپک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ببل اور سیتا اور آخر درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پہ پڑی۔ ... ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گذری۔ "یہ سوٹ کیس — ؟"

"ہاں" درباری نے کہا

"دیدی کے ہاں جا رہے ہو ؟"

"کہیں بھی جا رہا ہوں' تمہیں اس سے کیا ؟" اور پھر ایک خشمناک نگاہ سیتا پہ پھینکتے ہوئے بولا "تم نے کہا نہیں تھا، جہاں بھی لے جاؤ گے، جاؤں گی"

سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں درباری کے چہرے کی رنگت، سوٹ کیس .... بچہ .... اس نے ڈر کے عالم میں ببل کو سیٹ پہ بٹھا دیا اور تھنے پھلاتی ہوئی بولی "ہاں، کہا تھا —"۔

سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پہ پھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چرالیں۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا۔ ساری کے پلو سے اس نے اپنا لال ہوتا ہوا چہرہ پونچھا۔ درباری نے خمار آلود نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا "سیتا! تم پھر لگی ہو، اس دن کی طرح کرنے"

سیتا ڈر گئی — "نہیں تو" وہ بولی

ٹیکسی حاجی علی کے پاس سے جا رہی تھی۔ آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مون سون سے پہلے ہوتا ہے۔

join eBooks Telegram

میلا کچیلا، گندہ اور گیلا... شاید دُور کہیں برسات شروع ہو چکی تھی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں جا پڑ رہی تھیں...

پھر وہی سفر ـــــ ٹارڈیو، اوپرا ہاؤس، جہاں تھا گاندھی روڈ، فلورا فاؤنٹین ـــــ اور ایک ہوٹل۔ آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں اُس دن گئے تھے۔

سامنے ایک بیرہ کھڑا تھا۔ درباری، سیتا اور ببّل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عزّت، بڑے ہی احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ درباری اُترا۔ ٹیکسی والے کو پیسے دیے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس اُٹھانے کا اشارہ کیا... سیتا اُتری۔ اس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں اور ببّل کو اپنے بازوؤں میں لینے سے جیسے اسے کچھ تامّل ہو رہا تھا

"اُٹھاؤ نا" درباری نے ببّل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بچہ ہمیشہ عورت اُٹھاتی ہے۔"

سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں ببّل کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ اب بھی اُٹھانا نہ چاہتی تھی لیکن، درباری اور اس کے غصّے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اس کی وحشت سے خائف تھی۔ اس نے ببّل کو اُٹھا تو لیا۔ لیکن اس سے پیار نہ کر سکتی تھی... اسے کچھ کچھ، کھٹے کھٹے، گندے گندے ڈکار سے آنے لگے تھے

ہوٹل اُوپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا ـــ کمرہ ہے؟... اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ ورانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت بھی نہ تھی

سیتا نے دیکھا ـــــ سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور گھی کے ڈرم کے ڈرم لڑھکا رکھے ہیں۔ رستہ جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اُوپر گئے تھے۔ ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندہ لگ رہا تھا۔ پوری فضا سے کسی باسی دہی کی بُو آ رہی تھی،

رستے کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اُوپر پہنچ گئی۔

منیجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدّس سی چمک چلی آئی۔ وہ عجلت سے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا اور دونوں ہاتھ کمرے کی طرف سویپ کرتے ہوئے بولا... "ویلکم سر..."

آج سب کمروں کے دروازے سیتا اور درباری پر کھلے تھے۔

درباری نے منیجر سے کہا ـــــ "ہم بلی مورا سے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں۔ رات گیارہ بجے والی پنجاب میل سے آگرے جائیں گے۔ جہاں تاج محل دیکھیں گے جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی ممتاز کے لیے بنوایا تھا۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی، جتنا جرم کا احساس تھا کیونکہ اس نے اس سے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کیے تھے اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا..." پرالن باؤ یل

کی ضرورت ہی نہ تھی۔ منیجر "سر، سر" کرتا رہا۔ ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی، ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا ..... سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجالاتا،

رجسٹر پر دستخط کرنے کے بعد درباری کمرے میں پہنچا تو ببل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے

"یہ کس نے دیئے ؟"

"بیرے نے" سیتا بولی

"اور یہ — آئس کریم کی کون ؟"

"پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے"

اور بیرہ بچے کے لئے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا... جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا اور آج ایکاایکی اسے کوئی کام، ایسا روزگار مل گیا تھا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹی نہیں ہوتی۔ جس کے سامنے بیس کی آمدنی اور بیگار کوئی معانی نہ رکھتے تھے۔ وہ خوش تھا اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ یوں کھڑا تھا، جیسے وہ کسی کو نہیں، کوئی اسے ممنون کر رہا ہے۔ وہ جانا، ٹلنا نہ چاہتا تھا —

"اچھا بیرہ" درباری نے بے رخی سے بچے کو جھپٹتے ہوئے کہا "ہم تھک گئے ہیں، دیکھو، کب سے چلے ہیں۔ اب تھوڑا آرام کریں گے"

"جی ؟" بیرا بولا "میری جرورت پڑے صاحب..."

درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ سچ مچ تھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا ببل کو دودھ پلانا بُرا لگ رہا تھا، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کہتا تو بُرا لگتا، بہت ہی بُرا،

جبھی اپنے کھلنڈرے پن میں ببل نے کٹوری کو ہاتھ مارا اور وہ دودھ نیچے گر گیا — "ات! گندا کہیں کا" سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منہ پونچھنے لگی۔ اور جھاڑن سے فرش صاف کرنے لگی۔ ببل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی بانہہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی، درباری کچھ خجل سا نظر آنے لگا تھا

"یہ ہوٹل کوئی اتنا اچھا نہیں" وہ یونہی سی کوئی بات کرنے کے لئے بولا

"ٹھیک ہے" سیتا بے پروائی سے بولی

پھر درباری نے ناک سکوڑ کر اِدھر اُدھر سونگھا اور کہنے لگا — "کوئی بو سی آ رہی ہے..." اور پھر اس نے خجالت کے قطرے اپنے ماتھے پر سے پونچھ ڈالے اور بے جرم کی حالت میں بولا "تم اب

اسے چھوڑ دیجیٔ"

سیتا نے ببل کو بہلانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹلا ہو گیا

درباری نے ایک ایش ٹرے ببل کے پاس لا رکھی اور ببلؔ اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا۔۔۔۔۔ وہ کیا کرتا؟

پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی، بے ڈھنگے، بھونڈے انداز میں سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا،

"بھگوان کیلیۓ۔۔۔" سیتا بولی، اور اس نے ببل کی طرف اشارہ کیا

لیکن، درباری کی آنکھوں پر جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک ترو تازہ اور شاداب لڑکی۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کے نہیں، لکڑی کے معلوم ہو رہے تھے۔ اور سیتا کے نرم اور گداز جسم میں کھبے جا رہے تھے۔ سیتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درباری کی باہنوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بیدم ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔ آج وہ خود ہی بے سہارا ہو جانا چاہتی تھی۔۔۔

ببل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا، جیسے وہ لڑ رہے ہوں

سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری سیتا سے کہہ رہا تھا۔ "دہی مطلب ہوا نا۔ تم مجھے پیار نہیں کرتیں"

"میں تم سے پیار نہیں کرتی؟۔۔۔۔ میں تم سے۔۔۔۔"

ببل نے ایش ٹرے کی راکھ منہ پر مل لی تھی اور اب رونے لگا تھا!

"چپ بے" درباری نے نفرت اور غصّہ کے ساتھ کہا

سیتا چونکی، وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی، لیکن ـــــ اس کے ہاتھ بازو جواب دے چکے تھے

درباری کی ڈانٹ کے بعد ببل نے ایک دہشت کے عالم میں چلّانا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ وہ لپکا جیسے بچے کا گلا گھونٹ دے گا۔ مرد اور عورت کے بیچ اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ ببل کے پاس پہنچتے ہی اس نے زور سے ایک تھپڑ ببل کو مار دیا، ببل لڑھک کر دُور جا گیا۔

"شرم نہیں آتی" کہیں سے مصری کی آواز آئی،

درباری نے پلٹ کر دیکھا ـــ مصری نہیں سیتا تھی جو کسی ان جانی طاقت کے آجانے سے نیم برہنہ حالت میں اُٹھ کر ببل کے پاس چلی آئی تھی اور اسے اُٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ ببل سیتا کی چھاتیوں میں سر دیئے رو رہا تھا سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منہ اٹھایا اور بندھی ہوئی گھگھی کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو ـــ اس نے مجھے مارا!

join eBooks Telegram

آج درباری کو پتہ چلا آتنے صاف ستھرے کپڑوں میں بھی وہ کتنا گندہ ہے، وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا، جتنا بیل سے . . . لیکن اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں

جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل میں سے اُٹھایا اور بیل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ وہ ایک بہت بڑی حد تک برہنہ تھی اور بیل سے اپنی برہنگی کو چھپا رہی تھی ۔ اور درباری کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ دنیا کا سفلہ ترین انسان تھا، جو اس کمینی حد تک اُتر آیا تھا . . . پھر اس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی!

شرمساری، ندامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ بیل کی طرف بڑھایا۔ سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی بیل کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی۔ لیکن، وہ کیا کرتی۔ بیل خود ہی بیتاب ہو کر درباری کے بازوؤں میں لپک گیا۔ اور روتے ہوئے اُلٹا سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو۔ اس نے مجھے مارا . . . اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ رہی، اور نہ سیتا کے پاس ——

"سیتا" درباری نے کہا

سیتا کچھ نہ بولی، وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کا پلّو کھینچا اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

"سیتا" درباری پھر بولا "تم کبھی . . . کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟" اور پھر شک و شبہے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہم پہلے شادی کریں گے"

اور پھر اس نے ہمت کر کے اپنا دوسرا بازو سیتا کے گرد ڈال دیا۔ نہ جانے سیتا کو کیا ہوا، وہ درباری سے لپٹ گئی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں اب درباری کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔ دونوں کے دُکھ ایک ہو گئے تھے، اور سُکھ بھی . . . .

ان دونوں کو روتے دیکھ کر بیل نے اپنا رونا بند کر دیا۔ اور حیرانی سے کبھی سیتا اور کبھی درباری کی طرف دیکھنے لگا . . . جبھی ایکا ایکی وہ ہنس دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اپنے گرمرے کے لئے درباری کی مٹھی کھولنی شروع کر دی . . . !

---

join eBooks Telegram

راجندر سنگھ بیدی

لمبی لڑکی

آخر جب مُنّی سوہنی پانچ فٹ آٹھ انچ کی ہوگئی تو دادی رُقمن نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ارے! — میں تیرے لئے کہاں سے گھڑا کے لاؤں گی؟" وہ اپنے ڈہائی بال نوچتے ہوئے بولی اور اب کے سچ مچ روتی ہوئی وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے، بوڑھے اور بیمار پلنگ میں پیچھے کی طرف یوں جا بہی جیسے گھڑے سے پانی چھلک کر کچی زمین میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔

مُنّی سوہنی کیا جواب دیتی؟ اس نے پہلے اپنی طرف دیکھا اور پھر بے بسی میں دادی رُقمن کی طرف جیسے وہ کہہ رہی تھی — اس میں میرا کیا قصور؟ ... مُنّی تو اپنی لمبان سے آپ ہی شرمندہ تھی جیسے جوانی کی ناگہانی یورش کے بعد ہر کنواری گھبرا اٹھتی ہے۔ کوئی پوچھے جب پیڑ پر پھل لگتے دیکھتے ہیں تو کیا پیڑ گھبرا کے شرمانے لگتا ہے؟

پلنگ کے پاس اخروٹ کی ایک تپائی رکھی تھی جس پر عقیدت کے رنگوں سے کڑھا ہوا ایرٹیکس کا ایک کپڑا پڑا تھا اور اس کے اوپر پانڈوؤں کے زمانے کی، پرانے چھاپے کی ایک گیتا، جس کے پنّے کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ گیتا ہمیشہ دادی کے سرہانے پڑی رہتی۔ ہاں، دادی کا کیا پتہ؟ — اب ہوئی تب نہ ہو۔ بیاسی برس کی عمر تھی اس کی اور جہاں گھر اور اس تیلی محلے کے لوگوں کی جے آسی بڑھتی جا رہی تھی، دادی ماں کی اُمیدیں جوان ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی اور، بیاسی سال اور جینا چاہتی تھی جیسے ابھی کوئی سواد نہیں آیا۔ آیا ہے تو ابھی آیا ہے۔ اس کی دھندلی مگر بے چین آنکھیں نہ معلوم اور کس دھیرج گھٹنا کو ڈھونڈتی تھیں؛ نہ کس واقعے، چٹخارے کی تلاش میں تھا؟ اس کا چہرہ پیڑ پر سے گرے ہوئے پیپل کے پتے کی طرح تھا جس میں رگوں اور ریشوں کا ایک جال سا نظر آتا تھا۔ ہریالی کہیں نام کو نہ تھی۔

دادی رُقمن کی ہریالی کہیں نہ کہیں ضرور اُگی ہوئی تھی۔ دمے کے سبب وہ کھانستی، ہوا سے ہو رہی ہیں، ہوائی تھیلیاں بھرتی، فضا میں پھوہاریں چھوڑتی ہوئی، بے دم، بے سدھ ہو کر پیچھے کی طرف

join eBooks Telegram

لڑھک جاتی۔ آنکھوں کی پتلیاں اُوپر کی طرف سمٹی ہوئی وہم دوادہ کو دیکھنے لگتیں۔ پران پانچ چکروں میں سے نکل کر چھٹے میں چلے آتے۔ گلے کا گھنگھرو بجنے لگتا۔ بھابی شیلا بیٹی کوٹ ہی میں بھاگی آتی۔ دادی کو آخری سواسوں میں دیکھ کر آنکھیں پھیلاتی، چلاتی — "ہائے! کوئی ان کو خبر کرو"۔ . . . مُنّی سہمی دوڑتی — روتی، پکارتی ہوئی — "بابو! کہاں ہو؟ — دادی گئی!" اور پھر دادی سے لپٹ جاتی — "دادی! بھاگے ماں کی بیٹی . . . مجھے چھوڑ نہ جانا . . . "

اور پھر بھابی شیلا اور مُنّی سوہی مل کر گیتا کے سترہویں ادھیائے کا پاٹھ شروع کر دیتیں۔ جس پاٹھ کے بعد اس کا پھل دادی کے نمت دینے لگتیں تاکہ دادی کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ایک تو ویسے ہی موت کے وجود کا احساس، اس پر آوازوں میں ڈرتا، کانپتا ہوا ترنم . . . پوری فضا میں ایک ڈراؤنی، گھناؤنی سی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ پھر ایکا ایکی کوئی سنسنی، جس سے گھبرا کر مُنّی پکار اٹھتی — "دادی ی ی ی ی — " اور اس کی آواز چوکوٹ گونج جاتی۔ جبھی بھابی بڑھیا کے بھاگ میں ہاتھ، کرم میں ہاتھ اور چہرے میں شریر پر ہاتھ دوڑاتے ہوئے کہتی "گئی!" اور پھر — "ارے کوئی نیچے اتارو، دیا کرو۔ بے گئی مر گئی تو خرچا کون کرے گا؟ کون پنڈتوں کو روپے پوجے گا؟ سترہ روپے نو آنے تو خالی یہاں سے ہر دوار کا کرایہ ہے . . . "

اور دادی کو یوں گھسیٹ کر پلنگ پر سے نیچے پھینکا جاتا، جیسے میلے غلاف کو سرہانے سے اتار کر دھلائی میں پھینکتے ہیں۔ اسے زمین پر ڈالتے ہی مُنّی سوہی، رسوئی کی طرف لپک جاتی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد آٹے کا دیا، دیے میں گھی اور گھی میں رَلی لمبی روئی کی بتی اور ہاتھ میں ماچس لئے آتی۔ گھبراہٹ اور ہوا میں جلدی جلدی دو چار تیلیاں پھونکتی ہوئی دیا جلاتی۔ دادی کو روشنی دکھاتی تاکہ بھنور گپھا میں بھی جائے تو ٹھوکر نہ کھائے . . . ہاتھ پر دیا رکھنے کے بعد مُنّی ڈری سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو کر بھابی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے، ہری ادم ہری ادم، کا جاپ کرنے لگتی اور پھر گائیتری کا سہارا لیتی — "اُوم بھور بھور سواہ . . . . "

جب شیلا بھابی کو یقین ہو جاتا بڑھیا کے سواس نکل چکے ہیں، تو وہ زبردستی کے آنسو بہانے لگتی۔ ہاں مُنّی کے آنسو سچے موتی ہوتے۔ دادی کے سوا اس کا سہارا تھا کون؟ ماں گئی، اب دادی بھی گئی تو اس کی پرتیت کون کرے گا؟ اس کے اُس جھوٹ کی گواہی کون دے گا جو ہر عورت، ہر کمزور مرد کو بولنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اس کے الھڑ سے تریا چرتر پر کون پردے ڈالے گا؟ . . . شادی تو ہو گی نہیں۔ کون لڑکا دیکھنے کے لئے گلی محلے کے ہر آتے جاتے کے پیچھے پڑے گا؟ پھر اتنا لمبا لڑکا ملے گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کوئی بیاہے گا نہیں۔ بیاہے گا تو بسائے گا نہیں۔ مگر، دادی رہے گی بھی تو کب تک؟ اس سنسار کے بھو ساگر کی تو کوئی تھاہ

join eBooks Telegram

ہی نہیں کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں۔ کون انگلی پکڑے گا؟ کون پار کرائے گا؟

....دیو بھیا ہیں تو ایسی ہی موج ایسی ہی بہار میں رہتے ہیں۔ سنتے ہیں یہاں سے دو تین بازار پرے اکم ہرڈ وارڈ اسپتال میں کوئی نرس ہے ....اس کے ساتھ رات جاگتے ہیں۔ پہلے تو گھر آتے ہی نہیں۔ آتے بھی ہیں تو مُنہ سے، شریر سے بھبھکے چھوٹ رہے ہیں۔ کچھ شراب کے، کچھ نرس کے۔ یوں بھیّا کو نشہ کم ہوتا ہے۔ پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے نشہ کیا ہی نہیں۔ بگڑے جاتے ہیں ہاں، بن پئے بھلا کون ہے جو یوں دھیرے دھیرے ٹکا ٹکا کر پیر زمین پر رکھتا ہے؟ آدمی، آدمی ہوتا ہے۔ کوئی مور تو نہیں۔ پھر نہ زیادہ ہنستے ہیں، نہ خفا ہوتے ہیں۔ تو بھابی سے جنگ ہوتی ہے۔ وہ اسے نل کے چوبچے میں پٹخ دیتے ہیں۔ وہ جھوٹے برتنوں میں سے کانسی کا طبق اٹھا کر ان کے سر پر دے مارتی ہے۔ وہ سوال میں مارتے ہیں، یہ جواب میں دانتوں سے کاٹتی، ناخنوں سے نوچتی ہے۔ جانے یہ عورت مرد کا ناطہ ہی مار پیٹ کا ہے...

....پھر برتن گلی میں پھینکے جاتے ہیں جو برتن نہیں رہتے۔ ایک طرح کا تیوہار بن جاتے ہیں۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے، گلی کے سب اس گھر میں آدھمکتے ہیں۔ بڑی بڑی نصیحتیں، بڑے بڑے بھاشن دیتے ہیں۔ لڑائی کیا چکاتے ہیں، اور جھگڑا بڑھاتے ہیں۔ بھلا لڑائی چکانے میں کوئی اپنی آستینیں بھی چڑھاتا ہے؟... اندر سے وہ کتنے خوش ہوتے ہیں، یہ آپ بھی نہیں جانتے۔ پھر کپڑے پھاڑے جاتے ہیں۔ پہلے تو بھابی بے پردہ ہو جانے کے ڈر سے ہار مانتی ہوئے اندر بھاگ جاتی تھی پر ایک دن ایسا آیا کہ وہ سب کے سامنے کھڑی تھی ـــ ننگی! اس پر دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے، مجسٹریٹ کی طرح.... ہے رام! ایک پہراوا بھگوان دیتا ہے، دوسرا انسان۔ انسانوں میں رہنا ہے تو ان کا پہراوا پہننا ہی پڑے گا۔ اور بھابی ـــ انسان میں بھگوان کا پہراوا پہنے کھڑی تھی.... پڑوس میں جینیوں کے دو خاندان ہیں ـــ شویتامبر جینی اور ڈگامبر.... اس دن شویتامبروں کی دونوں بہوئیں آئی تھیں اور شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بار بار اپنے منہ دھوتی کے پلّو سے ڈھک رہی تھیں۔ ان تک بات رہتی تو کوئی بات نہ تھی، ڈگمبروں کے سوکھم مُنی بھی وہیں تھے جو بھابی کے اس رعب داب کو دیکھ کر بھاگے۔ لوگ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں نا؟ ـــ سوکھم مُنی پاؤں پر سر رکھ کر بھاگے۔ دروازے کی دہلیز کے ساتھ ٹکرائے، پھر لوٹ کے آئے ... پھر گرے اور سو گئے۔ کیڑوں مکوڑوں سے راستہ صاف کرنے والا ان کا بہارو بھی وہیں رہ گیا۔ ناک کا کپڑا بھی گر گیا۔ نہ معلوم کتنے جیو جنتو ان کے پاؤں تلے آکر فنا ہو گئے ہوں گے اور کتنے ناک کے راستے اندر چلے گئے ہوں گے؟ بھابی کو کتنا پاپ لگا ہوگا جب سارے جھگڑے بھول کر دیو بھیا اس پر دری پھینکتے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے....

join eBooks Telegram

یہی بھابی پہلے بات بات پر مائیکے کی دھمکی دیا کرتی تھی۔ جھٹ سے لہنگا سنبھالتی، اکا منگواتی اور چل دیتی۔ پر انت میں وہ سمجھ گئی۔ اب اکا نہیں دھکا بھی ملے تو وہ نہیں جاتی۔ کیوں جائے؟ گھر عورت کا ہوتا ہے۔ مرد مسافر اس بات کو کیا جانیں؟ اس کا باہر ہوتا ہے اس لئے وہی جائے ــــ

... دوسری طرف باپو ہیں۔ جب پولیس میں ڈپٹی تھے تو کیا کھڑکا ڈر کا تھا ان کا مجال ہے جو گھر میں دیے بج جلے، کھانے میں نمک زیادہ پڑے۔ ایسے میں تھالی سدرشن چکر کی طرح گھومتی، سنناتی ہوئی آنگن میں ہوتی تھی، کٹوریوں سمیت۔ اور ایسی گالیاں سننے میں آتیں جو چوک میں بھی نہ سنی جاتیں۔ اُدھر پان گئی، اِدھر باپو و نہ جانے کیا ہوا۔ ایسی اودری پکڑی کہ جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ جیسے کوئی بان پرستھ لے لیا۔ عورت کا راج اپنے سر سے ہوتا ہے تو مرد کا بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ اب وہ صبح سویرے نکل جاتے ہیں اور نیم والی نہر پر ہیں۔ اکھاڑے کے بغل میں ایک بیٹھک، پاکھنڈی مہاتما سے تلسی جی کی چوپائیاں سنا کرتے ہیں، یا وہ مہاتما ٹھیک سے ارتھ نہیں کرتے یا باپو اپنے مطلب کا مطلب نکال لیتے ہیں اور پھر اُودری ہو جاتے ہیں۔ رات گھر آتے ہیں تو چوروں کی طرح۔ پیر سنبھال سنبھال کر زمین پر رکھتے ہوئے۔ گھر بھر میں ڈر کے مارے کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا۔ اکثر تو کوئی کھانا بھی نہیں پوچھتا۔ جب بولا کرتے تھے تو کوئی جواب بھی دیتا تھا۔ اب وہ چپ میں تو سارا سنسار چپ ہے سب ہی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ بان پرستھ لیا تو سنیاس بھی لے سکتے ہیں۔ پھر پنشن گھر میں نہ آئے تو گذارہ کیسے ہوگا، بھیا کی سائیکلوں کی دکان تو چلتی نہیں۔ زس کے لئے جو بیچ میں گول مال کیا تھا، اس کے کارن ایک دن بیٹھے بٹھائے ان کی ایجنسی بند ہو گئی۔

بھیا یوں نہیں آتے، باپو گھر میں نہیں رہتے۔ اب یہاں عورتوں کا راج ہے۔ ہم عورتیں سبھی راج کی اچھا کیا کرتی ہیں، پر جب مل جاتا ہے، تو سر پیٹ لیتی ہیں۔ نا بابا! ایسا راج کسی کو نہ ملے۔ وہ گھر ہی کیا جس میں مرد نہ آئے، حکم نہ چلائے، ہر روز کوئی نیا جھگڑا فساد نہ مچائے۔ عورت بیرلی آخر تو مرد ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مرد کیا ہے؟ ــــ دادی سے پوچھو، بھابی سے پوچھو، سامنے والے شاہد میاں کی آپا سے پوچھو، مجھ سے ..... پر میرا تو وہ آئے گا ہی نہیں۔ آئے گا بھی تو چلا جائے گا۔ تریا کی جات کی ہم عورتوں کی قسمت ہی ایسی ہے

جبھی شیلا بھابی کو دادی ماں کا ماتھا گرم دکھنے لگتا

"یہ تو" وہ ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہتی ــ "جی رہی ہے"

منی سو ہی چھٹپٹا کے لمبے لمبے ہاتھ پیر مارتی چلی سوچ بچار کے جھکولوں سے نکلتی اور لپک کر دادی ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ دیتی جو اسے اپنی جوانی اور اس کی گرمی کے کارن ویسے ہی برف کا برف معلوم ہوتا

join eBooks Telegram

اور پھر تھوڑا گرم۔ جبھی دادی کا کانپتا ہوا ہاتھ زندگی کی تائید میں اُٹھ جاتا سو ہی مری مری جی اٹھتی، شیلا جیسے جی مر جاتی۔

"دادی کو اوپر ڈالو، شیلا بھابی" ممتی چلاتی

بھابی ماتھے پر سات تیکرے پھوڑتی ہوئی کہتی "تم ڈالو تو ڈالو... مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی یہ گیلی لکڑی"

ممتی اپنے لمبے چوڑے کلاوے میں دادی کو اٹھاتی اور بھینچ کر پلنگ پر لٹا دیتی۔ کوئی ہی دیر میں رقمن بولنے جوگی ہو جاتی۔ ہوش میں آتے ہوئے جس پہلے شبد کا اُچار سنا کرتی وہ "منّو" ہوتا جس کے جواب میں ممتی بھی ہمیشہ بڑھیا کو پچکارتے ہوئے بول اُٹھتی —— "ددیا!" جبھی ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے دادی ممتی ہے اور ممتی دادی۔ دراصل ممتی اور دادی ایک دوسری کی طرف چلتی ہیں تو بیچ میں کہیں ایسے موڑ، ایسے نکڑ پڑ جاتے ہیں جہاں ماں کھڑی ہوتی ہے، جو کبھی اپنے آپ بوڑھی ہو جاتی ہے اور کبھی بچی۔ بچی ہو یا بوڑھی، عورت سے ماں بننے کا الزام تو ٹل ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے بل بوتے میں جیتی، اسی میں مر جاتی ہے۔ اور مردوے یہی سمجھتے ہیں —— اس کی آئی تھی، اس لئے چلی گئی....

"تونے مجھے پکارا تھا" دادی منّو سے پوچھتی

"نہیں تو" ممتی جواب دیتی "میں نے تجھے نہیں پکارا"

دادی سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہتی —— "دیکھ... میں نے تیرے باپ کو جنا ہے اور پھر... میں سب جانتی ہوں تیرے چلتر۔ عورت میں چار سو چار چلتر ہوتے ہیں، پر تجھ میں چار سو پانچ ہیں!"

اس پیاری سی پھٹکار کے بعد ممتی تھوڑا اور بھی دادی کے پاس سرک آتی —— "تیری ہوں دادی" اور پھر ایکا ایکی ممتی کو یاد آ جاتا... ہاں، ہاں بے بس ہو کر اس نے دادی کو آواز دی تھی۔ شاید —— یہی آواز تھی جو کھنڈروں پر منڈروں کو چیرتی ہوئی دادی تک جا پہنچی اور اسے پھر اس سنسار میں لے آئی، پر ممتی جانتی تھی۔ اوپر جاتی ہوئے، دادی بھی تو مڑ مڑ کر نیچے دیکھتی ہو گی۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی کچھ کام تھے جو ادھورے رہ گئے تھے، جنہیں وہ نپٹانا چاہتی تھی۔ ممتی آخر مان جاتی —— "ہاں دادی! میں نے پکارا تھا... میری اور سنتا کون ہے؟"

گلی محلے کی کچھ عورتیں مزاج پرسی کیلئے آ جاتیں۔ شیلا بھابی کچھ دیر کھڑی رہتی اور پھر دادی پوتی کے بیچ یہ انوکھی عشق بازی دیکھ کر، ناک بھوں چڑھاتی ہوئی اندر، رسوئی بھنڈارے کی طرف چل دیتی۔

دادی رُکمن پھر اُٹھنا چاہتی۔ بڑھاپے میں اور تو سب چیزیں انسان اُٹھا لیتا ہے، پر اپنے آپ کو اُٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اصل میں بوجھ شریر کا نہیں ہوتا، من کا ہوتا ہے.... دادی جو کوئی سی دیر پہلے مرلی اٹھی تھوڑی ہی کی مدد لینے سے انکار کر دیتی۔ منّی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بھی جھٹک دیتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی" اور منّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ——

"یہی میری دشمن ہے، گھگّو کی ماں"

گھگّو کی ماں قریب ہوتے ہوئے پوچھتی۔ "کیوں ماں.... منّی کیسے دشمن ہو گئی؟"

"میں ابھی چلی جا رہی تھی" دادی رکمن کہتی "اس سسری نے نہ جانے دیا"

پیار سے دی ہوئی اس گالی سے منّی کے سارے چھوٹے موٹے ڈر، سب دُکھ دلدّر دور ہو جاتے۔ ایسے میں دادی دشمن کی بجائے منّی کو سجن کہہ دیتی تو کیا ہوتا؟ پھر دادی کو وہ سارے درشن یاد آ جاتے جو اس نے تھوڑی دیر کی موت میں دیکھے تھے....

"کتنی سندر باٹکا تھی، جمنا!" وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہتی جیسے اب پھر باٹکا دکھائی دے رہی ہو —— "یہ جھوں اور ہری بھری بیلیں اور ان بیلوں میں پھول، ان پھولوں میں پرکاش، جس میں بڑے بڑے رشی منی بیٹھے اکھنڈ کیرتن کر رہے تھے...."

گھگّو کی ماں، جمنا، منّی سب شردھا سے سننے لگتیں۔ دادی کبھی آہستہ، کبھی تیز اللہ کا سب گیان لٹانے لگتی —— "کروڑوں سورجوں کا اجیالا... پھر گرمی نام کو نہیں۔ ایسی ٹھنڈک جو گھبرائے دُکھی من کو ہرا کر دے۔ ایسا سکھ پہنچائے جو کہنے میں نہ آتے.... بس ایک ہی آگ تھی جو بار بار میری اور لپک رہی تھی"

"آگ؟.... آگ کیسی ماں؟"

دادی منّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی "اس نپوتی کی آواج...."

جمنا بول اٹھتی "یہ آواز تو شبد ہوتی ہے، دادی...."

"مورکھ ہوتا" دادی جھلّا کر جمنا سے کہتی "اتنا بھی نہیں معلوم۔ انتر میں شبد اور پرکاش میں کوئی بھید نہیں ہوتا"

"دھنیہ ہو" جمنا کہتی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر دیتی

"دھنیہ ہو دادی" باقی کی بھی پکار اُٹھتیں

اور پھر دادی برابر بولتی جاتی جیسے کوئی چابی لگ گئی یا جیسے کوئی دیر پہلے کی چُپ کا گھاٹا پورا کر رہی ہو۔ پھر اس عمر میں جب کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ جمنا اور گھگّو کی ماں کے سے شردھالو مل جائیں تو اور کیا چاہیے؟

join eBooks Telegram

ان سب کو زور زور سے سر ہلاتے دیکھ کر مُنّی ڈر جاتی پہلے بھائی اور بھابی کے جھگڑے کے کارن گھر بھر لوگوں کی آر جار کا بہتیرا بنا ہُوا تھا۔ اب دادی کے دیوی بن جانے کی وجہ سے۔ جب اور بھی عورتیں آنے لگتیں تو چار سو پانچ چلتر والی مُنّی دادی کی بات کاٹ دیتی ——

"اچھا دادی . . . وہاں سرگ میں تجھے داد نہ ملے ؟"

ایکا ایکی دادی کے ڈال پر سے گرے ہوئے، سوکھے پتّے کے رنگوں اور ریشوں میں ہریالی دوڑ جاتی۔ اور نو بیاہتا کی طرح وہ شرماتے ہوئے کہتی —"ملے کیوں نہیں ری مُنّی"

یکدم پانسہ پلٹ جاتا۔ وہی عورتیں ایک دوسرے کے کولھے میں ٹہوکے دینے لگتیں اور اشارے اشارے میں کہتیں، "سنو، سنو —"

"تب وہ کیا بولے ؟" منی پوچھتی

"پیڑوں کی لسّی مانگ رہے تھے"

مُنّی جمنا اور رنگو کی ماں اور دوسری عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی "دادا جی کو بہت پسند تھی پیڑوں کی لسّی" اور پھر دادی سے بولتی "کیا وہاں سرگ میں پیڑے بھی نہیں، دَدِیا؟"

"پیڑے بھی نہیں، کھنڈ کڑھی بھی نہیں"

—— کھنڈ کڑھی دادی کو بہت پسند تھی!

"ایسے سُرگ میں جانے کا کیا فائدہ؟" مُنّی کہتی

"دُبّی تو" دادی اپنے بھولپنے میں جواب دیتی "کل تم دیول کے پجاری جی کو نیوتا دینا اور ساتھ پنڈت رلیا رام کو بھی۔ خوب کھانا کھلانا اور پیٹ بھر کے پیڑوں کی لسّی پلانا ——"

عورتیں اپنی ہنسی دبائیں مُنّی کہتی "ہاں دادی . . . یہ کوئی سُرگ تھوڑے ہے جہاں پیڑے بھی نہ ہوں ——"

اور دادی سامنے دیکھتے ہوئے بولتی جاتی "وہ کیسے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے . . . سندر کی ہیروں جواہروں سے جڑتے مرتے جو کھٹ میں۔ ویسے ہی کشیر جوان یہ چوڑی چکلی چھاتی، لٹ لٹ کرتا ہوا چہرہ۔ اس پہ یہ بڑے بڑے مونچھوں کے گُچھے . . . .

عورتیں ——

"کالے گُچھے؟" مُنّی کہتی "ابھی تک ان کی مونچھیں کالی ہیں؟

دادی پوپلے مُنہ کے ساتھ تھوڑا ہنس دیتی —— "پاگل ہے . . . کال جگوان کی مار دھاں تک

join eBooks Telegram

نہیں پہنچتی، مُنّو۔ وہاں جوان بوڑھے نہیں ہوتے۔ میں نے دیکھا ان کے پاس ایک سندر، سجل لڑکی تھی۔ کیسا رُوپ تھا اسی پر ــــ"

"کیا بات کر رہی ہو دادیا؟" مُنّی بولی اُٹھی "وہاں بھی دادا ــــ"

"ہاں ۔ ۔ ۔ یہ بھی تو پوچھ وہ تھی کون؟"

"کون ــــ کون؟"

"وہ میں تھی ــــ جب بیاہی آئی تھی"

اس پر سب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگتیں۔ ان کی ہنسی نہ سنائی دیتی دادی کو اور وہ کہے جاتی "میرا ہاتھ پکڑ کر بولے ۔ ۔ ۔ تم آجاؤ ۔ ۔ ۔ رتمی ۔ ۔ ۔ اب نہیں رہا جاتا ــــ"

یہ عورتوں کے صبر کی حد تھی!

دادی بولتی ــــ "میں نے ہاتھ چھڑا لیا۔ کہا، میں ابھی نہیں آسکتی۔ جگن کے تپا! ابھی کوئی دیر تو میری راہ دیکھو، مجھے دنیا میں بڑے کام ہیں" اور دادی کے چہرے پر کی نہروں اور جھیلوں میں جھر جھر بہتے پانی کو دیکھ کر عورتیں ایک دم چپ ہو جاتیں۔ دادی ایک ہاتھ تپائی پہ پڑے ہوئے گیتا پہ رکھ دیتی اور دوسرے سے دھرتی کا پتو تھا ستی، آنکھیں پو پھٹی ہوئی، ایک جیوتی بھی نگاہ مُنّی پہ ڈالتی اور بلبلا اٹھتی۔

"ہائے ری سوہی ۔ ۔ ۔ تو کیسے سوہے گی؟"

اسی ایک بات میں باقی کی عورتوں کا اندر بھی پانی ہو کر آنکھوں میں چلا آتا۔ آخر وہ اٹھتیں، ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتیں "دھنیہ ہو"، "دھنیہ ہو ماں" کہتی ہوئی ایک ایک کر کے چل دیتیں ۔ ۔ ۔

جگن ناتھ تیاگی اور ان کے بیٹے دیویندر تیاگی کے مکان ڈپٹی بھون میں کالے بھی آئے اور گورے بھی آئے، پر مُنّی سوہی کے رنگ کا ایک نہ آیا۔ اس کے قد کا ٹھ کو کوئی نہ پہونچا۔

مُنّی سوہی خالی خولی لمبی ہی نہ تھی۔ بدن بھی بھرا ہوا تھا اور رنگ اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی، تانترک شلپیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی یکشی، معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ، بیاہ شادیوں میں جس میں حلوہ یا آڑو پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لئے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں۔ اور پھر کیا حلوہ بنتا ہے، کیا آڑو ہوتے ہیں ۔ ۔ گلی بازار میں نکلتی سوہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی جیسے کہہ رہی ہو ــــ ہٹ جاؤ، میں آ رہی ہوں۔ لوگ راستہ دے دیتے پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے جیسے ڈپٹی جگن ناتھ

join eBooks Telegram

کی نہیں، کسی راجہ کی بیٹی آرہی ہو!

تیاگی کل کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوئیں۔ چھ چھ فٹ کی اور بیٹے چھوٹے اور بے بضاعت سے۔ سب بیٹیوں کی شادی میں یہی مصیبت ہوئی، یہی خلجگن۔ اوپر تین چار پشت میں کوئی ایسی بہو آئی کہ پورے کل کی تباہی لے آئی۔ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رکنے کا نام ہی نہ لیا دادا پہلے آدمی تھے جنہوں نے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کی کوشش کی۔ دادی چھوٹے قد کی لائے۔ مطلب، اپنی بیوی۔ مُنّی کی دادی۔ خود مُنّی کی ماں بیچ کے قد کی تھی۔ دیویندر کی بیوی شیلا بھی ناٹی ملکہ ہوئی۔ دادا کے حساب سے اس پشت میں اولادوں کے ٹھیک ہونے کی اُمید تھی۔ پر شیلا نے سوتی تو دبوچ ہی لئے، لعل بھی نہ اگلا۔ سب ڈرتے بھی تھے، کہ بیٹیاں چھوٹے قد کی ہوئیں تو بیٹوں کا کیا ہوگا!۔ . . . پر اُس وقت تو مُنّی کا سوال تھا جواب پانچ فٹ ڈ ایخ کی ہوگئی تھی۔

کئی گرمیاں آئیں اور کئی گئیں۔ کتنی سردیوں نے شل کیا۔ بہاریں گئیں اور پت جھڑیں بھی۔ سامنے شاہد بھیا کے مکان کے پاس جو کچنار کا پیڑ لگا تھا اس نے کئی ہرے اُودے کوٹ پہنے اور اُتار بھی دیئے۔ ڈپٹی بھون کے باہر برآمدے کے نیچے جو شہتیری ڈالی تھی اس میں چڑیاں بھی چلی آئیں۔ برسات آٹھ آٹھ، سولہ سولہ، بتیس بتیس آنسو۔ دئی اور نئے مکانوں پر ہری اور کالی کائی چھوڑ کر جیسے اپنی سسرال چلی گئی۔ پر مُنّی وہیں تھی — تیلی محلے کی رونق، شام گلی کا مذاق . . . . اب کے سال جو گرمی پڑی تو حد ہی ہوگئی۔ برسوں میں ایسا اُمس کبھی نہ ہوا تھا۔ جمنا کی دونو گائیوں کا دودھ تھنوں میں سوکھ گیا۔ پہاڑوں پر چلے جانے کے کارن، گلّو کی ماں کے گھر لُو لپٹ لینے لگے۔ دن کی روشنی میں اڑنے لگے۔ ... دھرتی سے غبار اُٹھتے اور اپنے دلنغ، آسمان پر چھا جاتے۔ بادل آتے بھی تو گرجے برسے بنا ہی نکل جاتے جیسے کسی بگیا کی سیر کرتے آئے ہوں۔ ایک دھول سی تھی جو ہر وقت چھائی اور عقل کو ماؤف کئے رہتی۔ اس مٹی اور گرد سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی آسمان کی طرف اُچھل رہی ہے اور آسمان دھرتی کی طرف لپک لپک جاتا ہے۔ اس حبس اور حبس میں ایسی لپک جھپک کہ یہ پتہ چلتا جیسے پوری کائنات کو اختناق ہو رہا ہے!

اور تو اور آپا فردوس، شاہد کی بہن جو دو سال سے بھائی کے گھر بیٹھی تھی، چلی گئی۔ دولھا بھائی نے پیر پکڑے، معافیاں مانگیں، توبہ میں کان لال کئے اور آپا کو لے گئے۔ شاہد کوئی ایسے ہی تھوڑے بھیجنے والے تھے، بیچ میں اس قاضی کو بھی لے آئے جس نے نکاح پڑھوایا تھا اور حق مہر باندھا تھا۔ آپا فردوس کے رخصت ہوتے وقت مُنّی اتنا روئی کہ تالاب بھر گئے۔ آپا نے بہت پیار کیا، بہت تسلی دی اور کہا — "میں پھر آؤں گی، منّو — تیری شادی پر تو انشاءاللہ ضرور آؤں گی۔" مُنّی سوہی نے فریادی نظروں سے آپا فردوس کی طرف

join eBooks Telegram

دیکھتے ہوئے کہا — "تب تو تُو نہ آئے گی آپا!"

ڈگا مبردوں کی بہو ترمیک بائی نے کہا — سیلی کے جانے پہ تھوڑی کوئی آنا روتا ہے؟" جب مُنی نے اپنے آنسوؤں کو خون بنایا اور پی گئی ۔۔۔۔ پر دادی تھی جو خون کو آنسو بنائی رہتی ۔ شیلا اب اس سے تنگ آچکی تھی ۔ اس لئے بھی کہ دادی اب پلنگ ہی پر چادر گیلی کر دیتی ۔ دیویندر کتنا بھی شرابی کبابی تھا مگر دادی سے پیار کرتا تھا ۔ پیار مردوں کو سستا پڑتا ہے ، اس لئے کہ مرنا نہیں پڑتا ۔ بس خالی خولی ہمدردی جتائی ، دنیا کی نظروں میں اپنی نگاہوں میں اچھے بنے اور چل دیئے ۔ دادی کے پلیت کئے ہوئے کپڑے منی دھوتی تھی اس پر بھی شیلا ناک پہ دوپٹہ رکھے ہوئے اندر آتی ، باہر جاتی ۔ دیویندر کو یہ نظارہ بہت تنگ چڑھا معلوم ہوتا ۔ ایک دن وہ بولا —

"تم چاہتی ہو دادی مرجائے ؟"

"ہاں" شیلا بے جھجک بولی

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے"

"کیا طریقہ ؟"

"مُنی کا بیاہ کردو"

شیلا سٹپٹا گئی ۔ "میں تو کہتی ہوں ، دادی بھی جائے اور اس کی پوتی بھی ۔ مجھ سے اب کسی کے کرائے نہیں مرے جاتے" اور پھر بولی "کل بہن تمہاری اونچی ایڑی کا جوتا دیکھ رہی تھی ۔۔۔ میں تو کہتی ہوں پہنے ۔ سر بادلوں میں سمائے انہیں اوپر کی اوپر چلی جائے"

دیویندر چپ رہا ۔

"اور نہیں تو کیا" شیلا پھر بولی "دونوں کے لئے جم راج کیا مجھے ڈھونڈنے ہیں ؟"

جم راج ڈھونڈنے کی ذمے داری چونکہ دیویندر کی تھی ، اس لئے وہ کچھ نہ بول سکا ۔ وہ طبیعت ہی سے کام چور تھا ۔ ہر قسم کی ذمے داری سے گھبراتا تھا ۔ جو کام اپنے آپ ہو جائے سو ہو جائے ۔ اپنے پتا جگن ناتھ کی طرح وہ بھی اپنی اس کاہلی اور بے عملی کے سلسلے میں شاستروں اور پرانوں کی مدد لیتا — مانس کا سب جتن چترائی ہے ۔ بھگوان نے کہا ہے ۔ تم پورے طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو تمہارے سب کارج سدھ ہو جائیں گے ۔۔۔ کام ہوگا یا نہیں ہوگا ۔ اس لئے پچاس فیصد کے تناسب سے ایسے لوگوں کے کارج سدھ ہو بھی جاتے ہیں ۔

دیویندر برآمدے سے اٹھا ، صحن میں آیا ۔ ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادل گھر آئے تھے ۔ کیوں نہ آتے ؟ یہ موسموں کا چکر بھی ایک سائیکل ہوتا ہے ۔ سردی کے بعد گرمی ، گرمی کے بعد برسات ۔ اوپر بھی کبھی

join eBooks Telegram

کسی گول مال سے ایجنسی بند ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اُدھر برسات کی پہلی بوند گری۔ اِدھر گوتم، دیویندر کے بچپن کا دوست کلکتہ سے چلا آیا، جہاں اس کے پاس ہند سائیکلوں کی ایجنسی تھی اور اب یہاں دینا پور میں سب ایجنسی قائم کرنے آیا تھا۔

گوتم قد کے اعتبار سے شکل سے پانچ فٹ ڈیڑھ انچ کا ہوگا۔ لیکن تن و توش کے اعتبار سے اچھا تھا۔ آکا باکا سا چہرہ۔ لال رنگ۔ معلوم ہوتا تھا گالوں میں دو ٹماٹر دبا کے رکھے ہیں۔ بات بات پر اُچھلنا جیسے نہ جانتا ہو اس صحت کا کیا کرنا ہے؟ دیویندر نے گوتم کو چائے پر گھر بلایا۔

شیلا کے کان گوتم کی باتیں سنتے سنتے پک گئے تھے لیکن اس نے اُسے دیکھا نہ تھا۔ شاید اس سے پہلے گوتم اس گھر میں کبھی آیا بھی نہ تھا۔ اس لئے بھابی تو سپنے میں بھی نہ دیکھی تھی۔ شیلا سے یوں تپاک سے ملی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ دیویندر نے شیلا کو چائے لانے کہا اور پھر اُٹھ کر اُس کے کان میں کھسر پھسر کرتے ہوئے اندر بھیج دیا۔

بس، یہی غلطی ہوئی۔ شیلا اندر گئی تو چائے بناتے ہوئے مُنّی سے کہدیا: "مُنّی، اندر بیٹھک میں جا بیٹھو"

"کیوں؟" مُنّی نے پوچھا "وہ آگئے، بھیا کے ـــــ؟"

"ہاں"

اور پھر شیلا خود کیتلی دیگچی نکالنے لگی۔

بھابی منع نہ کرتی تو شاید مُنّی کو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب۔۔۔۔ اس کے تن بدن میں کوئی آگ سی لپک آئی۔ وہ اب اس حالت کو پہنچ گئی تھی جس میں لڑکیاں آنکھیں بند کر کے صرف آوازیں سنا کرتی ہیں اور پھر بے دم ہو کر گر جاتی ہیں۔ مُنّی سوہی کے لئے شاید آواز کافی نہ تھی۔ بھابی کے اندر جاتے ہی وہ برآمدے کی طرف لپکی اور سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی نیم چھتے پر جا پہنچی۔ جہاں ایک روشندان بیٹھک کے اندر کھلتا تھا ـــــ

شیلا ٹرے میں چائے اور کچھ دال موٹھ وغیرہ لئے بیٹھک میں آئی۔ دیویندر نے اُچھلتے ہوئے کہا ـــ "ٹھہرو۔۔۔۔ میں کچھ پیڑے لے آؤں"

"ارے نہیں بھائی۔۔۔۔ گوتم نے روکا

"ایک منٹ میں آتا ہوں" دیویندر نے کہا "میں جانتا ہوں تم پیڑے بہت پسند کرتے ہو" اور اس سے پہلے کہ دیویندر کو کوئی روکے، وہ نکل گیا تھا۔

مُنّی روشندان سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم آگے بڑھ بڑھ کر بھابی شیلا سے دیور کا رشتہ جگا رہا تھا۔ دیور بھابی کا رشتہ جو ایک طرح سے ہر دیور کے لئے شادی کی ریہرسل ہوتا ہے۔۔۔۔ جس میں ادب کی حد سے پرے اور ننگے پن کی سیمائے ورے کی باتیں ہوتی ہیں۔۔۔۔ بھابی چیز بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی برنس

join eBooks Telegram

اس کا ہر پور چھیڑنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گوتم شیلا سے کہہ رہا تھا "کوئی زور لگاؤ، بھابی ــــ ایک بیٹا جن دو، نہیں تو یہ بھیا میرا دوسری شادی کرلے گا۔"

دیویندر ابھی آئے نہیں تھے۔ بھابی نے دال موٹھ والی پلیٹ سامنے رکھ کر چائے انڈیلی اور کہا ــ "ہاں دیور جی ــــ یہ کہہ بھی رہے تھے"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہ اگلی بیساکھی تک کچھ نہ ہوا تو ــــ یہ دوسرا بیاہ کرلینگے" اور شیلا نے جان بوجھ کر منہ پرے کرلیا۔ جیسے رونے لگی ہو

گوتم لپک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا ــ "سچ بھابی؟"... اور اس کے ہاتھ ان جانے ہی میں آستینیں چڑھانے لگے جبھی اسے ایک کھلی سنائی دی۔... بھابی ہنس رہی تھی!

گوتم سمجھ گیا۔ ایک تسکین کی سانس لیتے ہوئے بولا: "اوہ بھابی ــــ تونے تو میری جان ہی نکال لی" اور پھر چارپائی پر دھم سے بیٹھ گیا جو صوفے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی

بے وقوف تو گوتم بن ہی گیا تھا لیکن اس ہزیمت سے بچنے کے لئے برابر ہاتھ پیر مارتا رہا۔ ظاہر ہے گھر آنے سے پہلے دونوں دوستوں میں کچھ تو راز و نیاز کی باتیں ہوئی ہوں گی۔ چائے کی پیالی تھامے ہوئے وہ شیلا کے قریب ہوگیا اور کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولا "مذاق کی بات نہیں بھابی! سنا ہے دیویندر بھیّا نے ایک نرس رکھی ہے ــــ"

شیلا کے من میں آگ کا ایک بھبھاکا سا اٹھا۔ سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ اب وہ نہ مذاق کر سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔ اس کے اہم کو چوٹیں لگی تھی، اس میں اس نے گوتم ہی کا تختہ کردیا۔ ایک دم ناک پھلاتے ہوئے بولی ــ "ٹھیک ہے... مرد ہے تو رکھتا ہے نا۔ اور کیا تم ساچوہا عورت رکھے گا؟"

دیویندر پیڑے لیکر آیا تو گوتم رومال سے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھ رہا تھا!

منی کی تلاش میں دادی رتن گھسٹتی ہوئی نیم چھتے پر آئی تو دیکھا ــــ منی بے ہوش پڑی ہے۔ دادی نے سر پیٹتے ہوئے آوازیں دیں۔ شیلا آئی، پھر گلو کی ماں اور سب نے مل کر ایک پچھے سے منی کی دندن کھولی۔ ہاتھ اور پیر مل مل کر سیدھے کئے۔ بڑا ڈرا ماہوا مگر گوتم جب تک رخصت ہو چکا تھا ــــ

کچی پکی جگہ، سایہ آسیب کی باتیں ہونے لگیں لیکن بھیتر سے سب جلی تی تھیں۔ یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ منی ہوش میں آئی تو شرمندہ تھی، اپنے آپ سے شرمندہ ــــ "نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟" وہ بولی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شام تک مُنّی ٹھیک ہو چکی تھی اور گھر کا کام کاج کر رہی تھی۔۔۔۔آج شیلا نے سبزی اور دال دونوں میں غلطی سے دو بار نمک ڈال دیا تھا۔اب وہ اور مُنّی دونوں ڈر رہی تھیں۔باپو آتے تو کیا ہوگا؟ وہ تو عام نمک سے بھی کم پسند کرتے ہیں۔کہیں پرانے جلال میں آئے تو تھالی کٹوری سب باہر پٹخ دیں گے۔

رات باپو آئے۔ہمت کر کے مُنّی نے کھانا پروسا اور باپو نے کھانا شروع کیا۔شیلا اور مُنّی دونوں کی آنکھیں باپو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔پہلا ہی گراس باپو جی کے مُنہ میں رُکا۔پھر انہوں نے یوں اندر نگل لیا جیسے روٹی نہیں، حلوہ کھا رہے ہوں۔شیلا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"آج نمک کچھ زیادہ ہی پڑ گیا ہے، باپو جی"

باپو جی نے ایسے کہا جیسے انہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔بولے "نہیں تو بیٹا ـــ نمک تو ٹھیک ہے، بالکل برابر ہے ـــ"

دو چار نوالے اور مُنہ میں ڈالتے ہوئے بولے "دراصل آج مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔ مہاتما جی نے ڈھیر سا پرساد دے دیا نا"

مُنّی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور دوڑ کر جمنا کے ہاں سے تھوڑی دال لے آئی۔اور باپو کے سامنے رکھی۔باپو جب تک تھالی پر سے سر کا چکے تھے۔شیلا اندر بستر ٹھیک کرنے کے لئے چلی گئی تھی مُنّی نے کٹوری تھالی میں رکھ کر اسے قریب کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔"کھانا پڑے گا، باپو جی"

باپو جی کو بھوک تو لگی تھی۔چپکے سے نوالہ توڑ کر دال میں بھگوتے اور منہ میں رکھتے ہوئے اندر کی طرف دیکھا اور بولے ـــ "بہو کیا کہے گی؟"

دوسرے دن گوتم کو آنا تھا ـــ لڑکی دیکھنے!

مُنّی کو تو کوئی اُمید نہ تھی۔بھابی نے جو اس کی درد دشا کی تھی۔اس کے بعد تو کوئی بھی مرد اس گھر میں نہ گھستا۔پر اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔بھابی کے شبدوں نے گوتم میں کا مرد اور بھی تشدد سے جگا دیا

بیٹھک میں آج باپو تھے، دیویندر بھی اور داوی بھی۔مُنّی کو سادہ مگر خوبصورت کپڑے پہنا کر ایک طرف بٹھا رکھا تھا اور اسے کڑی ہدایت تھی کہ اٹھے نہیں! ورنہ سب معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔

گوتم آیا۔اس کی پگڑی کو بہت کلف لگا تھا شملہ سر پر ایک فٹ اوپر اٹھا ہوا تھا۔اور اپنے نلٹے قد کے باوجود وہ لمبا معلوم ہو رہا تھا۔آتے ہی اس نے مُنّی کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔مُنّی کی محجوب نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور اندر ہی اندر وہ کانپ رہی تھی۔ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ایکا ایکی گوتم کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرنے لگا۔پھر اس نے مُنّی کی طرف دیکھا اور دیویندر سے بولا۔

join eBooks Telegram

"بھیا!.... تم بھی پانی پیو گے؟"

"ارے ارے! پانی کیوں؟" دیویندر نے کہا "کوئی شربت لاؤ شیلا۔"

شیلا کی بجائے خود حکم لینے کی عادی منّی ایکا ایکی اُٹھی۔ دادی نے دھپ سے ایک ہاتھ منّی کے سر پر مارا۔ "بیٹھی رہ .... تو کہاں جا رہی ہے"

اور منّی جو آدھی ہی اُٹھی تھی، بیٹھ گئی۔ لیکن، آدھی ہی میں وہ ساری معلوم ہو رہی تھی.... اسے کچھ یاد آیا، کچھ بھول گیا....

اس شام محلے بھر کے مُنہ میٹھے ہونے لگے۔ بدھائیاں ملنے لگیں.... گوتم نے منّی سوہی کو پسند کر لیا تھا۔!

سب کو یقین ہو گیا تھا کہ منّی سوہی جا رہی ہے۔ ایک نہیں یقین آ رہا تھا تو دادی رُکمن کو۔۔ میں تو اُس دن مانوں گی جس دن بچی یہ ڈیوڑھی بھون کی دہلیز چھوٹے گی اور ڈولی میں بیٹھتے ہوئے پوری ایک پائیلی چاولوں کی اپنے سر کے اوپر سے پھینکے گی.... اور پھر جیسے شادی میں ہونے ونہ ہونے والی باتیں دادی رُکمن اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ "دیکھ بہو، گوتو کا باپ ڈولی پر سے کھوٹے پیسے بھی پھینکے تو انہیں مہریں سمجھنا" .... پھر اس بات کا ڈر کہ جس بات سے ڈرو، آخر وہی ہوتی ہے۔....

دادی نے دیلل میں مورتی کے لئے دستروں کی منت تو مانی ہی تھی، بڈھن شاہ کی درگاہ پر حلوے کی دیگ بھی مان آئی۔ ساتھ وہ شاہد کی ماں کو بھی لے گئی تھی۔ جیسے رشوت کے طور طریقوں کو اچھی طرح سے نہ جاننے والا کسی بچولے، کسی واقف کار کو ساتھ لے لیتا ہے تاکہ قانون کہیں ہی نہ پڑے۔

اب بیاہ کے سلسلے میں چاروں طرف سے منّی کو ہدایتیں ہونے لگیں۔ جو جانتی تھیں وہ بھی اور جو الھڑ تھیں وہ بھی اپنے اپنے طریقے سے مرد کو مطیع کرنے کے طریقے بتانے لگیں۔ اور پھر دادی ۔۔ جس کے مرد کو گئے ہوئے پچاس سال سے اوپر ہونے کو آئے تھے اور جس کے بچاروں میں مرد اس کی آنکھوں کی طرح دھندلا سا ہو کر رہ گیا تھا، بولی ۔۔ "دیکھ بٹیا! ۔۔ میں تیرے سنگ ہوں گی بھی اور نہیں بھی۔ ہاں، جہاں سہاگن کھڑی ہو سکتی ہے، وہاں بدھوا تو نہیں ہو سکتی ۔۔ یہی ہے ساری دنیا کی ریت۔ یہی خاستر یان بھی کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہیں..... پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی۔ آنکھیں پونچھتی ہوئی جاری ہوتی ۔۔ "اور سن۔ جب پھیرے ہوں گے نا تو جھک کے چلنا۔ بہت جھک کے بیرن! نہیں کیا کرایا سب دھرا رہ جائے گا.... دیکھ یوں.... اور پھر دادی رُکمن سر پر اپنے بیٹے کی جگّن کی بندھی بندھائی پگڑی رکھ لیتی اور ہاتھ میں کرپان کی جگہ کپڑے دھونے والی تھپکی اور

دولہا بنی ہوئی اپنی طرف سے اکڑا اکڑ کر چلتی۔ عورتیں ہنستیں، لڑکیاں لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی ایک دوسرے کے دوہتڑ مارنے لگتیں۔ مُنّی شرماتی، روتی پر دادی اسے برابر پیچھے جھک کر آنے کے لئے کہتی۔

مُنّو کی ماں پکار اٹھتی ـــ "بڑے پھیرے لینا امّاں۔۔۔ ساتوں مت لینا۔۔۔"

ـــ مُنّو کی ماں کا مطلب تھا سات پھیرے ہوئے تو مُنّی کی دادی کے ساتھ شادی ہو جائے گی۔ ایسی شادی جسے دید شاستر تو کیا سوئم بھگوان بھی نہیں توڑ سکتے۔

جب مُنّی پیچھے آتی ہوئی تھوڑا کم جھکتی، دادی مڑ کر دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پہ مارتی ـــ نیچی اور نیچی۔۔۔۔ مُنّی درد سے بلبلاتی ہوئی روتی بھی اور ہنستی بھی ـــ بھاڑ میں جائے ایسا دولہا، وہ دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ دادی اسے پھٹکارتی ـــ "دو نصیبوں جلی، عورت نہ جھکے تو اس سنسار کا چکر نہیں چلتا۔۔۔ نویں سو گویا ہوئے۔۔۔ جو نیچا ہوتا ہے، آخر وہی اونچا ہوتا ہے۔ اور پھر تو جو جھکے تو اور بھی نیچی ہو کر چلنا چاہئے جسے سوئم بھگوان نے اونچی بنایا۔۔۔ مرد کا سواگت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جاچک ہوتا ہے نا، تمہیں کوئی دان مانگتا ہے جو دینا ہی اچت ہے۔ کبھی دیوی بھی بھکاری پر اپنے کواڑ بند کرتی ہے؟"

یہ دادی کو بھی نہ معلوم تھا کہ دیکھنے میں یہ سرکش لڑکی وقت آنے پر جھک کے چلنا تو ایک طرف، رینگنے، لیٹ جانے کو بھی تیار ہو گی

شیام گلی میں ایکا ایکی جیسیوں ہی لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ وہ آج تھوڑی پیدا ہوئی تھیں؟ تھیں وہ یہیں ـــ برسوں، صدیوں سے بس بیاہ کا شبد اُچارن کرنے کی دیر تھی کہ وہ جیسے کسی جادو کسی جنتر کے زور سے بے اختیار، بے بس، ایک دوسری پر گرتی پڑتی ہوئی کہیں سے آ گئیں۔ جیسے آموں کے موسم میں بڑی بڑی، ہری نیلی مکھیاں کہیں سے اپنے آپ چلی آتی ہیں اور جب تک کوئی آم چوستا رہے، وہ ارد گرد منڈلاتی بھنبھناتی رہتی ہیں۔۔۔ آتے ہی وہ کوئی ڈھولک ہاتھ میں لئے بیٹھتی ہیں اور ایسے ایسے نورانی گانے گاتی ہیں جو دادی کی آنکھوں کی طرح کی دھندلی صدیوں سے ان کے گلے میں اٹکے ہوتے ہیں۔۔۔ پھر، ایک جھجار ادا کرنے کو ملتا ہے۔۔۔ جیسے ہر عورت کو بدن سہلوانے، بُلوانے سے ایک عجیب طرح کا رُتھ، ایک خاص قسم کا حظ آتا ہے، ایسے ہی ان لڑکیوں کو بھی، جب کوئی بیجا یا برات میں آیا ہوا کوئی منچلا ان کے چٹکی کاٹ لیتا ہے۔ اور یا کمر میں اس جگہ کو چھو لیتا ہے جہاں بجلی کے سینکڑوں، ہزاروں کلوواٹ جمع ہوتے ہیں۔۔۔ باہر تو کوئی ڈر کے مارے انکی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت کرتا ہے اور نہ یہ اٹھانے دیتی ہیں لیکن شادی بیاہ میں ان باتوں کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ بڑے، چھوٹے سب دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں۔۔۔ بیچ کو بھی تو سلیاں

join eBooks Telegram

ملتی ہیں۔ ایک ایک سالی، آدھی گھر والی۔ اتنی لڑکیوں کا جُھرمٹ، چھیڑنے، پیار کرنے کو پھر زندگی میں کہاں ملتا ہے؟ . . . . اور یہ سالیاں، اپنے رُوپ کی کوئی جھلک دکھا کر، قدم قدم پر کوئی انگیخت پیدا کرتی ہوئی یہیں چھپن، کہیں الوپ ہو جاتی ہیں جیسے یوگیشوروں اور تپیشوروں کے من کی مینکائیں، اللہ والوں کی حوریں جو انہی کے داخلی تخیل کی پیداوار ہوتی ہیں جس کے کارن ان آسمانی عورتوں کے بدن پر ایک بھی تو خط غلط نہیں لگا ہوتا۔ اگر یوگی تپلی عورت کو پسند کرتا ہے تو وہ تپلی ہوتی ہیں۔ بھری پری کا گرویدہ ہے تو وہ بھری پُری۔ اور یوگیشور انہی کے ساتھ آلنگن، انہی کے ساتھ پریم کھیلن کے لئے مچل جاتا ہے اور آگے بڑھنے، اوپر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوگیشور کو پکارتے پکارتے شیرڈی گورو کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور جیوتی سروپ ایشور کی آنکھوں سے جوت جاتی رہتی ہے . . . . اور یہ اپسرائیں، یہ حوریں یوگیوں اور صوفیوں کو اپنے اپنے رتبے، اپنے اپنے مقام سے گرا کر اس خلوتِ صحیح سے ہمیشہ کے لئے غلط ہو جاتی ہیں . . .

مگر، یہ دنیا کتنی پیاری جگہ ہے۔ جہاں کے لوگ خدا نے بنائے اور پھر فرشتوں سے کہا ـــ ان کو سجدہ کرو . . . سالیوں کے چلے جانے کے بعد آخر ایک دن، ایک رات، عظیم "وہ" سامنے بیٹھی ہوتی ہے۔ ویدوں کے منتر اور شاستروں کے ارتھ جس کی طرف کبھی واضح اور کبھی مبہم سے اشارے کرتے ہیں۔ بیاہ شادی کے گیت جس کے لئے مرتعش اور بھٹوں میں جس کے لئے اینٹیں پکتی ہیں۔ مل میں کام کرنے والا مزدور جس کے لئے پان بیڑی کی دوکان پر پہنچ کر اپنی جیب کی آخری دونی سے آنکڑا اٹھاتا ہے اور سبھاؤں میں شور جس کے لئے بڑھتا ہی جاتا ہے . . . . جسے اُس کے بچوں کی ماں ہونا ہے . . . . اس لئے وہ اس دھرتی کی طرح ڈری، سمٹی ہے جس میں کسان آتا ہے ـــ ہل کاندھے پر ڈالے ہوئے جس کا تیز اور نکیلا پھل ابھی ابھی کسی لوہار نے تیز آنچ والی بھٹی میں ڈھالا ہے . . . سر پر پگڑی باندھے، کلغی سجائے وہ راجہ جنک معلوم ہونے لگتا ہے جو دھرتی کو اٹھائے گا تو نہ جانے کب اس میں دبی ہوئی کوئی مٹکی پھوٹ جائے گی اور اس میں سے بڑی ہی صبر، بڑے ہی ایثار، بڑے ہی پیار والی، جنک دُلاری سیتا پیدا ہو گی . . .

جس کے لئے اس کا عظیم "وہ" آتا ہے۔ ایک ہاتھ میں مقدس کتاب، دوسرے میں شراب لئے . . . .

تاریخ کے دھندلے ادوار میں وہ ان گنت گڑیوں سے کھیلا ہے، ان کے ساتھ بے شمار راسیں رچائی ہیں اور اب، اس کی آنکھوں میں ڈر ہے اور محبت اور ہیبت۔ وہ سمجھتا ہے اس بار کی تر و تازہ حسین و جمیل دوشیزہ کے بدن پر قبضہ جمائے گا، بار بار اپنائے گا، بے ہوش ہو ہو جائے گا۔ اور نہیں جانتا وہ محض ایک تنکا ہے، زندگی کے بحرِ زخار میں۔ صرف ایک بہانا ہے تخلیق کے اس لامتناہی عمل کو ایک بار چھیڑ دینے، ایک بار حرکت میں لے آنے کا اور پھر بھول جانے کا . . . دنیا بھر کے گوداموں میں بھرا ہوا اناج کسی وقت

join eBooks Telegram

ایک دانہ محض تھا جو شاید اب اس دانے کو بھی معلوم نہیں کیونکہ موت اسے لوٹ چکی ہے، زندگی ایک بار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے .... کاش انسان کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ ایک بھوکے کی طرح عورت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ پھر عورت بھی خواہ مخواہ اپنی عصمت نہ بچائے، اس پر سونے چاندی کے ورق نہ لگائے ....

شادی کو کچھ ہی دن رہ گئے تو پتہ چلا گوتم نے سائیکلوں کی ایجنسی چھوڑ دی ہے اور آسام میں ڈبیا پور سے پچاس ساٹھ میل دور، کسی جنگل میں کوئی ٹھیکہ لے لیا ہے۔ جہاں مہینے ایک کے بعد کہیں چٹھی پہنچتی تھی جیسے ہوائی ڈاک، ریل گاڑی سے نہیں، پیدل چل کر جاتی ہو .... شادی ایک غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی ہو گئی۔

دادی کی تو جان ہی نکل گئی۔ اسے پسینے آنے لگے —— ٹھنڈے پسینے، جن کا باہر کی سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے جب بھی گوتم کی چٹھی آتی، دادی رتن نے منّی سوہی کو بلایا اور اس کا سر چوم لیا۔ بلایا اب کے بھی لیکن چومنے کی بجائے زور کا ایک دو ہتڑ اس کے سر پہ جڑ دیا —— یہ لڑکی ہی منحوس تھی، کسی منحوس گھڑی میں پیدا ہوئی، کوئی منحوس ماں باپ کے گھر جنم لیا۔ اور اب، جہاں بھی جائے گی۔ تباہی لائے گی .... دینا پور اور ڈبیا پور تو کیا پورے بہار، پورے بنگال، آسام، دیس میں تباہی اور بربادی لائے گی .... پھر گیتا کے پنے کھلے، پھر سترھویں ادھیائے کا پاٹھ ہوا، پھر دادی مری، پھر جی اٹھی کیونکہ پاٹھ کی سماپتی کے ساتھ ہی گوتم کی چٹھی مل آئی تھی جس میں لکھا تھا اگلے سال مئی کی بیس تاریخ کا ساہا نکلا ہے .... دادی سمجھ بیٹھی تھی، گوتم نے کہیں منّی کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور سوچ لیا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم منّی، بیٹھی ہوئی منّی کی کثافت نے گوتم کے پورے ذہن کا کچھ یوں احاطہ کر رکھا تھا کہ وہاں اب کسی اور لطیف سی سوچ اور سمجھ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ التوا تو ایک مجبوری تھا!

دادی ایک بار پھر مہینے اور دن گننے لگی جیسے بیوہ چھت کی کڑیاں اور رنڈوا آسمان کے تارے گنتا ہے۔ پھر ایکا ایکی انسان تو کیا وہ بھگوان، آگ، پانی، ہوا سب کو گالیاں دینے لگتی۔ اس میں صبر تو حد درجے کا تھا لیکن شکر نام کو نہیں ... جب تک منّی پانچ فٹ سوا دس انچ کی ہو چکی تھی۔ اس کی کہانی اس قصے کی طرح ہو گئی تھی جس میں قصہ کہنے والا اپنا سر بچانے کے لئے بادشاہ کو ایسی کہانی سناتا ہے جو ختم نہیں ہو سکتی —— سوراخ میں سے چڑیا آئی اور دانہ لے گئی۔ چڑیا پھر آئی اور ایک دانہ اور لے گئی .... اور کوٹھری دانوں سے بھری پڑی تھی، آسمان ستاروں سے پٹا ہوا تھا۔ نتّھا خیر میاں کے گھر کے پاس کمہار میں ہزاروں لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں .... معلوم ہوتا تھا کہ بیاہ اور صرف بیاہ ہی اس طولانی عمل کو روک سکتا ہے۔

join eBooks Telegram

ورنہ کوئی ہی دن میں مُنّی کا سراکاش میں ہوگا اور وہ اُوپر کی اُوپر چلی جائے گی جیسے کنس کے نیچے ڈ دینے سے مہامایا بجلی بن کر آسمان کی طرف لپک گئی تھی ــــــ

"جب تک تو گوتو بھی لمبا ہو چکا ہوگا" دادی کہتی

"کیا پتہ، متیا؟" جمنا کہتی۔ پھر ڈگامبروں کی بہو ترمیک بائی ایک قدم آگے بڑھ کر بول اٹھتی "ہو سکتا ہے اپنچ دو اپنچ چھوٹا بھی ہو گیا ہو" اور پھر وہ ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے ہوئے مسکرانے لگتیں۔

"ارے!" دادی ترمیک بائی کو پھٹکارتی "میں آتنا بھی نہیں سمجھتی، نپٹی!.... ایک بار جو بڑھ جائے، پھر نہیں گھٹتا" اور پھر ــــــ "میں بوڑھی جرور ہو گئی ہوں، ترمیکا! پر عقل میں تجھ پہ بیس ہوں، بیٹی"

پھر مُنّو کی ماں حساب کر کے بتاتی "اگر لڑکے کا قد آتنا ہی رہے، دادی! اور لڑکی کا چار پانچ گرہ ڈو تین انگل بڑھ جائے تو وہ آپی چھوٹا ہو گیا کہ نہیں ہو گیا؟"

آتنا حساب دادی کو کہاں آتا تھا۔ مُنّی سوہی کے ڈو تین انگل اور لمبی ہو جانے کے خیال ہی سے خون اس کے خشک چہرے کی رگوں اور ریشوں میں دوڑنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے پیپل سے گرا ہوا پتہ پھر اپنے ڈال پہ جا لگا ہے اور دوسرے پتوں سے ٹکرا رہا ہے، شور مچا رہا ہے۔ وہ ترمیکا کو یا مُنّو کی ماں کو گالیاں دینے لگتی ــــــ "چھوٹا ہو تیرا باپ، چھوٹا ہو تیرا بھائی، چھوٹا ہو تیرا خصم ــــــ" اور عورتیں یہ سمجھتی ہوئی کہ دیوی دیوی کی گالیوں سے گرہ ٹلے، ہنسی کھیلتی بڑے گھر چلی جاتیں جہاں انھیں اپنے مرد، کیا باپ اور کیا بھائی اور کیا شوہر انکا ایکی چھوٹے معلوم ہونے لگتے!

مُنّی سوہی اب تک اپنی ہر نس، اپنے ہر پور سے نفرت کرنے لگی تھی۔ وہ شادی بیاہ کے نام ہی سے خائف ہونے لگی۔ کیا شادی بیاہ ہی رہ گیا ہے، اس دنیا میں؟ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں؟ کہیں بھی جاتا ہو وہاں پہنچنے کے لئے بیسیوں سڑکیں، سیکڑوں پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ بیاہ کے لئے کیا ایک ہی جر نیلی سڑک ہے؟ آخر تھک ہار کر مُنّی لیٹ جاتی، سو جاتی جہاں اسے خواب میں دُھلے ہی دُھلے دکھائی دیتے ــــــ

ایک دن دیویندر انگریزی تصویر "مولاں روش" دیکھ آیا جس میں اداکار، جوزے فیرر اپنے پیر پیچھے باندھ کر فرانس کا بونا مصوّر لتیرگ (Lutrec) بنتا ہے۔ پہلے تو دیویندر نے ڈو ڈو کر ڈھیر گالیاں اپنے دلیش بھارت کو دیں جس میں اتنا زور لگانے پر بھی صنعتی ترقی نہیں ہوتی، جہاں سائیکل کے کچھ پرزے ابھی تک ولایت سے آتے ہیں۔ جہاں میک اپ کا آرٹ اتنا بھی نہیں پنپ سکا جس سے

join eBooks Telegram

لمبے قد کا ایک آدمی ٹھگنا اور بونا لگ سکے۔ اور اس بات کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ پہلے ہی ٹھگنا ہے۔ اس سے اور ٹھگنا نہیں ہو سکتا۔

اس پر بھی دیویندر نے جوڑے نیرا، کی طرح اپنے پیر پیچھے کی طرف باندھے اور گھٹنوں کے بل چل چل کر مُنّی کو دکھانے لگا — ایسے ہی پیر باندھ لینا، مُنّی! تب گوتم کے ساتھ ٹھیک سے پھیرے لے سکے گی —

"مگر رستے گھس گئی تو" مُنّی کی سہیلی گوراں پوچھتی

"تو چپ کرنا" دیویندر اسے ڈانٹ دیتا "مُنّی کا تو پھر بھی بیاہ ہو جائے گا، ڈاہی فنّی! — تیرا کبھی ہوگا ہی نہیں"

اور چھوٹے قد کی گوراں دیویندر کو دانت دکھاتے ہوئے " ای ای ای" کرتی اور پھر ایک طرف چھپ کر رونے لگتی۔ اور پھر آپ ہی اپنے آپ کو منا کر مُنّی کے پاس آ جاتی اور کہتی — "مُنّا! کہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اپنا کچھ قد مجھے دے دے اور میرا کچھ آپ لے لے —"

"ایسا ہو جائے تو پھر — دُنیا ہی نہ بس جائے" مُنّی جواب دیتی

— اور پھر دونوں مل کر اس اُجڑی ہوئی دُنیا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگتیں جہاں ابھی تک دیویندر، اپنی ہیکڑ میں گھٹنوں کے بل چل چل کر مُنّی کو دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا — "ایسے، ایسے .... کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا!" اپنے اپنے طریقے سے وہ اس لمبی لڑکی کو وہی بات سمجھا رہا تھا جو آج سے صدیوں پہلے ارسطو نے عورت کے نیچے گھوڑا بنتے ہوئے سکندر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن پوری طرح سے سمجھا نہ پایا تھا ... اس ادھورے کام کو دیویندر پورا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے اذیت ہو رہی تھی لیکن کرب کا کوئی بھی اثر وہ اپنے چہرے پر نہ آنے دیتا۔ خاصی دیر تک وہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے گھٹنے چھل گئے .... ترمیکا اور جمنا اس کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور پکار رہی تھیں — "شیلا — اری او شیلا ...."

آخر ایک دن برات آ ہی گئی، پھیرے بھی ہو ہی گئے۔

پھیروں میں مُنّی دوہری، تہری ہو کر چل رہی تھی لیکن اب اس بات کا کیا علاج کہ اتنے نیچی ہوتے ہوئے بھی وہ گوتم سے لمبی لگ رہی تھی۔ ترمیکا کا خیال صحیح تھا۔ گوتم کا قد اور بھی چھوٹا ہو گیا تھا اور رہا — مُنّی کا بڑا۔ پل پل کے بعد، پھیرے لیتی ہوئی مُنّی کے کان میں کوئی کہہ دیتا — "نیچی، اور نیچی" ... مُنّی نے دھرتی میں گھس جانے کی کوشش کی لیکن دھرتی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ آسمان کی طرف لپک سکتی تھی، دھرتی میں نہ

join eBooks Telegram

سماسکتی

آشیرواد کی جگہ کئی بار دادی کے گُپ چُپ دہیچے مُنّی کے سر پہ پڑے، جس سے اسے کا سر بول اُٹھا۔ وہ تو اسے اپنی آخری مصیبت سمجھی تھی لیکن دادی کا خیال ایسا نہ تھا۔ جو جھوٹ اس نے اور اس کے بیٹے، پوتے اور تیلی محلے کے سب مرد عورتوں نے مل کر بولا تھا، آخر تو اسے کھلنا تھا۔ دادی چاہتی تھی کھلنے تو کھلے پر ابھی نہ کھلے . . . . ایک بار شادی ہو جائے، پھر اسے انسان تو کیا بھگوان بھی نہ توڑ سکیں گے لیکن . . . . آخر وہ پھر مُنّی کو اُدیجا ہو کر چلتی ہوئی دیکھتی تو اپنے کیجے میں سکا مارتے ہوئے کہتی ـــــ " ہائے رانڈ، تو مرے گی !"

پنڈت لوگ منتر پڑھتے رہے، جن کا مطلب تھا . . . . تم جانوروں کی طرح سے نہیں رہو گے . . . بے موسم کا بھوگ بلاس نہیں کرو گے . . . . تم بیمار اور فاتر العقل بچے اس دنیا میں نہیں لاؤ گے . . . اور ارد گرد کے لوگ بیمار اور فاتر العقل بچوں ہی کی طرح سے بیاہ کی رسم کو دیکھ رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ شلوکوں کی زبان، سنسکرت سے واقف نہ تھے ! . . . . .

بیاہ ہو جانے کے بعد جب بھی گوتم اندر، ڈیوٹی بھون کی بیٹھک میں آیا، اس نے مُنّی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ مُنّی کو اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کی سخت مناہی تھی۔ جس سے اس کے بدن کی ہڈیاں تک اکڑ گئیں۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوئی، ابھی تک ماں کی کوکھ میں پڑی ہے . . . . اور باہر آنے، ہاتھ پیر پھیلانے کے لئے تڑپ رہی ہے

سُوکھم منی نے گوتم کو نیا داماد اور مُنّی کو اپنی بیٹی جانتے ہوئے اپنے گھر کھانے پر بلایا لیکن دیویندر نے اسے سمجھا بجھا کر لوٹا دیا۔ شام کے قریب گوتم نے سنیما دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جانا، کوئی موج اُڑانا چاہتا تھا لیکن دادی نے انکار کر دیا۔ وہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن اپنے بیٹے جگن ناتھ کو اشارہ کر دیا جس نے بڑے پیار کے ساتھ گوتم سے کہا . . . . " یہاں نہیں بیٹا . . . . ہم تیاگی ذرا پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ تو اسے گھر لے جانا، پھر جو جی چاہے کرنا "

اور گوتم خاموش ہو گیا،

اگلی سویر کو گوتم کا باپ، گوتم اور برات میں آئے ہوئے سب آدمی ڈیمانپور جانے کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔ پہلے کلکتہ جانا تھا۔ اس میں بھی ریت تھی کیونکہ بھائی ہونے کے ناطے دیویندر ہی کو مُنّی کو ڈولی میں ڈالنا تھا . . . . کسی کتاب میں لکھا ہے کہ مرد کو شادی اس وقت کرنی چاہئے جب وہ عورت کو، اپنے پٹھوں کے زور سے، ایک ہی ہاتھ سے اُٹھا سکتا ہو۔ دیویندر شادی شدہ آدمی تھا لیکن اس سے

join eBooks Telegram

کنواری بہن کو اٹھایا نہ گیا۔ منّی یوں اس سے لپٹی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی کہ اس کے اٹھائے ہونے کا گمان ہو جاتا کہ وہ بیچ بیچ میں چلتی جا رہی تھی۔ منّی نے ایک ہی مٹھی چاولوں کی سر کے اوپر سے پھینکی۔ لیکن، دادی جو تھی۔۔۔ جس نے پوری بوری خالی کر دی۔ پھر ڈولی اٹھی، سسر نے ڈولی کے اوپر سے نئے پیسوں کی چھوٹ کی چونکہ وہ خود جا کر بینک سے دس روپے کے نئے نئے پیسے لایا تھا، اس لئے وہ ڈولی پر سے گرتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور بیچ بیچ کی چھوٹی چھوٹی تہریں معلوم ہو رہے تھے۔۔۔۔ گلی بازار کے بچے پیسے اٹھانے، ڈولی کی راہ روکنے لگے —— دادی رو رہی تھی اور بچوں سے کہہ بھی رہی تھی —— "بچو، قسمت دو۔۔ جانے دو، ارے ڈولی کو تو جانے دو" جیسے ڈولی اب بھی واپس آ سکتی تھی۔

دادی کے اشارے پر دیویندر بچوں کو مار مار کر راستے سے ہٹانے لگا۔ ایک چھوٹ اور جھوٹ اور لڑتے ہوئے پیسے سامنے زمین پر گرے۔ دیویندر کے من کا بچہ ابھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی لپکے اور چمکتے دمکتے ہوئے پیسے اٹھالے اور ان پیسوں کو لگی ہوئی مٹی اور دھول سے پیار رکھ کے جیب میں ڈال لے۔ لیکن —— اندر ہی اندر وہ مسکرا دیا!

شیلا حسبِ معمول جھوٹ موٹ کے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں سے پیچھے تو گنگا، گلو کی ماں، جمنا اور تزمیکا کے آنسو تھے۔ جو اپنے اپنے من میں اچھوڑے ہوئے یا چھوڑے جانے والے بھائیوں اور باپوں کو دیکھ رہی تھیں —— پھر بہنوں کو، بھابیوں کو۔ جیسے سسرال کے سب رشتے جھوٹے ہوں۔ کیا نندیں اور کیا ساسیں اور کیا سسرے۔۔۔۔ شادی کے وقت وہ سب کیسے لپک لپک کر ذہن میں آ رہے تھے۔۔۔

شیلا کو اندر ایک بہت ہی تسکین، ایک بہت بڑی جیت کا احساس ہوا۔ جبھی اس کی نظر دادی پر پڑی جو تھڑے پر کھڑی اپنی دھندلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈولی کو دور ہی دور نگاہوں سے دور، دل سے دور بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادی کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر تیور آ گئے۔ اور اس نے کہا —— "یہ دوسری ڈولی نہ جانے کب اٹھے گی —— ؟"

دیویندر نے دادی کی طرف دیکھا نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بولا —— "ماں!" اور پھر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر رونے لگا۔ دادی نے چھاتی میں چھپا لیا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ دیویندر نے دادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور کسی ڈولی کی طرف لے کر چل نکلا۔۔۔۔

منّی کیا گئی کہ شیام گلی اور تیلی محلّے کی رونق بھی ساتھ ہی لیتی گئی۔ ہر چھوٹا بڑا پوچھتا تھا ——

join eBooks Telegram

مُنّی کی کوئی چِٹھی آئی ہے یا نہیں۔ اور ہمیشہ جواب مِلتا ــــــ آئی تو نہیں، پر آجائے گی بیٹی، دو مہینے کے بعد تو وہاں چِٹھی پہنچتی ہے۔

لیکن دادی رتّن بھیّا سے ڈری ہوئی تھی ــــــ وہاں ضرور جھگڑے ہوگئے ہوں گے۔ ضرور انہوں نے میری مُنّی کو گھر سے نکال دیا ہوگا اور وہ کہیں جنگلوں میں خاک چھانتی پھر رہی ہو گی۔ ان جنگلوں میں جہاں سانپ سانپ جتنی بڑی جونکیں ہوتی ہیں پیروں سے چمٹ جاتی ہیں۔ اور ہولے ہولے یوں خون چوستی ہیں کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ یونہی جیسے تھک کر آرام کرنے کے لئے بیٹھتا ہے تو پھر نہیں اُٹھتا.. ضرور مُنّی کو کوئی شیر چیتا کھا گیا ہوگا۔ ورنہ مہینوں سے چِٹھی نہ لکھنے کا کیا مطلب؟ اور پھر بیچ میں ایک آدھ چِٹھی آ ہی جاتی جسے دادی پہلے دیویندر سے پڑھواتی۔ پھر شاہد میاں اور پھر سو کمپوڈ کا نمبر ہے.... تب کہیں جا کے اس کی تسلّی ہوتی۔ تسلّی کہاں؟ اگر مُنّی لمبا خط لکھتی تو دادی کو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی رو رہی ہے، الفاظ جن کا ساتھ نہیں دیتے۔ اگر چھوٹی لکھتی تو کہتی ــــ دیکھا نا! میں تو پہلے ہی کہتی تھی، اسے کوئی منہ نہیں لگائے گا۔ کوئی ایسی بات ہے جو مُنّی چھپا رہی ہے۔ ورنہ مجھے ایسے دو اکھر لکھ کے بھیج دیتی؟ ــــ یہی ہے نا، اپنے دیش کی بیٹیوں کا۔ مری مر جاتی ہیں۔ پر شکایت کا لفظ بھی منہ پہ نہیں لاتیں.... ہے رام! اب کیا ہوگا؟ کہیں میں اُڑ کر ڈیما پور چلی جاؤں۔ ایک بار میں اپنی سوہی کو ہنستے ہنستے ہوئے دیکھ لوں۔ تم سب جھوٹ کہتے ہو۔ ضرور وہاں کوئی گڑ بڑ ہے۔ پر میری بیٹی کو جس نے تنگ کیا، بھگوان اس کا بھی بھلا نہیں کرے گا.... میں مرنا چاہتی تھی۔ ہاں، اب اس دنیا میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مجھے مرنے، آرام سے جانے بھی نہیں دیتی۔ ہے بھگوان! انسان دنیا میں جس کو ہمیں سمجھتا ہے، وہ کتنا بڑا دشمن ہوتا ہے....

اور پھر ــــــ یہ ہو کیسے سکتا ہے۔ چھ فٹ کی لڑکی سے کوئی پانچ فٹ کا لڑکا بیاہ کرے اور پھر اُسے بسا بھی لے.... اب تک تو گوتو کو پتہ بھی چل گیا ہوگا۔ اور دادی یوں بات کرتی جیسے شاید نہ بھی پتہ چلا ہو۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور من ہی من میں کئی پرارتھنائیں کرتی۔ ہے بھگوان! کیا یہ نہیں ہو سکتا جب گوتو مُنّی کی طرف دیکھے تو وہ اُسے چھوٹی لگے.....

ایک دن جگن ناتھ گھر میں آیا تو کچھ دیر سے.... شاید محلے تک شاستر ارتھ ہوتے رہے۔ گھر پہنچے پر شیلا سو رہی تھی۔ جگن ناتھ چپکے دبکے رسوئی میں گیا تا کہ بہو کو جگانا نہ پڑے۔ اُنہوں نے اُوپر نیچے ہاتھ مارے، سر بھی چھینکے سے ٹکرا کر لہولہان کیا لیکن کہیں کھانا ہوتا تو ملتا۔ اس بات کا علم نہ دادی کو ہوا اور نہ دیویندر کو۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ شیلا نے حسبِ معمول کھانا پکایا ہوگا اور طاق میں رکھ دیا ہوگا ــــــ طاق میں پانی کا ایک گلاس پڑا تھا جو جگن ناتھ کا ہاتھ لگنے سے گرنے لگا۔ لیکن جگن ناتھ نے

join eBooks Telegram

سنبھال لیا۔ اور وہ سمجھ گیا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بولا ——" تیرا شکر ہے، مالک!"

اور پھر وہ اندر جا کر لیٹ گیا۔ پانی اس کے کلیجے کو لگ گیا تھا۔ اتفاق کی بات۔ جگن ناتھ نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوکے پیٹ ہی وہ شاستر ارتھ کرتا رہا۔ حالانکہ شاستروں ہی نے شریر کو دھرم سند قرار دیکر اس کی رکھشا مانس کا پرم دھرم لکھا ہے۔ ... در اصل جگن ناتھ تیاگی اُداس ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی چیز اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ لا سکتی تھی۔ اپنی سمجھ میں وہ بھگوان کی پرستش کر رہا تھا لیکن بھگوان تو سمجھتے رہتے کہ وہ انسان کی پوجا کر رہا ہے ... اپنی مرحوم بیوی کی، جسے محبت اور صرف محبت کی وجہ سے وہ پٹیا کرتا تھا لیکن اس پر بھی بھگوان نے جگن ناتھ کی حاضری لگالی۔ بھگوان جانتے تھے نا کہ اُن تک پہنچنے کے لئے جس بُت کی پوجا کی جاتی ہے، وہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ صرف مجھ تک پہنچنے کا ایک بہانہ ہے۔

پیٹ میں درد ہونے کے باوجود جگن ناتھ دھیان میں بیٹھ گئے۔ جیجی دادی کی آواز آئی ——"بیٹا!"

جگن ناتھ نے اندھیرے ہی میں منہ آواز کی طرف کر دیا اور بولا" ہاں ماں"

"بیٹا! کھانا کھا لیا؟"

"ہاں ماں —— بہت کھا لیا ... اب نیند نہیں آتی"

"کوئی چورن بھی لاؤں، بہو کو جگاؤں؟"

"نہیں ماں —— میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔"

اور جگن ناتھ ایسے ہی سو گیا۔ وہ ایسی سمادھی میں گیا، جس سے پھر نہ اُٹھا

سویرے بہت شور مچا۔ شیلا تو جانتی تھی کہ اس نے جاتے سمے سسر جی کو کھانا بھی نہیں کھلایا۔ اس لئے وہ سب سے زیادہ اونچی آواز میں بین کر رہی تھی۔ اور بار بار اپنے مرے ہوئے سسر کے پیروں پر سر پٹخ رہی تھی۔ در حقیقت اس بات کا علم شیلا کو بھی نہ تھا کہ اس کے پتی دیو کے پتا اتنی سی بات پر اتنے خفا ہو جائیں گے۔ چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا دیں گے۔ وہ ہر گز یہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں آیا ہوا پنشن کا پیسہ بند ہو جائے۔ پتہ نہیں بھگوان نے کس کی کرنی کی سزا کس کو دی۔ اس کی رمز یں وہی جانے ...

شیلا جسے اس دنیا سے بھیجنا چاہتی تھی وہ تو جی رہی تھی ——

دادی کی وہی حالت ہوئی جو ماں کی ہو سکتی ہے۔ جب جگن ناتھ تیاگی کو لے جانے لگے۔ ارتھی اٹھائی گئی۔ تو دادی یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئی

"ارے تجھے شرم نہ آئی جگنا۔ میں بوڑھی تیرے کاندھے پر سوار ہو کر جاتی۔ تو جوان ہو کر میرے

join eBooks Telegram

کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا ہے۔"

گلی کا ایک آدمی جو بچھ رہا تھا، شاہد سے بولا ——

"کیا فقرہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی فلم میں لکھ دے تو لوگ رو رو کر پاگل ہو جائیں"

شاہد نے ایک تیکھی نظر سے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "کیسے لکھ دیں، بھائی ۔ ۔ ۔ ۔
اس فقرے کو لکھنے کے لئے بیٹا دینا پڑتا ہے"

شیلا تو سمجھتی ہوگی، سسر تو گئے، اب دادی ۔۔ نہ بچ سکے گی۔ دادی کئی دن سکتے میں رہی۔ دیویندر گھر سے نہ گیا۔ اسے دکھانے کے لئے تو شیلا کو بڑھیا کی دیکھ ریکھ کرنا ہی پڑتی تھی۔ پہلے تو شیلا نے پاٹھ کرنے کی پرواہ کی۔ لیکن جب اس نے دادی کا زندہ مردہ گلے پڑتے دیکھا تو پاٹھ بھی کیا لیکن دادی پھر وہیں کی وہیں تھی۔ شاید وہ اس منزل پر تھی، جہاں گیتا کے پاٹھ بھی اثر نہیں کرتے۔

جب ہوش میں آتے ہی جو پہلا سوال دادی نے کیا، وہ تھا —— "مُنّی کی چٹھی آئی ہے ؟"

دیویندر نے دادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پچکارتے ہوئے کہا "نہیں دادی، آجائے گی، تو کیوں فکر کرتی ہے ؟"

واقعی ویسی ہوا۔ پتا کے مرنے کی خبر منی سوہی کو کہیں ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد ملی۔ جبکہ وہ سنکار تو ایک طرف۔ ہڈیاں بھی گنگا میں بہائی جا چکی تھیں شاید اسی لئے، ایسی بھاگ کر کلے کوسوں سے دنیا پور آنا اور آسام کی جونکیں لانا، بیکار کی بات تھی۔ اور جب باپ کی موت کے بعد، مہینوں بعد تک بھی مُنّی نہ آئی تو دادی نے ہنکارتے ہوئے کہا —— رے اُمّتی ہو تو آئے ۔ ۔ ۔ ۔"جیسے دیسی کسی نے مُنّی کا گلا گھونٹ ڈالا ۔ ۔ ۔ دادی کو دل کی اندرون ترین گہرائیوں سے اس بات کا یقین تھا کہ مُنّی اور گوتم کی اٹل، بے جوڑ شادی کبھی نبھ ہی نہیں سکتی۔ مُنّی ابھی لوٹ کے آئی کہ آئی۔ روتی، چلاتی سر پٹختی ہوئی ۔ ۔ ۔

برسات ہو کے ہٹی تھی۔ سورج کی گرمی کے راستے میں ایک بھی تو خاکی ذرّہ حائل نہ ہوتا تھا۔ کرنیں زمین کھود کھود کر اس میں سے کھمبیں نکال رہی تھیں۔ کچنار کا پیڑ تو سامنے مکان کے سائے میں تھا اس لئے اس پہ گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ برسات کی پہلی ریزش اور آخری ریزش بھی پیڑ پر لگے ہوئے پھولوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اُلٹا اس نے کلیوں کے مُنہ بھی کھول دیئے اور اب پورا کچنار ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ڈال سامنے کھتریوں کے مکان کی کھڑکی میں جا گھسی تھی جہاں لال شنیل کا سوٹ پہنے کھتریوں کی بہو کھڑی تھی، جسے چند ہی دن پہلے وہ لکھنؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔ لال لال کیڑے، مخملیں سوٹ پہنے ہوئے وہ بیر بہوٹی معلوم ہو رہی تھی جو برسات اور اس کے بعد کے تڑاکے میں سے کبھی اپنے آپ نکل آتی ہیں۔

join eBooks Telegram

شاہدہ کی بہن، فردوس ممی کی شادی پہ تو نہ آسکی تھی۔ اب آئی تو مُنّی کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اس نے سب کا جینا حرام کر دیا۔ فردوس دادی رتن کے پاس بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی کہ گوراں بھاگی آئی۔

"دادی .... دادی" وہ بولی "مُنّی آگئی!"

شیام لگی پوری کی پوری اُلٹ پڑی اور مُنّی کو لینے کے لئے آگے بڑھی۔ مُنّی تانگے پر سے اُتری اور گوتم کے ساتھ ڈپٹی بھون کی طرف آنے لگی۔ اب وہ چھ فٹ کی تھی اور اس کے ساتھ اس کا پتی گوتم جو پچ مچ، ترمیکا اور گلّو کی ماں کے کہنے کے مطابق پہلے سے بھی ٹھگنا اور بونا معلوم ہو رہا تھا.... وہ دونوں آ رہے تھے.... ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر کسی بھی احساسِ ذات سے عاری۔ جبھی مُنّی اپنے گھر کے پاس پہنچی تو دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پہ پڑا

"نیچی ہو لئی ___ نچی"

اور مُنّی نے بلبلا کر دیکھا ___ دادی تمرتے پر کھڑی تھی اور اس کا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ مُنّی نے ایکا ایکی چلّاتے ہوئے کہا ___ "دادی ی ی ی ی" اور اس سے لپٹ گئی اور بھینچتے ہوئے بولی ___ "باپو کہاں۔ بھیجد یئے دادی؟"

دادی نے جگن ناتھ کے بارے میں کچھ نہ سنا۔ بولی "گوتم آیا ہے؟"

جبھی گوتم نے آکر دادی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

دادی رتن نے منہ قریب کر کے، آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور بولی ___ "جیتے رہو، جیتے رہو بیٹا، پرماتما ___" اور پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی "آؤ.... آؤ، میں واری، آؤ...."

ماتم تو کچھ ہی دیر میں ختم ہو گیا ___ دراصل ماتم بھی اُدراس ہو گیا تھا اور اب ڈپٹی بھون میں قہقہے لگ رہے تھے۔ صرف شیلا تھی جسے سسر کی موت کے بعد اتنی جلدی ہنسنا اچھا نہ لگتا تھا،

دادی نے دیکھا، مُنّی خوش، بہت خوش ہو رہی تھی۔ گوتم، اس کی ماں، اس کے باپ ہاتھوں سے چھاؤں کیا کرتے تھے۔ ہاں، چھاؤں کرنے کے لئے انہیں سیڑھی ضرور لگانا پڑتی تھی۔ دادی کو یہ بھی پتہ چلا مُنّو کو ساتواں مہینہ ہے۔

گوتم جتنے دن بھی رہا۔ بہت خوش، بہت ہنستا رہا۔ وہ دادی کے ساتھ مذاق کرتا رہا اور دادی اس کے ساتھ نہ لمبے ہونے کی بات سامنے آئی، نہ چھوٹے ہونے کی.... اور پھر وہ مُنّی کو زچگی کے لئے مائیکے چھوڑ کر، دادی ماں کے پیر چھوتا ہوا چلا گیا۔

join eBooks Telegram

دادی کی بیماری لوٹ آئی۔ اب وہ خوشی کے مارے مررہی تھی۔ ایک تسکین، ایک تکمیل کے احساس کے ساتھ جارہی تھی۔ ایک دن رات کے دو بجے کھانسی جو آئی تو کتنی دیر تک دم ہی واپس نہ آیا۔ شیلا اور منی پھر دوڑے۔ شیلا تو اب ان سب باتوں کو بے کار سمجھتی تھی لیکن منی سوہی کا بھگوان پر پورا وشواس تھا اس نے گوراں کی مدد سے دادی کو نیچے فرش پر اُتارا اور اس کے کان کے پاس منہ کر کے بڑی شردھا کے ساتھ نہ صرف گیتا کا ستر ھواں ادھیائے بلکہ مہاتم بھی پڑھا۔ اور اس کا پورا پھل دادی کے نام دیا۔ لیکن دادی ابھی تک جی رہی تھی .... اس کے چہرے پر ایک عجیب تبسم کی نورانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر بچوں کی سی شرارت چلی آئی۔ اس نے مرگھلے سے انداز میں دائیں اور دیکھا جس طرف منی بیٹھی تھی جو گیتا کو تپائی پر رکھتے ہوئے، بڑے غور سے دادی کی سبک سی پرواز دیکھ رہی تھی ــــ

"منی" دادی نے بجھت سی آواز میں کہا

"ہاں دادی ماں" منی بولی اور دادی کے منہ کے پاس کان کر دیا

دادی نے کچھ کہا۔ منی ایک دم شرمائی اور پیچھے ہٹ گئی۔ شیلا پاس کھڑی تھی۔ بائیں طرف گوراں ــــ

"کیا پوچھا دادی نے؟" گوراں بولی

"کچھ نہیں" منی نے کہا اور پھر اور بھی شرما گئی۔ رنگ لال ہو گیا۔

گوراں نے ضد پکڑ لی تو منی بولی "کہہ رہی تھی ــــ ہائے ری منو! .... وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہوگا؟"

اور پھر سب نے مڑ کر دیکھا، دادی رتن جیسے پہلے مسکرا رہی تھی، ویسے ہی اب بھی مسکرا رہی ہے ....

اس کے بعد دانا دری میں ہوا کا تو ریل ہو گیا اور تپائی پر پڑی ہوئی گیتا کے پنے اُڑنے لگے اور اڑتے اڑتے وہاں آکر رک گئے جہاں شبد سماپت لکھا ہوتا ہے!

(ہندوستان و پاکستان میں نقل و اشاعت کے جملہ حقوق بحق ماہنامہ سوغات محفوظ ہیں)

راجندر سنگھ بیدی

جوگیا

نہادھو کر، نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے، جوگیا روز کی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور میں اپنے ہال سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ ایسے میں دروازہ کو ہاتھ جو لگا تو "چوں" کی ایک بے سری آواز پیدا ہوئی۔ بڑے بھیا جو کہیں پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے، مڑ کر بولے۔

"کیا ہے جبل؟"

"کچھ نہیں موٹے بھیا" میں نے انھیں ٹالتے ہوئے کہا۔ "گرمی بہت ہے"

اور میں پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ساری کے سلسلے میں جوگیا آج کون سا رنگ چنتی ہے؟ — میں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا۔ رنگ میرے حواس پر چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں بھی کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالبا دیوی کی دادی شیٹ اگیاری لین میں تھا۔ پارسیوں کی اگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پر تھی۔ یہاں پر صرف مکان تھے۔ ایک کے سامنے، اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ ان مکانوں کی ہم آغوشیاں کہیں تو ماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی، ملائم، ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ — سینہ بہ سینہ لب بہ لب، غلیظ اور — مقدس۔

سامنے پانچو گھر کی ہر قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا۔ ابھی بجید کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنا ہی ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ ڈنکر بھائی نے احمد آباد سے گھی اور تیل کے دو پیپے منگوائے ہیں اور پنجابن سب کی نظر بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک کر چلی ہے۔ جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب نظر آتا تھا ایسے ہی انہیں بھی ہمارا سب کچھ ہی نظر آتا ہو گا۔ جوگیا کے گھر کا نام تو رنچھوڑ نواس تھا لیکن ہم لوگ اسے پانچو گھر کہتے تھے کیونکہ اس مکان میں اس سے کہتا ہوں پانچو

join eBooks Telegram

میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوٹی ہوئی عورتیں رہتی تھیں جن میں ایک جوگیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی جس سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی اس کی تعلیم بھی مکمل کرے۔

جوگیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا لیکن بدن کے بھرے ہوئے اور گٹھے ہونے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ جوگیا دال، رنگنا اور ہفتے میں ایک آدھ بار شری کھنڈ سے اتنی تندرست ہو سکتی تھی۔ بہر حال ان لڑکیوں کا کچھ مت کہیئے۔ جو بھی کھاتی ہیں الم غلم ان کے بدن کو لگتا ہے اور بعض وقت تو غلط حصوں کو لگتا ہے جنھیں میں تو صحیح حصے کہتا ہوں کیونکہ عورت کے جسم میں پتلے پتلے، پیلے پیلے خطوط کی بہ نسبت، مجھے گہرے گہرے اور بھرپور خط اچھے لگتے ہیں۔ جوگیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رخ کی طرح چوڑا تھا جس میں قندیلوں جیسی آنکھیں، رات کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں۔ مورتی میں ناک اور ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹکے ہوئے تھے۔ سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمائش کرتے تھے جنھیں وہ کبھی ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی کے بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر کھیلتی رہتی ہیں۔ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تارامنڈل تھا جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔ جوگیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت اور کیا کرنا ہے یہ جانتی تھی اور اسکے اس جاننے میں اس، کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ گڑبڑ تھی تو صرف رنگ کی کیونکہ جوگیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گورا تھا جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی کی چیزیں اتنی متناسب نہ ہوتیں تو بس، چھٹی ہو گئی ہوتی۔

میں نہیں جانتا کہ محبت کس چڑیا کا نام ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر کوئی دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جوگیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی۔ جوگیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی۔ عجیب سہیلی پنا تھا کیونکہ ہیما صرف سات سال کی تھی اور جوگیا اٹھارہ برس کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جوگیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے اس لئے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جوگیا سب کو سبق دیجاتی تھی۔ میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا۔ ایسی رکھ رکھاؤ کی باتوں کا قائل نہ تھا۔ لیکن میری مجبوریاں تھیں۔ میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس

join eBooks Telegram

بات کا بھی خیال آتا تھا کہ اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے لڑکیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، بنا کسی التہاب کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں، خاک لطف اٹھاتے ہیں؟ اتفاقاً محبوب کے بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہوگی۔ شاید ان کو کوئی ایسا لطف ملتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو۔ لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور ادھر ادھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا ہوگا۔

یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جوگیا کے پنڈے کو لگ گیا ہوگا۔ ایک بار، صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے جوگیا کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے۔ ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور منہ میں ژند اوستا پڑھتا رہتا تھا۔ وہ، صرف وہ ہمارے سروکش کو سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اُسے ضرور "صاحب جی" کہتے اور پھر اس راستے پر چل پڑتے جو دنیا کے لہو ولعب، میٹرو سینما کی طرف جاتا تھا جہاں پہنچ کر جوگیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے اسکول کی طرف۔ راستے بھر ہم غیر متعلق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور پھر اس بات پر کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارہ نہیں۔ ایک دن جہانگیر آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی اس بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔ صرف میں اور جوگیا پہنچے تھے اور وہ بھی تصویریں دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے، محسوس کرنے کیلئے پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے۔ جن میں ایک سجگ کے نام کی ایک بڑی سی تصویر تھی جس میں اوپر کے حصے پر برش سے گہرے سُرخ رنگ کو موٹے موٹے اور بھدّے طریقے سے تھوپا اور پچارا گیا تھا جس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا۔ اس تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا جس پر جوگیا کسی اندرونی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔ اس کی سانس قدرے تیز تھی اور میں جانتا تھا محبت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سینکڑوں فرسنگ ہوتا ہے۔ ۔ ۔ اور آدمی چلنے سے پہلے تھک جاتا ہے۔

آرٹسٹ ندھال سا ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ دیکھنے کوئی آتا مرتا ہے یا نہیں۔ اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا۔

جبھی ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھر دیا تھا۔

اس دن میں نے جوگیا سے سب کہہ دینا چاہا۔ ہم دونوں ہی پیار کی ہیرا پھیریوں سے تنگ آچکے تھے۔ چنانچہ

join eBooks Telegram

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، ٹھٹھکا اور پھر اسٹول کے پاس، جوگیا کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا تو بس اتنا۔

"جوگیا! میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں؟"

"سامنے آکے سناؤ۔" جوگیا بولی

میں نے کہا "لطیفہ ہی ایسا ہے۔"

میری طرف دیکھے بغیر ہی اُسے میرے تیس بیس کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچھے، اس کے کانوں کی لووں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ آخر میں نے لطیفہ شروع کیا۔

"ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا"

"ہوں" جوگیا کے سنبھلنے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا۔"

اس پر جوگیا نے تین چوتھائی میں میری طرف دیکھا "تم لطیفہ سنا رہے ہو؟"

"ہاں" میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

اور جوگیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ــــ منتظر۔۔۔ ایک ایسا انتظار جو بہت ہی لمبا ہو گیا تھا جس میں لمحات کے شرارے، کسی بارود سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہے تھے۔ خلا میں پھٹ رہے تھے اور آخر معدومیت کا حصہ ہوتے جا رہے تھے۔ جبھی جوہو میں ایک ٹینٹ میں لال رنگ کے پیچھے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈولتی ہوئی کشتی پر پڑی اور میں نے کہا۔ "وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آ گئی۔ آخر اس نے سوچا اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں کیوں نہ میں اسے ایسا موقعہ دوں، شاید۔۔۔ چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلا لیا۔ لڑکا آیا بھی، گلدستہ بھی لایا جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا ــــ ہے کتنا پیارا ہے، یہ اودے ہیں گلابی، گلابی میں سبز رنگ کے پھول۔۔۔ ان کے بدلے میں تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے۔"

"پھر؟" جوگیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"پھر ــــ لڑکی نے اپنا منہ تھوڑا آگے کر دیا، مگر۔۔۔ وہ لڑکا باہر جا رہا تھا، دروازے کی طرف"

"ہائے بھگوان" اور جوگیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لڑکی بولی۔ کہاں جا رہے ہو لالی!۔۔۔

لالی نے دروازے کے پاس مڑتے ہوئے کہا۔ "اور پھول لینے۔۔۔"

اس سے پہلے کہ جوگیا ہنستی اور اس کا انتظار ابدیت پر چھا جاتا، میں نے پیچھے سے اس کے دونوں بازو جکڑ کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔ اب جوگیا بناوٹی غصے سے مجھے ہلکے ہلکے تھپڑ لگا رہی تھی اور اپنے ہونٹ پونچھ رہی تھی۔ وہ ہنس

join eBooks Telegram

نہ سکتی کیونکہ وہ ناراض بھی تھی اور خوش بھی۔ محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایکا ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں نے ہرا بھرا کر دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس دن اگر ہم جوشیلے، گہرے سُرخ رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا منہ نہ چوم سکتا تھا۔ اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خرید لی جس کا نام تھا "کوئی کسی کا نہیں"۔ اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیئے رو رہی تھی۔ سب رنگوں میں اداسی تھی اور وہ ایسے وقت میں اداسی کے رنگ خرید رہا تھا جبکہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے۔ جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی۔ جوگیا ایک عظیم تشنگی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی، جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا، ملّا دکھایا، مسکرائی اور دوڑ گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کچھ دیر یونہی اِدھر اُدھر رنگ اچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا۔ دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، سفید، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں کسی کو خیال بھی نہیں آیا ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی صحیح تعریف میں نہیں آتا اور جسے اجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ میرا گلا تشکر کے احساس سے رندھا ہوا تھا — میں کس کا شکریہ ادا کر رہا تھا! ۔ ۔ ۔ اس ایک لمس سے جوگیا ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی تھی۔ میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی، کسی کے ساتھ سو بھی جاتی، جب بھی وہ میری تھی۔ ایسا مَن جس میں سچائی ہو، ولولہ ہو، بدنصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے!

تو گویا میں اس دن دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساری جوگیا اپنی الماری میں سے نکالتی ہے۔ اگر وہ مجھے میرے ہاں کے دروازے کے پیچھے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی — آج کونسی ساری پہنوں اور اس میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں تو جاننا چاہتا تھا، بجھ سویرے، نہا دھو کر جب کوئی سندری اپنی ساریوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس میں کونسی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے — آج گلابی رنگ کی ساری پہننی چاہیئے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پُراسرار ہے، اور پُرپیچ۔ اتنا بھید، اتنا رہسیہ کہ مرد اس کی تھاہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ سُنا ہے چاند نہ صرف عورت کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی نہیں۔ وہ تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ جبھی۔ ۔ ۔ ۔ جبھی ساری پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے — آج کونسی ساری پہنوں؟

نہیں، نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس کا اپنا رنگ ہے، اپنا فیصلہ۔ ہر کسی کو کوئی مرد تھوڑا ہی بتلانے جاتا ہے؟ پھر رات کا بھی تو ایک رنگ ہوتا ہے، اس کا اپنا رنگ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

join eBooks Telegram

اس دن واقعی بہت گرمی تھی۔ نیچے دادی شیٹ اگیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا موسم کی بھٹیارن دانے بھون رہی ہے۔ کبھی کوئی پنجابی یا مارواڑی پڑھا پگڑ باندھے آتا تو اوپر سے بالکل مکئی کا دانہ معلوم ہوتا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔۔۔۔

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیئے۔ وہ سب ساڑیاں تھیں جن میں سے ایک جوگیا اپنے لئے، میرے لئے، ساری دنیا کے لئے چُن رہی تھی۔ یوں ہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن میں نے تو کسی اوٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس دن واقعی میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چنا ہے۔ ایسی گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگر میں ہوتا تو جوگیا کو یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا۔ تبھی میں نے سوچا — میں نے بہت چھپنے کی کوشش کی، لیکن جوگیا نے جاتے اپنے من میں مجھے بلا کر مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے —

پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا میل۔ معلوم ہوتا تھا اگیاری لین یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں۔ اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا: "آج تم نے بڑا پیارا رنگ چنا ہے، جوگی۔۔۔"

"میں جانتی تھی تم اُسے پسند کرو گے۔"

"تم کیسے جانتی تھیں؟"

"ایسے ہی۔۔۔ کبھی کبھی تمہارا من میرے من میں آ جاتا ہے۔"

"ہوں" میں نے سوچتے ہوئے کہا — "آج تمہیں چھونے، ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"جی کیا چاہتا ہے؟"

اس وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ آ گئی جسے نکلنے میں صدیاں لگیں۔ میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھینٹے اڑانے لگیں۔ جب تک ہم پرنسس اسٹریٹ کا چوراہا پار کر کے میٹرو کے پاس آ چکے تھے۔ جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ میں نے کہا "آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں۔"

"روؤں؟ — کیوں؟"

"شاستر کہتے ہیں آتما کے پاپ رونے ہی سے دُھل سکتے ہیں۔"

"کون سا پاپ کیا ہے تمہاری آتما نے؟"

"ایسا پاپ جو میرا استری نہ کر سکا۔"

ایسی باتیں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھتیں اور یا پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں۔ جوگیا نہ سمجھ سکی۔ اپنا گھر ہی بچار اس کے من میں چلا آیا تھا: جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟

"کیا ـــ کیا ـــ کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے" اور اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی ساری کی طرف اشارہ کیا "تمہیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے نہ آپ ہی واپس آؤں، نہ تمہیں آنے دوں" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے وہ کبھی آئی تھی۔

میں کچھ دیر کھڑے رہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پرے گئی ہیں جہاں سے وہ خود آئی ہیں اور نہ انہیں آنے دیا ہے۔ خدا بھی ان کے پاس سے گذرتا ہے تو ایک سرد آہ بھر کر چلا جاتا ہے۔

مڑ کے دیکھا تو جوگیا جا چکی تھی۔

امبر تو کہاں، جوگیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ایک طرف یتیم اور لاوارث چھوڑ گئی تھی جس کا احساس مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا۔ حدت سے پھٹتی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینہ پونچھتے ادھر ادھر جتبے سناتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ تبھی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے۔ وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی، لانبی، اونچی، باب کٹے ہوئے بال اور ہلکے نیلے رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں، دو، تین، چار عورتیں ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں۔

یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی سب عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساڑی۔ اسکرٹ بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ گیا تھا۔ سوچیے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھا کنگھی بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کونسی بات، کون ایسا جذبہ ہے جو انہیں بتا دیتا ہے۔ آج یہ کلر پہننا چاہیے۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اوب جاتی ہے اور پھر دوسرے دن اس کا ہاتھ اپنے آپ کسی دوسرے رنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً سرسوں کا سا پیلا رنگ، چمپئی رنگ، گل انادی، بسنتی، فیروزی ــ ــ ــ لیکن ـــ وہ کونسا بے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب کی سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا باندرہ، پورا سنسار ایک ہی رنگ سے

بھر جاتا ہے۔ شاید یہ موسم کی بات ہے یا ویسے ہی چاند کی، بادل کی۔۔۔۔ شاید کوئی مروجہ فیشن، کسی ایکٹریس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے!۔۔۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات وہ رنگا رنگ کپڑے بھی پہنتی ہیں اور کیا کچھ مردوں کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساریاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ کا شمہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا، جبکہ میں اسکول پہنچا، ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آ رہے تھے۔ کچھ آ کر کمپاؤنڈ میں کے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

ان میں سکیشی بھی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ نیلا تھا۔

اگر ہمینت میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ ہمینت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں واسنت تھا۔ بہار، جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی ہنسی اور تضحیک رہتی تھی جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے ــــ سالے! چاہے وہاں کا نور لگالے، تو کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پر گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جانے کی نوبت آئی ہے؟ بے بسی میں تشنجی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں؟ کیا تیرے بدن پر ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگے ہیں؟ رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پر جھپٹے ہیں اور اپنا منہ تیری شہ رگ سے لگا کر تیرا خون چوسا ہے؟ کیا تو اس وقت بچوں کی طرح رویا ہے جب تیری تصویر انعامی مقابلے میں اول آئی ہو۔ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک کر کے تجھے اندھے کنوئیں میں دھکیل کر چلے گئے ہیں؟ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پر چڑھایا گیا تھا، وہ تو تھا؟ تیرے چہرے پر سیاہیاں چھٹی ہیں اور تیرے خدوخال اتنے سخت، گھناؤنے اور طاقتور ہوئے ہیں جتنے میکسیکو کے میورلز؟ کیا تجھے ہر لمبوتری چیز ایک لنگ اور ہر پیڑ کی کانٹھ یونی معلوم ہوئی ہے جس سے متوحش ہو کر۔۔۔۔

آج پھر میں نے اسے بتایا ــ شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا پہنے نکل آئی ہیں۔ ہمینت نے لمبے دانت دکھا دیئے اور حسب معمول میرا مذاق اڑانے لگا۔ وہ مجھے سادن کا اندھا سمجھتا تھا جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے سکیشی کی طرف اشارہ کیا جسے ہم ماڈل کہا کرتے تھے وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی لیکن اس کے بدن کے خطوط بالکل دیسی لڑکیوں کے تھے۔ میں نے کہا ــ دیکھو آج یہ بھی ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے بیٹھی ہے۔

ہمینت نے مجھے کچھ نہ کہا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا، کمپاؤنڈ سے لان پر لے آیا جو ہال کے پیروں سے پٹا پڑا تھا۔ وہاں ایک کنارے پر پہنچ کر وہ باڑ کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ ایک

join eBooks Telegram

راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا وکٹوریہ ٹرمینس اور ہارن بی روڈ کی طرف۔ وہ شاید سمجھتا تھا یہ سب میرا وہم ہے۔ وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی۔ مگر عورتیں اپنے اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساڑیوں میں چھپا کر اوپر، ابروں پر اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد نظر نہ آتے۔ لیکن۔۔ چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے کبھی کسی عورت سے انہیں سروکار ہی نہ تھا۔ کوئی لانبا تھا اور کوئی ناٹا۔ کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور تو ندیلا۔ اور وہ سب بھاگ رہے تھے۔ جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ جیسی ادھر سے جیسے لوہے کی بج رہی، گھاٹن گندی جس نے پورے رنگ کا کاشٹا لگا رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمینت بولا — "پہچان اپنی اس سال کو۔۔۔۔۔"

میں نے بیکار کی ہمدرداری کی — "میں ان بیچاری غریب مزدور عورتوں کی بات نہیں کرتا۔"

"کن کی کرتے ہو؟"

"ان کی جن کے پاس کپڑے تو ہیں۔"

جبھی میری بدقسمتی سے ایک سیٹھانی، سامنے، پارسی مالدولے کے ہاں رکی۔ اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اس جماعت کی نمائندہ تھی جن کے پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں۔ اور رنگ آنتوں انواع کے کر وہ بوکھلا جاتی ہیں۔ اسی لئے جب وہ اپنے وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں سندریوں کا وہ بے تار برقی کا پیغام نہیں آتا۔ ان کی حالت اس خریدار کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دکاندار انواع و اقسام کا ڈھیر لگا دے اور ان میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔ وہ عورت خوب لپی پتی ہوئی تھی اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساڑی پہن رکھی تھی۔ پچاس فیٹ چوڑی سڑک کے اس پار سے مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلے کا سا رنگ نہ چلے گا۔

اس عورت کا نوکر جو تھوڑی دیر پہلے پرمٹ کے کاغذ سنبھالتا ہوا اندر گیا تھا، ایک ٹوکری میں کچھ وہسکی اور چند بیئر کی بوتلیں رکھے ہوئے باہر چلا آیا اور ڈکی کھول کر اس میں رکھنے لگا۔ جب تک میں ہمینت کے سامنے خفیف ہو چکا تھا۔ اپنی خفت کو چھپانے کے لئے میں نے کہا —

"یہ بیئر کی بوتلیں۔۔۔ کم از کم اس کے مرد کو تو گرمی لگتی ہے۔"

ایسے ہی میں ہمینت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جبکہ سب عورتیں سرمئی ساڑیاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے۔ لیکن جب ہمینت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو مجھے وہ سب الگ الگ دکھائی دینے لگتے۔ آخر میں نے اسے اپنے دل کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

join eBooks Telegram

لیکن — وہ چھوٹتا کیسے؟ ایک دن جوگیا نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساری کا بجید خوبصورت امتزاج پیدا کیا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی فیشن کر رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان میں کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساری کالے رنگ کی تھی جس میں سنہرے کی ایک آدھ تار جھلملا رہی تھی۔

کئی موسم بدلے۔ خزاں گئی تو بہار آئی — یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار بمبئی میں آسکتی ہے۔ اور پھر اس بہار میں ایک کاہش سی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ ایک ہیجان۔ تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو حد درجہ گداز کر دیتی ہے اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں۔ پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہو گیا اور اس پر نازکی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے بیچ سُبک سی جاپانی پرو وشالہ بن رہتی ہے۔ پھر سمندر میں اس قدر زہر گھلا کہ نیلم ہو گیا اور اس میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں۔ آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی گیروں کے حوالے کرنے لگیں۔ پھر آسمان پر صوت دجلی کا ٹکراؤ ہوا۔ بادل گرجے، بجلی تڑپی، اور یکایک چھاجوں پانی برسنے لگا۔ اس عرصے میں جوگیا نے کئی نیلے پیلے، اودے کالے، سردئی اور سرمئی، دھانی اور چمپئی رنگ بدلے۔ اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہو جانے کی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت مند لڑکی کے جب بچے پیدا ہوں گے، جڑواں ہوں گے۔ بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انھیں کیسے سنبھالوں گا؟ اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپ اسٹک لگانے کی اجازت بھی لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جا رہی تھی اور دوسری طرف پک پک کر کھل رہی تھی۔ جوگیا نے لپ اسٹک استعمال کرنے کی اجازت تو لے لی تھی لیکن اتنی ساریوں، اتنے رنگوں کے لئے اتنے لپ اسٹک کہاں سے لاتی! میں نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ اسٹک خرید کر تحفے میں جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش ہوئی۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اس کے ہاتھ میں دے دی ہو۔ وہ بھول ہی گئی کہ وہ میرے ساتھ گرگام کے ٹرام کے پٹے پر کھڑی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں میلوں اندر دھنس گئیں اور نمی سی باہر جھلکنے لگی۔ میں سمجھ گیا جوگیا بجید جذباتی لڑکی ہے۔ بھلا میرے سامنے اتنی ممنونیت دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن بات دوسری تھی جس رنگ کی میں لپ اسٹک لایا تھا، اس سے میچ کرتی ہوئی ساڑی جوگیا کے پاس نہ تھی اور نہ خریدنے کے لئے پیسے تھے۔ میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوبصورت سی ساڑی خرید کر اُسے دے سکتا۔ میں نے تو لپ اسٹک کے پیسے بھی موٹے بھائی کی جیب سے چرا لئے تھے اور دیا بھابھی کے ساتھ اس عشق میں شریک تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے۔

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشا ہوا۔ جوگیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے پڑے ہوئے کچھ عقیق

join eBooks Telegram

بیچ ڈالے اور میری لپ اسٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ایک ساڑھی خرید لی۔ اس بات کا مجھے کہاں پتہ چلتا لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی۔ جوگیا کی سہیلی ہیا!۔۔۔ جوگیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساڑی پہنی اور جب ہم اگیاری پار، لافانو زینت کے جنگل میں ملے تو میں نے جوگیا کو چھیڑا — "جانتی ہو، جوگیا! آج تم کیا لگتی ہو؟"

"کیا لگتی ہوں؟"

"بیر بہوٹی۔۔۔ جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے۔"

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جانتے ہو تم کون ہو؟"

"؟"

"بیر — اور میں، بیر بہوٹی۔"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساری کے رنگ میں ذرا سا بھی فرق نہ رہا۔

اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اپنی آنکھوں کے اس جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہیمنت سے کہہ دیا۔ ایسے کے ہیمنت نے دیکھے نہیں۔ تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہ عام پہ میری بے عزتی کی۔ شاید مجھے اتنا بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سوکیشی وہاں نہ آجاتی جو سفید نائیلون کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً ننگی نظر آ رہی تھی — وہ روز بروز سیکس کا موڈل ہوتی جا رہی تھی۔

جوگیا کی بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی۔ اس کا مجھے روح کی گہرائیوں تک سے اندازہ تھا لیکن میں کچھ کر نہ سکتا تھا سوائے اس کے کہ میں اسکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کر لوں اور یا تصویریں بنا کر مالا بار ہل اور وارڈن روڈ کے چھوٹے دقیقہ شناسوں کو اونے پونے داموں میں بیچ دوں لیکن ان سب باتوں کے لئے وقت چاہیئے تھا جو میرے پاس تو بہت تھا۔ تھوڑا بہت جوگیا کے پاس بھی تھا لیکن اس کی ماں کے پاس نہ تھا۔ محنت اور مشقت کی وجہ سے جیسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابی اور موٹے بھیا سے کہہ دوں۔ لیکن مجھے اس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ہیا، باپو گھر میں جوگیا کے پیار دلار دیتی ہوئی ایکا ایکی اپنے گھر میں آدھمکتی اور دھڑ سے کہہ ڈالتی "کاکا! کیوں نہیں تم جوگیا سے بیاہ کر لیتے۔؟"

اور میں ہمیشہ کہتا — "دھت!"

یہ دھت اگر میں ہی کہتا رہتا تو کوئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد ہیا کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا اور بھابی نے اُسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک دن تو بھابی نے اس معصوم کو ایسا طمانچہ مارا کہ وہ الٹ کر

دہلیز پر جا رُکی۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دونوں گھروں کے بیچ میں کوئی بات ہوئی ہے
میرا اندازہ ٹھیک تھا جوگیا اور بجوری کی ماؤں اور چچا جان نے مل کر بھابی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی
کھائی۔ پانچ گھر کی حد تک یوں ٹھیک تھیں۔ ان سے باتیں کر لینا، ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا۔ ایک آدھ
کو اشارے سے سلام کرنا اور چوری چھپے ان سے ہم بستری کر لینا بھی ٹھیک تھا۔ لیکن ان کے ساتھ رشتے ناطے کی
بات چلانا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال اور ان کا
زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں ـــ جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ لمبا چوڑا دے دلا نہ سکتی تھی اسی لئے ہمارے گھروں
میں جب کوئی لڑکی جوان ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے رہیں ـــ تیار ہو گئی مرنے کو ـــ خیر دینے دلانے
کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھابی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں ـــ
جوگیا کا باپ کون تھا؟ کوئی کہتی وہ مسلمان تھا اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک بنگالی تھا جو بڑودے میں بڑے عرصے
تک رہا تھا۔ جو بھی ہو وہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں متعود ر
لکھیرا کن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہیں مانا جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی مگر لوگ جوگیا کی ماں، ایک بیاہتا عورت کو
دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے یہ اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلے پڑنے نہ دیا اور وہ بمبئی چلی آئی۔ کچھ بھی تھا، اس
میں جوگیا کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور باپ کی شفقت کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ میں ان
سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے اور جوگیا کے ساتھ ہر فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار تھا لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں
کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔ اب وہ چاہتی تھی جلدی سے جلدی جوگیا کا ہاتھ کسی واجبی گذارے
والے مرد کے ہاتھ میں دیدے۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی، اس
نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا اگر اس نے مجھ سے شادی کی بات بھی کی وہ کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل مرے گی۔
جوگیا اب کالج نہ جاتی تھی اور پانچ گھر کے جوگیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے ایک
جھونکے کے لئے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی۔ سرِ شام ہی اندھیرے کے چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر
پھیلنے لگے کچھ دیر کے بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منہ رکھے تیزی سے میرا سانس چوس رہا ہے۔
جتنا میں اسے اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑتے جا رہے ہیں۔ ان شاموں
کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا۔ ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے ـ حبس اور جانکنی
کا رنگ۔ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آتی ہیں وہ ہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف ان کی چھاتیاں اور محبوبہ
کی چھاتیاں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی اور جوگیا میری نہ ہو سکتی تھی۔

join eBooks Telegram

اوہ ـــــ اتنی گھٹن، اتنی اداسی ـــ اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ میلا میلا، چھدرا چھدرا جیسے منہ میں ریت کے بے شمار ذرّے۔ اور پھر اس میں ایک عفونت ہوتی ہے جس سے متلی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اٹھا تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی تو میں اُسے لے کر کہیں بھی نکل جاتا۔۔۔ تبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بدھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لے کر اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں اور پھر بیٹھ کر "ہرم ہنے پدمے" کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

میں واقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن سامنے بالکونی میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں نہیں سوئی۔ اس کے بال بے حد روکھے تھے اور یونہی اِدھر اُدھر چھپے اور گلے میں پڑے تھے۔ اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبو دی۔ کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی۔۔۔۔

میں اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں کس نے بتایا تھا؟۔۔۔۔ وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انہیں بھی کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھی اور منہ میں مجیرے تھے جو نہ کسی کو دکھائی دے رہے تھے اور نہ سنائی دے رہے تھے۔ وہ بھکشونی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں اور انھیں کھٹکھٹا رہی تھیں لیکن اس بھرے شہر بمبئی میں کوئی انھیں بھکشا دینے کے لئے باہر نہ آ رہا تھا۔

اسکول پہنچا تو ہمنیت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی۔ بولا "شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے؟"

میں اس بے حس آدمی کو جواب نہ دینا چاہتا تھا لیکن اپنے آپ ہی میرے منہ سے نکل گیا "آج سب جوگنیں بن گئی ہیں۔ سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جوگیا پہن لیا ہے۔"

اس دن میں اُسے اوڈ شیکیشی کو گل مہر کے نیچے سے، پام کے پیڑوں میں سے گھسیٹتا ہوا بار کے پاس لے گیا۔ سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے ساکت تھے۔ ان سب نے بیراگ پا لیا تھا اور جوگیا کفنیاں پہنے بلا ارادہ، بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں، کوئی عورت نہیں جسے ان کو جواب دینا ہے۔

میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جوگیا کپڑے پہنے ہاتھ میں کمنڈل لئے جا رہی تھی۔ ہمنیت

join eBooks Telegram

کھلکھلا کے ہنسا۔ ساتھ سکیشی بھی ہنسی جس نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کولھے، اس کی رانیں تک دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی۔۔۔۔۔

جب ہمینت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا "تو بالکل پاگل ہو گیا ہے، جگل۔۔۔۔ کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟ اس عورت نے تو ایک اودی ساری پہن رکھی ہے اور وہ کنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے، ایک خوبصورت پرس ہے۔" سوکیشی نے بھی ہمینت کی تائید کی۔

میں حواس باختہ سڑک پر کھڑا سامنے دیکھتا رہا۔ تبھی ایک بس رکی اور اس میں سے ایک لڑکی اتری۔۔۔۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے کہا ــــ "وہ جوگن ہے، جوگیا کپڑے پہنے ہوئے میں کیا اندھا ہوں؟

لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لئے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی۔

"ہمینت۔۔۔۔"

لیکن ہمینت اور سوکیشی ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے اندر جا چکے تھے ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے ایسے ہی بے یار و مددگار اس صحرا کے کنارے چھوڑ گئے تھے جیسے لوگ کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔۔ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے۔

اور وہ لڑکی اس طرف آ رہی تھی۔ اب تو مجھے پورے سنسار پر پھیلے ہوئے اس رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی بلند آواز کے ساتھ ہمینت اور سکیشی کو پکارتا وہ لڑکی میرے قریب آ چکی تھی۔ میں نے ایک آواز سنی ــــ "بیر"

اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ خود جوگیا تھی جسے میں نے اس صبح اپنے گیان بھون سے، بانو گھر کے کھلے دروازے میں سے، سب ساریوں میں سے جوگیا رنگ کی ساری کا انتخاب کرتے دیکھا تھا۔

ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، اور عجیب تر بے بسی کے عالم میں رک گیا ــ جوگیا بولی۔

"میں کل بڑودے جا رہی ہوں۔"

"کیوں جوگیا۔ بڑودے میں کیا ہے؟"

"میری ننھیال ــــ وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے پرسوں۔۔۔۔"

"او۔ ۔ ۔"

"میں تم سے ملنے آئی تھی۔"

"تو ملوٹ میں جلنے گیا کچھ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔"

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل صابری اور کچھ دوسرے لوگ آجا رہے تھے۔ جبکہ جوگیا نے اچک کر اتنے نعدے سے میرا منہ چوم لیا کہ میں بوکھلا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس، چالیس برس کی ایک یکھر پید عورت بن گئی تھی۔ اس کا بوسہ کتنا مرتعش تھا، کتنی مقدس وحشت اور شہوت تھی اس میں۔

اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو ہمیں وہ دکھائی نہ دیئے۔

وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے۔ جاتے ہوئے جوگیا نے کہا۔

"میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں تمہیں مار دوں گی، ہاں" اور ساتھ ہی اس نے مجھے مُکا دکھایا۔

اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی۔

سویرے گیان بھون اور یا پنونگر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی جس پر بازار کا بوجھا اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور کچھ ٹرنک رکھ رہے تھے اور کچھ یونہی اِدھر اُدھر کا سامان۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے پانچو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے لیکن سامنے گیان بھون کے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ مولے بھیّا اور بھابی تو کیا آتے معصوم ہیا کو بھی انہوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آرہی تھی۔

پہلے بجید کی ماں اور پنجابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑا سانس درست کیا اور پھر سب کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "اچھا بہنو، ہم چلتے بھلے، تم بستے بھلے۔"

اور پھر آئی ـــــ جوگیا!

جوگیا نے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی اور گلاب ہی کا پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر آنکلا۔ میں نے عادتاً کہا "صاحب جی۔"

"صاحب جی" پارسی پروہت نے کہا اور پھر مجھے اور جوگیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا، آشیرواد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں ژند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جوگیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

جب، میں نے بھی مسکرا دیا!

(پاکستان اور ہندوستان میں نقل و اشاعت کے جملہ حقوق بحقِ "سوغات" محفوظ ہیں)

join eBooks Telegram

راجندر سنگھ بیدی

مختصر افسانہ

ایک محاورہ ہے ۔ "جتنے منہ، اتنی ہی باتیں"
اس لئے مختصر افسانے کا کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کہانیوں کا
پنچ تنتر کے قصّوں اور الف لیلیٰ کی داستانوں سے لے کر بریٹ ہارٹ اور جرنا بارنے تک۔ بیچ میں ہزاروں ہی لوگ آئے اور
اپنی بات، اپنے ہی منفرد طریقے سے کہتے رہے۔ کسی نے رومان کو اپنا ایمان بنایا اور تحیّر کے عنصر کو کہانی کی جان قرار دیا۔ پڑھنے
والے کو ایسی ٹھنی دی کہ ہوش گم ہو گئے یا اُڑ گئے! (تعقّل کے مضمون میں ہوش آجانا یا اُڑ جانا ایک ہی بات ہے) ادھر چیخوف کی طرح
کے بھی آئے جن کو زندگی کے صحرا میں بڑا سا تربوز مل گیا اور انہوں نے بڑے پیار، بڑی جمعیت سے اس کی چھوٹی چھوٹی پھانکیں
کاٹیں اور سب کے ہاتھ میں تھما دیں۔ لارنس نے حیات کی نیم غنودگی میں رنگ دیو کا طلسم سونگھا اور دوسروں کو بھی سنگھا دیا۔
جو برداشت کر گئے ان کی تو آنکھیں کھل گئیں اور جو نہ کر سکے وہ آج تک چھینکیں مار رہے ہیں۔ ایڈگر ایلن پو نے کہا۔
کہانی کا ہر وہ حصّہ جو برق دیکھی ہو، کاٹ دو کیونکہ وہ شب رنگ کہانی کے مجموعی تاثر کو بانٹے گا اور وہ یہ بھول ہی
گئے کہ ایسی کہانی بھی لکھی جا سکتی ہے جس میں دن کا رنگ غالب ہو، خودکشی سے چند ہی مہینے پہلے ہیمنگوے نے کہا کہ
میں نے اپنی تحریروں میں طالسطائی اور بالزاک، موپاساں اور چیخوف کو سمو لیا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی کہانیوں
میں ہمیں ان سب استادوں کا ایک خوبصورت سا امتزاج نظر آتا ہے۔ البتہ اسٹائل میں کھردراپن، کردار اور موقع
میں تشدّد ان کا اپنا تھا کیونکہ انھوں نے زندگی کو اسی رنگ میں دیکھا تھا جو انہی کے لئے جھلک ثابت ہوا۔ زندگی کو
دوسرے کے رنگوں میں قبول کرنے والے نہ تو سومرسٹ ماہم کی کلبیت سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ ژیاں پال سارتر کی جبیت
سے اور نہ ولیم فاکنر کی یاسیت اور قنوطیت سے۔

اپنے اور صرف اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے والوں کو جاننا چاہیے کہ اگر اونٹ ان کی نظر سے اونٹنی کی طرف دیکھے گا
تو کبھی اس پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ آج جب الیکٹرونک مشینوں پر نظمیں لکھی جا رہی ہیں، کہانیاں قلم بند ہو رہی ہیں۔ اور
ARTIFICIAL INSEMINATION سے بچّے پیدا کئے جا رہے ہیں تو ہماری اولاد کو ایلفرڈ دائیے

join eBooks Telegram

(APHRODITE) اور ڈیمیٹری یاس (DEMETRIUS) کی داستانوں کو خوبصورت نقشوں کی صورت میں یاد رکھنا ہوگا۔ ورنہ ان کے زمانے میں تو مرد کا سر کدو کی طرح تھا۔ اور عورت کے کولھے اور ... سیتا پھل کی مانند۔۔۔
زگمیا ہنری جیمز کیتھرین منسفیلڈ، اور ہنری اور ولیم سرویان تک پہنچتے پہنچتے افسانے میں انفرادیت کے علاوہ رچاؤ اور گہرائی اس قدر بڑھ گئی کہ اُن کے افسانوں کی ایک ایک سطر اپنے اندر کئی کئی افسانے لئے ہوئے تھی۔ پھر ٹیگور کی کہانیوں کی نغمگی کیفیت، سرت چیٹرجی کی گھلاوٹ جیسے شکنجبین کی مصری، پریم چند کی سادگی اور ان کا خلوص جو بعض وقت جہاں شائیت ہو کر رہ جاتا ہے۔

غرضیکہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ جتنے منہ ان سے زیادہ باتیں اور پھر ان میں سے ایک میوا منہ جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ اسے بڑے شوق سے دیکھئے، ہنسیئے یا رو دیجئے (تتلی کی زبان میں ہنسنا یا رونا ایک ہی بات ہے:) لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھئے کہ منہ دیکھتے رہ جانا بھی بھلی زبان کا ایک محاورہ ہے۔

ہمارے پرانے فلسفیوں کے مطابق یہ دنیا ایک تخیل ہے۔ ہم شروع اور آخر کے انداز میں سوچنے والے اس تخیل کی تہہ کو نہیں پا سکتے لیکن اپنے اندر اس عظیم تخیل کی حدوں کا ایک دھندلا سا تصور باندھ سکتے ہیں۔ پھر وہ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اب اس خیال کو دامِ خیال میں لا کر ہم نے ایک افسانوی طرز کی سازش پیدا کی جس کی جڑ افسانے کی صورت میں ملی اور سزا عمر قید کی شکل میں۔ افسانے ۔۔ طویل یا مختصر خدا کے تصور سے شروع ہوتا ہے جو ایک سے انیک اور ایک سے پھر ایک ہو جاتا ہے۔ عجیب سازش ہے تاکہ ابتدا میں انجام چھپا ہو اور انجام میں ابتدا کی صورت ہو۔ اسی چکر کو افسانہ کہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے افسانہ ایک خواب ہو جس میں ہم کھو جائیں اور اکثر اوقات جاگنے پر بھی جی چاہے کہ سرہانے میں آنکھیں دبا کر پھر سے وہ خواب دیکھیں جس میں کسی حور نے کہا تھا۔۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گی لیکن اس کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے ٹیلیفون کی گھنٹی نے جگا دیا۔ اب ٹیلیفون پر کوئی خان کہہ رہا ہے، میں ابھی آ رہا ہوں ۔۔۔
زندگی کا یہ استہزا کیا افسانہ نہیں؟

گویا خدا اور اس کے تصور کے بعد پہلا افسانہ اس وقت لکھا گیا جب آدم کے پہلو سے حوا برآمد کی گئی۔ دوسرا افسانہ اس وقت لکھا گیا جب دو وجود، مرد یا عورت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنی اپنی ذات کو محسوس کرنے لگے۔ اور کہا ۔۔ میں اور تو ۔۔۔ اور پھر وہ مسکرانے، آبدیدہ ہونے لگے۔ پھر اس میں ترنم شامل ہو گیا، روشنی کی لپٹیں چلی آئیں۔ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایک بچہ اس دنیا میں لائے جو انسان کا سب سے پہلا مختصر افسانہ تھا "میں" اور "تو" کے بعد بچہ ۔۔ "وہ" تھا۔

join eBooks Telegram

پھر اس افسانے میں مدد اس کی گھٹیا تصویروں کی طرح سے خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں چلی آئیں۔ ایک اور بچہ چلا آیا۔ پہلا ہابیل تھا تو یہ قابیل۔ دونوں آپس میں لڑنے لگے اور یوں ہی لڑتے جھگڑتے جوان ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو مارنے مرنے پر تیار رہتے۔ کبھی پیٹ کی خاطر اور کبھی عورت کے لئے جو کہ ان کی اپنی ہی بہن تھی۔ آخر قابیل نے ہابیل کو جان سے مار دیا اور یوں انسان کی اولاد ترقی کرنے لگی۔ آدم کے بیٹوں کے مرنے پر اس وقت کی بزرگ عورت نے اپنے قبیلے کے جوان اور خوبصورت بیٹوں کو اپنا شوہر بنایا اور بڈھے کھوسٹ شوہر کو مار مار کر جنگلوں میں بھگا دیا۔ یہ شاید تیسرا یا چوتھا افسانہ تھا۔

پھر انسان نے فیصلہ کیا کہ ماں بیٹے یا بھائی بہن کی شادی بقائے نسل کے لئے اچھی بات نہیں۔ جب تک انسانی قافلہ مصر کے دیوتاؤں کی روشنی میں رمیس اول REMASIS تک پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے ایسی شادی کی مناہی کے لئے قانون بنائے جو بہت بعد تک بھی لاگو نہ ہوئے لیکن آخر تسلط پا گئے۔ انسانی بہتری کے دوسرے قانون اور افسانے جنم لینے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ POMPSII یا پمپائی کی تباہی کے وقت ایڈیپس اور اس کی ماں علیحدہ ہو گئے، جب لوٹے تو ایڈیپس جوان ہو چکا تھا اور اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا جو روم میں رہ رہی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن پر ہمیشہ بہار رہتی ہے اور وقت جن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ روم میں دونو ملے اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور آخر شادی کر لی۔ کہتے ہیں کہ ان سے بڑا خوش جوڑا پورے روم میں کہیں نہ تھا۔ لیکن ایک دن، ایک شام دشامت کا اسم تصغیر! انہیں پتہ چل گیا کہ وہ ماں بیٹے ہیں۔ ان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ انسانی دودھ میں سماجی تیزاب مل گیا اور وہ دونوں اس میں گھل گھل کر رہ گئے۔ اور اس ایک بیٹے نے دنیا کے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو جنم دیا، جن میں انسانی فطرت اور اس کے اپنے بنائے ہوئے قانون میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ پھر مشرق میں ایک اور عظیم افسانہ لکھا گیا جس کے کردار راجہ بھرتری ہری تھے اور ان کی رانی جو کہ ایک نہایت ہی حسین عورت تھی۔ بھرتری اس کے گداز جسم کی طرف دیکھتے اور سوچتے کیا ایسا وقت بھی آئے گا جب اس کے چاند سے چہرے پر جھریاں چلی آئیں گی؟ چنانچہ کسی ولی نے انھیں ایک سیب دیا اور کہا۔ اس کے کھانے سے حسن لازوال ہو جاتا ہے اور انسان لافانی۔ بھرتری ہری نے رانی کے حسن کو دوام دینے کے لئے اپنے آپ پر اُسے ترجیح دی۔ وہ اس حسینہ کو ہمیشہ اسی عالم عالمتاب میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن رانی ایک نوجوان دھوبی سے پیار کرتی تھی اور ہمیشہ اُسے تندرست اور جوان دیکھنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے وہ سیب دھوبی کو دے دیا جو ایک طوائف پر عاشق تھا اور جو اس کی زندگی میں مسرت کے لمحے لاتی تھی۔ طوائف نے یہ سمجھ کر کہ اس کا جسم گناہ کی کان ہے، وہ سیب بھرتری ہری کی نذر کر دیا کیونکہ وہ حاکم وقت تھا اور اس کے دائم و قائم رہنے سے لاکھوں کروڑوں لوگوں کا بھلا اور طوائف کے اپنے گناہوں کا کفارہ ہو سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھرتری ہری نے دنیا

join eBooks Telegram

ترک کر دی۔

اس کہانی میں کیا کہا گیا — کیا یہ کہ وہ شخص جسے ہم اچھا کہتے ہیں، برا ہو سکتا ہے اور جسے برا کہتے ہیں، اچھا۔ یا خالی خولی زندگی کا استہزا ہو اور اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل؟ یا یہ کہ ہم کسی کے بدن پر قبضہ کر سکتے ہیں، اس کی روح پر نہیں۔ شرنگار رشتک کی عورت اپنے شوہر کے بازوؤں میں بوس و کنار کرتے ہوئے اپنے ذہن میں کسی دوسرے مرد کو رکھے ہوتی ہے — — — — !

چنانچہ پہلی کہانیوں میں اخلاق اور نتیجے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ آخر انسان نے سوچا کہ ہم بچے تو نہیں جو ایک دوسرے کو نصیحت کرتے پھریں۔ اور یہ کہ کیا آدمی اس طرح کی نصیحت کو تو میں باندھتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے حقیقت میرے ہی تسلط میں آئی ہے۔۔۔ چنانچہ انہوں نے تدریس کا کام درسگاہوں، تبلیغ کا مذہبی رہنماؤں کو سونپا اور سیدھی سادی کہانی سے اپنی اور دوسروں کی طبیعت خوش کرنے لگے۔ انسان کے جذبے، اس کی دلچسپی اور گتھی میں پڑے ہوئے اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانے لگے۔ جہاں کہانی ان کے لئے تفریح کا سامان تھی وہاں ریاضی کا ایک سوال بھی جس کا حل عام عقل کے ڈھنگ نہ جانتے تھے۔ اور کہانی کہنے والا چہرے پر چمک لا کر ایک عقلمندی کے احساس سے سامنے دکھائی دینے والے متحیر چہروں کا جائزہ لیتا تھا اور آخر اس کا انجام بتاتا تھا اور لوگ حیران ہو ہو جاتے تھے۔ ایسا انجام تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کون سی کڑیاں تھیں جنہیں وہ سلسلے میں نہ لا سکے؟ کس داؤ پیچ نے انہیں مار گرایا۔ چونکہ بے وقوف اور فاتر العقل قرار دیے جانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس نے کہانی میں سے TWIST اور اس قسم کی چیزیں غائب ہونے لگیں اور کہانی کہنے والے کچھ اس انداز سے کہانی کہنے لگے — بھائی، میرے تجربے میں تو یہ بات آئی ہے، تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟ چنانچہ اس بے سر و پا کہانی کا وجود ہوا جس نے آج تک رسالوں کے ایڈیٹروں کو پریشان کر رکھا ہے وہ یہی سوچتے رہتے ہیں: یہ اسکیچ ہوا یا کہانی۔ اور نہیں جانتے مخالفین نے کہانی کا دامن کتنا وسیع کر دیا ہے کیونکہ قتل کی واردات کا من و عن بیان اور کچہری کی رپورٹ بھی کہانی ہے لیکن اس بے سر و پائی کے باوجود کہانی لکھنے والے کی کہانی ایک حلوائی کی کہانی سے یکسر بلند و بالا ہوتی ہے۔

کہانی کی کتنی بھی شکل بدل جائے، کہانی ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر نظم و نسق انسانی جسم کا حصہ ہیں، وہ کاٹ سکتا ہے اور ناچ سکتا ہے تو ہمیشہ کہانی کہہ سکتا ہے۔ واقعات کے بیان میں بڑھا سکتا ہے اور گھٹا سکتا ہے۔۔۔

اوائل کے افسانے کچھ یوں شروع ہوتے — "ایک دفعہ کا ذکر ہے۔۔۔" ظاہر ہے کہ اس جملے کو ہم اب صرف بچوں پر استعمال کرتے ہیں۔ بڑے یہ فقرہ استعمال نہیں کرتے لیکن اس قسم کا تاثر برحق ہے۔۔۔ "پھر ایک دفعہ کا ذکر ہے، مگدھ دیش میں ایک راجا تھا۔ اس کی سات رانیاں تھیں اور سات کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ ایک سادھو آیا اور اس نے سب سے چھوٹی رانی (جو کہ خوبصورت اور تر و تازہ تھی) کو ایک آم دیا اور کہا — اسے کھاؤ گی تو اولاد پاؤ گی۔ رانی بہت خوش

پھر ہم۔ اس نے سوچا میں نہا دھو کر اور صاف ستھری ہو کر آم کھاؤں گی اور اس دنیا سے بامراد جاؤں گی۔ چنانچہ آم کو طاق پر رکھ کر وہ غسلخانے میں نہانے گئی اور جب نہا کر لوٹی تو آم غائب تھا۔۔

یہ خاصر آج کی "نئے سر دیا" کہانی میں بھی ہیں۔ صرف راجا کی جگہ مزدور یا رانی کی جگہ کسی سوسائٹی گرل نے لے لی ہے۔ چونکہ محبت کے اظہار میں چند فقرے بار بار کہے گئے اس لئے اب ان کو کہنے کا انداز بدل گیا ہے۔ پہلے چہرہ ہمیشہ خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ اب وہ قبول صورت ہو گیا ہے۔ کچھ حقیقت پسندیاں لکھتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ وہ اچھی تھی اور نہ بری تھی۔ لیکن اس میں جمالیات کشش کا باعث ہو سکتی ہے، اُس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جو نفرت کا باعث ہو سکتی ہے، اسے بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ کوئی کتنا بھی پرانی کہانی سے بچنے کی کوشش کرے وہ اس کے بندھے ہوئے اصولوں سے بہت دور نہیں جا سکتا۔ ورنہ وہ کہانی نہ رہے گی۔ وہ موسیقی ہو سکے گی، نثر تیرہ ہو سکے گی، نقاشی ہو سکے گی لیکن کہانی نہیں۔ آپ کہانی کی اکائی کو دہائی میں بدل دیجئے لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ میں آتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے، انسانی اساس کا احساس بن جاتا ہے۔ اور جب کہانی کا ترنم آپ کے بدن میں چلا آئے تو آپ کو سڑک کے ہر گوشے گھروندے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کہانی کو نہیں ڈھونڈیں گے، کہانی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے آپ کو آئے گی۔ اس عورت کی طرح، بچہ اس دنیا میں لائے بغیر جس کا جینا بے معنی اور لاحاصل ہے!

خالی مکان

محمد علوی کی نظموں کا پہلا مجموعہ

شائع ہو رہا ہے

مکتبۂ سوغات، ۷۰۔۲ کلائن روڈ، بنگلور ۵

join eBooks Telegram

محمد حسن

بیدی کا فن

بیدی کا فن، رمزیت، تہہ داری اور مدھم لب ولہجے کا فن ہے۔ تہہ داری اور رمزیت نفسیاتی دروں بینی سے پیدا ہوتی ہے اور اس نفسیاتی دروں بینی کو دانشِ عصر کی سب سے بڑی دین کہا گیا ہے جو رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ فکری اعتبار سے انسانی تہذیب کی تاریخ ذہن کے پیکرِ محسوس سے تجرید و تعمیم کی طرف ارتقا کی داستان ہے۔ اسی لئے عہدِ عتیق کے افسانوں میں کشمکش مرئی اور مادی، کردار جسمانی اور ظاہری خصوصیات سے متصف اور طرزِ بیان نمایاں برجستہ اور مرصع ہوتا تھا۔ آج کے عالمی افسانوں میں بنیادی کشمکش مرئی اور مادی نہیں نفسیاتی اور داخلی ہے اور کردار حسن و جمال، عمل اور مادرائی طاقتوں سے متصف ہونے کے بجائے پہلودار اور پیچیدہ ہیں اردو افسانے میں ہنوز اس قسم کی کہانیوں کا عام طور پر چلن نہیں ہوا اور چند افسانہ نگاروں نے اسے برتا تو وہ نفسیات کی بھول بھلیوں میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ سماجی پس منظر کا احساس کھو بیٹھے۔

بیدی کے افسانے اس جدید افسانوی مزاج سے کافی قریب ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بیدی کے اعصاب پر نہ عورت سوار ہے نہ شاعری نہ وہ محض رومانی ہیں نہ محض جذباتی۔ مہدی افادی نے محمد حسین آزاد کو اردوئے معلیٰ کا ہیرو قرار دیا تھا کہ ان کا اندازِ بیان نہ سرسید کی طرح معقولات کا دستِ نگر ہے نہ حالی اور شبلی کی طرح سیرت، تاریخ اور علم کلام کا۔ یہی بات اردو افسانے کے ہیرو بیدی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بیدی ہمارے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن سے اگر رومان اور سیاست چھین لے جائیں تب بھی ان کا قلم اپنی روانی نہ کھوئے گا۔

رومان اور سیاست قابلِ اعتراض موضوعات نہیں لیکن کسی زبان کے افسانوی ادب کا گنے چنے چند موضوعات میں محدود ہو کر رہ جانا اس ادب کے لئے فالِ نیک نہیں ہے۔ اس سے فکر کی تازگی مجروح ہوتی ہے اور فکر کی تازگی اور بیان کی ندرت ہی تو فن کے معجزے ہیں، رومان اور سیاست میں تو نشہ ہوتا ہے۔ دونوں فوری طور پر اعصابی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس فوری تحریک کے جادو کے سہارے نسبتہً خشک اور غیر دلچسپ باتیں بھی برداشت کر لی جاتی ہیں مگر ان دونوں کو براہِ راست موضوع نہ بنانا بڑی جرأت

join eBooks Telegram

رندانہ کا کام ہے۔ ذہانت کو حریفوں کے لئے دہرا چھوڑ سکتا ہے جو خورشید پر بڑھ کر ہاتھ ڈال سکتا ہو۔ اس کے
لئے فکر پر اعتماد اور فن پر بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بیدی نے افسانوں کا بنیادی موضوع کیا ہے؟ انسان کا باطن، یہ کل اس لئے کہ وہ جلد جلد نہ بدلتے
ہوئے بھی ہر دم تغیر پذیر سماج کا جزو ہے اور اس تغیر پذیر سماج، اس کے عوامل اس کے خارجی مظاہر، اس کے انسانی
رشتوں سے وہ برابر اپنے رابطے کا تعین کرتے رہنے پر مجبور ہے۔ کبھی یہ رابطہ ارتباط کا ہوتا ہے کبھی تصادم کا، کبھی زندہ دلی،
کبھی بے دلی، کبھی شکست کبھی تشکیل نو، کبھی وہ سماج کے سانچے میں ڈھلتا ہے کبھی سماج اس کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور ان
دونوں طریقہ ہائے کار میں ایک ذرا سا جزو اس کی شخصیت کا ایسا بھی رہ جاتا ہے جو اس سانچے سے نکل بھاگتا ہے
اور اپنی فطری توانائی کی دہائی دیتا ہے۔

اس کے کل باطن کے مطالعے کے سلسلے میں دو باتیں اور بھی قابل غور ہیں ایک یہ کہ زیر مطالعہ باطن
غیر معمولی یا غیر صحت مند انسانوں کا نہیں ہے۔ البتہ ان انسانوں کو جنہیں ہم ایک مدت سے جانتے اور پہچانتے
تھے اچانک ہم انہیں ایک نئے انداز سے دیکھتے ہیں۔ بیدی کو مریضوں اور مجرموں سے شوق نہیں ہے وہ جب ان
کا ذکر بھی کرتا ہے تو انہیں انسانی روپ دے کر بڑا بھولا بھالا بڑا صحت مند اور نارمل سا بنا دیتا ہے۔
(زین العابدین: اک چادر میلی سی) وہ عام طور پر اپنے کرداروں کے اس حصے سے متاثر ہوتا ہے جو سماج سے
ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ لیکن اس ہم آہنگی میں بھی ان کی شخصیت کا ایک رخ، ایک جزو باغیانہ انداز سے الگ ہو کر جبلی
خواہشات کی نشاندہی کرتا رہ جاتا ہے۔ بیدی کو نارمل انسانوں کے انہیں غیر نارمل لمحوں سے دلچسپی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بیدی کے ہاں نفسیات کا لفظ فرائڈ کے ہم معنی نہیں ہے نہ وہ اسے جنسیات کے مترادف
سمجھتے ہیں نہ محض خود کلامی یا تحلیل نفسی کے۔ نفسیات کا لفظ غلطی سے ہمارے یہاں کچھ تحلیل نفسی کے معنوں میں استعمال
ہوتا رہا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نفسیات کے معنی یا تو جنسیات کے ہو کر رہ گئے یا غیر صحت مند شخصیتوں کے مطالعے
کے۔ نفسیات فرد کی باطنی کیفیات کے مطالعے کا نام ہے لیکن فرد جہاں فرد واحد ہوتا ہے وہاں اپنے علائق و عوامل
کے اعتبار سے سماج کا ایک جزو ہوتا ہے اور اس کا مطالعہ سماجی پس منظر سے بے نیاز ہو کر غیر ممکن ہے۔ اسی لئے نفسیات
کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے کہ اس کا مطالعہ سماجی پس منظر ہی میں کیا جا سکتا ہے، کو غیر معمولی سے زیادہ عام انسانی ذہن
سے سروکار ہے۔ چاہے انسانی ذہن نہ جنسیات کیلئے وقف ہے نہ سیاست کے لئے۔ دونوں زندگی کے اہم جزو ہیں مگر صرف
جزو ہی تو ہیں۔ ان سے اعلیٰ افضل اور برتر تو خود زندگی ہے۔ جس کی یکسانیت جس کے روز و شب کی معمولی مصروفیت کے
معمولات، چھوٹی چھوٹی کشمکشیں اور فتوحات سبھی ہماری داستانوں کا موضوع بن سکتی ہیں۔

اگر بیدی کے افسانوں کا فکری اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انسان کی جبلی معصومیت ان کا بنیادی

join eBooks Telegram

موضوع ۔ یہ جبلی معصومیت حالات کی تبدیلی اور ماحول کی جبر و دستی کے ہاتھوں کبھی کبھی ستم ظریفی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ حالات پر طنز بن جاتی ہے کبھی خود ہماری اقدار اور تعصبات پر اور کبھی خود اس معصوم انسان پر جو اپنی معصومیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھولا۔ ہمدوش۔ رحمان کے جوتے۔ پان شاپ۔ کوکھ جلی۔ خط مستقیم اور قوسین۔ پچھ چیچے داغ، جیسی چھوٹا تماشا۔ گرگٹ۔ گمانی۔ حق گر گربن۔ غلاقی۔ اغوا۔ لاجونتی اور اپنے دکھ مجھے دیدو جیسی "سنگین" کہانیوں میں بھی اسی معصومیت کا ایک ستم ظریفانہ پہلو نمایاں ہے۔ دوسری قسم کی کہانیوں میں اس معصومیت کے اظہار کی شکل اور بھی زیادہ مشترک اور حامل ہے ان میں من کی من میں۔ "ہنگل اشتکا۔ تھمین اور چھوکری کی لوٹ شامل ہیں اس کا تیسرا ذریعہ اظہار۔ زین العابدین۔ بیکار خدا۔ اور لاروے میں نظر آتا ہے اور ایک اور موضوعاتی اشتراک اس بھولے پن اور معصومیت کے اظہار کا ٹرمینس۔ جاجرین۔ رد عمل اور موت کے ماز میں جھلکتا ہے۔ ایک اور قسم ان کہانیوں کی ہے جس میں اقتصادی اور سماجی عدم مساوات کے خلاف آواز احتجاج بلند کی گئی ہے جس میں "حیاتی ب" "کوارنٹین" "بلادان" "دس منٹ بارش میں" شامل ہیں۔

پہلے گروپ کی کہانیوں میں یہ بھولا پن کسی چھوٹے سے نفسیاتی موڑ (TWIST) کی شکل میں نظر آتا ہے جس O. HENRY کی کہانیوں کا سا ہلکا پن تو ہے مگر مزاح کے پہلو کے بجائے نہایت سنگین، دل دوز ہونے کی حد تک سنگین اور کہیں کہیں الم ناک ہے "رحمان کے جوتے" اور "ہمدوش" دونوں میں ایک چھوٹا سا وہم یا مروجہ تصور کہانی کا مرکز بن جاتا ہے کہ ایک خاص انداز سے اگر دو جوتیاں جمع ہوں تو یہ سفر کی نشانی ہے لیکن کہانی کے کرداروں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا تھا کہ یہ دونوں باتیں اس طرح بے محابا ان کی اپنی زندگی میں بھی پیش آئیں گی "پان شاپ" میں دونوں دوست اپنا افلاس ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں دونوں ایک دوسرے کو پان شاپ کے آئینے میں پہچانتے ہیں۔ "گمانی" اور "کوکھ جلی" میں وہی دونوں باتیں یعنی ڈاکیوں کا ایک دوسرے کو سڑی سڑی گالیاں سنانا اور گھمنڈی کی کم آنکھ جو نہایت معیوب اور ناخوشگوار سمجھی جاتی ہے وہی خلوص کی نشانی اور جوانی کی علامت کی حیثیت سے مبارک گردان لی جاتی ہے۔

بیدی کا دوسرا محبوب موضوع گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں اور دکھ درد کو قرار دیا جا سکتا ہے ہنگل اشتکا اور تھمین دونوں میں شادی کی قدرتی سی خواہش المیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح "چھوکری کی لوٹ" اور "من کی من میں" کہانیوں میں بھی محبت کا ایک نہایت پاکیزہ تصور ملتا ہے تیسرے گروپ کی کہانیوں میں بعض غیر معمولی اور کسی قدر الجھے ٹیڑھے کردار آتے ہیں "زین العابدین" اور "بیکار خدا" کے ہیرو تو بھٹکی ہوئی معصوم روحیں ہیں جو باپ اور بیٹے سے بیرے ہیں" لاروے "میں عمل لیتی اور غربت نے

join eBooks Telegram

کرداروں کو پست بنا دیا ہے اتنا پست کہ انہیں صفائی، اچھی آب و ہوا اور زندگی کا حسن راس نہیں آتا۔ ان سبھی کہانیوں میں بیدی کا وہ فلسفۂ حیات بکھرا ہوا ہے جس کا اظہار زیادہ مکمل کر آخری گروپ کی کہانیوں میں ہوا ہے۔

دراصل بیدی سماجی زندگی کے ADJUSTMENT کو اہمیت دیتے ہیں اور اس عملی نقطۂ نظر کو اپنانے کے لئے اگر اپنی قدیم شخصیت کو تلانجلی بھی دینا پڑے تو اسے ضروری سمجھتے ہیں وہ تلانجلی جو مدن عل میں حلال کے احساس میں جھلکتی ہے یا ڈمینس میں بیج رام کی جرأت میں نظر آتی ہے اور جہاجرین میں مولوی آثم کو حقی میں تبدیل کر دیتی ہے اور "محبت کے راز" میں ان الفاظ میں گونج اٹھتی ہے:۔

"وہ راز یادداشت کی مکمل تحلیل میں پنہاں ہے۔۔۔۔۔یادداشت کی تحلیل۔
کیا ہماری نسلیں بھی ہماری یادداشت ہیں؟ اور کیا اس کی مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے سامنے طشت از بام کر سکتا ہوں؟ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں"

زندہ رہنے کی یہ خواہش بیدی کے ہر کردار اور کہانی کے ہر موڑ پر نمایاں ہے۔ مگر یہ خواہش روحانی نہیں محض ایک لمحۂ نشاط یا بے پایاں لذت کی تلاش نہیں ہے بلکہ ایک گہرا اور سنگین تجربہ ہے ایک ایسا بارِ گراں ہے جو لاتعداد مطالبے کرتا ہے اور ہر قدم پر نئے توازن چاہتا ہے اور زندگی کی اس کھٹ میٹھی سی خواہش کے لئے یہ قیمت ہر لمحے ادا کرنا پڑتی ہے وہی قیمت جو "اک چادر میلی سی" میں رانی نے منگل کو، اندھا جولا جونتی نے اپنے جسم کو کانچ کا بنا ہوا محسوس کرتے ہوئے ادا کی۔ وہی قیمت جسے بعض لوگ قسمت سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

سارتر نے اپنے ایک ڈرامے "کمرے میں" جہنم کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "جہنم دوسرے لوگوں کا نام ہے"۔ اگر غیر ذات کو دوزخ قرار دے دیا جائے تو کم سے کم یہ ایسی جہنم ضرور ہے جس سے ہر انسان کو ہر لمحے ہو کر گزرنا پڑتا ہے گھر میں، بازار میں، دفتر میں، حتیٰ کہ ہمارے خلوت خانوں میں، خیالات اور خوابوں میں بھی ان ہی دوسرے آدمیوں کا عمل دخل ہوتا ہے اور یہ سب کا سب اگر جہنم نہ سہی تو کم سے کم غیر دریافت شدہ دنیائیں ضرور ہیں جن سے ہر قدم پر ہمیں اپنی اندرونی دنیا میں مطابقت اور مناسبت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ سماجی مطابقت کا یہی احساس بیدی کے یہاں نمایاں ہے۔ انسانی زندگی کا اصل انقلاب اس طرز عمل میں مناسب ترتیب و توازن پیدا کرنے کا نام ہے تہذیب کو بعض فلسفیوں نے اندرونی جبلتوں اور خواہشوں کی موزوں ترتیب قرار دیا ہے اور یہ جذبات اور جبلی خواہشات جس قدر حسن و خوبی سے کسی قسم کا ٹکراؤ کے بغیر مرتب اور منظم ہو جائیں گی فرد اسی قدر نیا دہ مہذب، شائستہ اور ذہنی اور نفسیاتی طور پر صحت مند کہا

join eBooks Telegram

جاسکے گا۔ دنیا کے سارے فکری جذباتی معاشرتی اور سیاسی انقلابات کا مرکز ثقل شخصیت کی یہی بڑھا ہوا تواز ن پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

بیدی ہمارے ان ہی نفسیاتی لمحات کے عکاس ہیں۔ اسی لئے ان کا لہجہ مدہم اور آواز دھیمی ہے ان کی کہانیاں دھماکے پر نہیں لطیف سی کھنک پر ختم ہوتی ہیں جو ذہن کے سامنے ایک لکیر سی بناتی گزر جاتی ہے اور چند ایسے احساسات ہمارے چاروں طرف بکھر جاتے ہیں جو سوالات پوچھتے ہیں اور ہمیں اپنے شعور اور اس کی قائم کردہ اقدار کو ایک بار پھر کھنگالنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک تصور کو لیجئے۔ بیدی نے ہندوستانی عورت کے کس روپ کو پیش کیا ہے۔

گرہن۔ چھوکری کی لوٹ۔ بل۔ گھر میں، بازار میں۔ کوکھ جلی۔ ایک عورت۔

لاجونتی۔ اپنے دکھ مجھے دے دو۔ اک چادر میلی سی۔

"اغوا" "حیاتین ب"۔ "دس منٹ بارش میں" کی ریٹا اور "گرم کوٹ" کی شمی کا ذکر یہاں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا کہانیوں میں وہ عورت ہے جو مظلوم ہے جو لٹتی ہے اور لٹ جانا کسی قدر پسند بھی کرتی ہے جو لاجونتی کی طرح دیوی بننے پر بھی راضی نہیں اسے تو وہی مار کھانے والی گوشت پوست کی گرہستن پسند ہے جو "کا جسے لڑ پڑتی اور جل سے مان جاتی" وہ گھر میں بازار میں کی وہ عورت ہے جس میں اور طوائف میں بس رضا کی ایک ہلکی سی لکیر حائل ہے اور جو سارے دکھ لے لینے اور سارے سکھ نچھاور کرنے کو تیار رہے اس کا سب سے زیادہ دردناک پہلو یہ ہے کہ مرد اسے ایک طوائف ہی کے روپ میں دیکھتا رہا ہے اسے اس سے صرف جسمانی نشاط کی توقع ہوتی ہے وہ اس کی روح کے اندر پھوٹتی ہوئی کونپلوں کو نہیں دیکھتا وہ ان کلیوں کو نہیں دیکھتا جو ایثار اور تعمیر و زندگی کی کومل قربانیوں کی فضا میں کھلتی ہیں۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں مدن سب کچھ پاکر بھی جسم اور صرف جسم کا مطالبہ کرتا ہے جب کہ عورت ایک جسم سے کہیں آگے بڑھ کر اپنے سارے وجود کو، حتیٰ کہ اپنی جسمانیات کو اپنے گھر اور مدن کے گھر والوں کے وجود میں کھو چکی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ "ایک عورت" کی ہیروئن اپنے لقوہ زدہ رال ٹپکانے والے .... بچے کے گال پر دیئے ہوئے بوسے کو اپنے رخساروں پر محسوس کر کے شرما جاتی ہے اب وہ ماں ہے جس کی مسرتیں محض جسمانی نہیں جس کا وجود تخلیق نو میں سرایت کر گیا ہے اب وہ نئی کلیوں نئے پھولوں میں بس کر زندہ ہے۔ لیکن مردوں کی دنیا عورت کو اس شہوانی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہے اس کے اندر کا کام دیو نہیں بدلتا وہ صرف جسم کی آگ میں جلتا ہے اور روحانی آتش کدوں کی مقدس آگ میں عورت کو تنہا جلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے اسے اس کے سکھ چاہئیں روپ چاہیئے پھولوں کی سیج اور نشاط کی کلیاں چاہئیں اسی لئے سارے دکھ مول لے

join eBooks Telegram

لینے پر بھی "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی اندو کو چہرے پر پاؤڈر اور گالوں پر روج لگانے کی ضرورت پڑی اور اسی بیباکانہ جذبے کے ماتحت "گرہن" میں گربھ وتی ہولی سے کھتو رام نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا کہ وہ صرف عورت ہونے کو دیکھتے تھے وہ اس ہولی کو نہیں جانتے تھے جو ماں بننے والی ہے اور دن رات گھر کا کام کاج اور گھر والوں کی خدمت کرنے اور گالیاں جھڑکیاں سننے کے بعد میکے ماں باپ سے ملنے سارنگ دیو گرام جانا چاہتی تھی۔ اس سب کے باوجود بیدی کے یہاں عورت باغی نہیں ہے شیو کا روپ ہے جو زہر پی کر سنسار کو امرت دینے پر بھی آمادہ ہے۔

بیدی کے افسانوں کا رنگ و آہنگ او۔ ہنری اور چیخوف کے درمیان کا ہے او۔ ہنری کی کہانیوں کی طرح ان کی کہانیاں محض طنزیہ یا مزاحیہ موڑ پر ختم نہیں ہوتیں اور چیخوف کی سی فکر آلود اور فکر انگیز فضا اور لطیف احساس کے مرغولے ان کی کہانیوں کے اختتام پر قاری کو دیر تک گھیرے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کا فن ہنگامی موضوعات کا ساتھ نہ دے سکا اور اگر ان کی گونج کبھی سنائی دی بھی تو ایک مخصوص انداز میں جس پر ان کی انفرادیت کی مہر ہے۔ یہ انداز احساس کے خلوص اور فکر کی تازگی سے پیدا ہوا ہے۔ بیدی کی کہانیوں میں آراستگی یا جذباتیت کی فراوانی نہیں نہ صنوبر کے سایے ہیں نہ زلف کی گھنیری چھاؤں یہاں انداز بیان سے زیادہ اہمیت ان زاویوں کو حاصل ہے جن سے وہ زندگی کو پیش کرتے ہیں گویا ہر قدم پر کہہ رہے ہوں — "زندگی کو ذرا اس زاویے سے دیکھئے، اس کا نام بھی زندگی ہے۔" اسی لئے افسانے کو تخلیق تو کہا گیا ہے کیونکہ زندگی کی یہ نئی ترتیبِ نو اس کو نئی معنویت بخش دیتی ہے۔

یہ نیا زاویہ کون سا ہے؟ اس ضمن میں دو باتوں پر غور کرنا چاہئے۔ ایک۔ یہ کہ بیدی نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا کس طرح بنا ہے اور خصوصاً ان کہانیوں کے (CLIMAX) یا نقطۂ عروج کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے دوسرے بیدی کی کہانیوں میں سمبالزم اور رمزیت کا استعمال کس طرح ہوا ہے۔

جہاں تک نقاطِ عروج کا سوال ہے بیدی کے یہاں براہ راست نیک اور بد کرداروں کا ٹکراؤ بہت کم ہے۔ "حیاتین ب" اور "گرہن" کے علاوہ شاید ہی کسی کہانی میں ولین کا کردار استعمال ہوا ہو۔ اور گرہن میں بھی وہ بدکردار کھتو رام المیہ کا سبب نہیں ہے اس کا معاون کردار ہے۔ بیدی کی کہانیوں میں بنیادی کشمکش یا تو فرد اور سماج کی ہے جو کبھی کبھی حالات کی شکل میں اور کبھی حالات کی ستم ظریفی کی شکل میں یکے اچانک واقعہ بن کر سامنے آجاتی ہے (مثلاً "رحمن کے جوتے"۔ "ہمدوش"۔ وغیرہ میں) یا پھر فرد کی اندرونی کشمکش ہے جو مختلف تغیر پذیر اقدار و تصورات کے ٹکراؤ کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ ایڈالانش کابیرچاف کے الفاظ میں کہئے:

انسان اپنے دل اور کردار کے متعلق خود نہیں جانتا کہ فلاں وقت میں کون سا جذبہ

کون سا عمل سب سے اوپر جگہ پائے گا۔"

بیدی نے بعض افسانوں میں ناگہانی حادثات سے بھی کام لیا ہے جو واقعات اور کرداروں کو اچانک ایک نیا روپ دے دیتے ہیں اور کہانی کو ایک نیا موڑ بخشتے ہیں لیکن زیادہ تر کہانیوں میں کشمکش تصورات اور اقدار کی ہے نفسیاتی الجھنوں کی خالص داخلی آویزش نہیں ہے۔ بعض کہانیوں میں تصورات و اقدار کا یہ موڑ اتنا تدریجی، ایسا گھٹا ہوا ہے کہ تقریباً غیر محسوس سا ہو گیا ہے۔ بادی النظر میں یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو تا ہے کہ نقطۂ عروج کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کون سے عناصر و عوامل سے اس کی تشکیل ہوتی ہے مثلاً "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں نقطۂ عروج اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تایا جی کی موت کے بعد مدن کا کا ندیا رجلی نکلتا ہے اور اس کا من دوسری عورتوں کے روپ پر لہرانے لگتا ہے اور اچانک اندو کو پتہ چلتا ہے کہ ابھی وہ مدن کو وہ سب کچھ نہیں دے پائی ہے جس کی اسے ضرورت تھی گویا یہاں آویزش مرد اور عورت کے فطری آدرشوں اور نفسیاتی یا جذباتی مطالبات کی ہے یہ محض مدن اور اندو کی کہانی نہیں آفاقی داستان ہے جو آدم اور حوا سے آج تک دہرائی جا رہی ہے "لاجونتی" میں یہ کشمکش سندر کے دل اور دماغ کی کشمکش ہے دل باعصمت اور پاکدامن محبت کا متجسس ہے جس کے دامن کو راون نے چھوا تک نہ ہو اور یہ تصور ہمارے سماج کی دین ہے، تعصبات اور توہمات کا بخشا ہوا ہے دماغ کہتا ہے کہ اگر لاجونتی مغویہ عورت ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں، اور دل میں بساؤ کی تحریک انصاف کی تحریک ہے لیکن دماغ لاجو کو دیوی تو بنا سکا اسے عورت کا روپ واپس نہ دے سکا۔

بیدی کے یہاں زیادہ تر کشمکش جذباتی اور تصوراتی ہے اور اسی وجہ سے ان کی کردار نگاری میں تجرید اور تعمیم کا عنصر نمایاں ہے یہ صحیح ہے کہ ان تصورات اور جذبات کا حالات سے بڑا گہرا تعلق ہے اور حالات کی ایک کروٹ اچانک ایک ہی قدر کو کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے۔ ذاتی مفاد کی لگاوٹ نے "آلو" کی ہیروئن سنتو کو لکھی سنگھ کے الفاظ میں "رجعت پسند" بنا دیا تھا یا "غلامی" میں پولھو رام ریٹائرمنٹ کی زندگی سے اکتا کر دوبارہ دفتر کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی یہ نفسیاتی بے چارگی زندگی میں کسی نہ کسی قسم کی ضرورت کی یہ تلاش الفاظ کے معنی اور اقدار کا روپ بدل دیتی ہے۔ اس قسم کی کشمکش کی بنیاد پر افسانے لکھنے کے لئے انسانی جذبات کی لطیف ترین تہوں تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے ایک ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر سے آگے قدم بڑھا کر باطنی احساس کی رمزیت کو سمجھ سکے۔

بیدی کے افسانے انسان کے باوقار وجود کے متلاشی معلوم ہوتے ہیں وہ باطنی وقار جو مادی اسباب و علل پر بے نیازی کے ساتھ مسکرا سکے جو حالات سے ہم آہنگ تو ہو مگر ان کا غلام نہ ہو جو جرأت اور جراحت کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑا ہو سکے اور اپنی آواز کو پہچان سکے اس کا سب سے زیادہ مثبت اظہار "متھن" میں

join eBooks Telegram

اور میں" میں ہوا ہے جس میں چمبر لال اپنی جیب میں کسی کی چابی کا بوجھ برداشت نہ کر سکا یا "پیر" "من کی من میں"، اور اسی سماجی انصاف، مساوات اور عزت نفس کی جستجو مختلف انداز سے "بیاتیں بیب"۔ "دس منٹ بارش میں"۔ "تلادان"۔ "لاروے" اور بعض دوسری کہانیوں میں ابھری ہوئی ہے انسان عزت نفس کے لئے بے قرار ہے وہ صرف اپنے لئے نہیں ساری انسانیت کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے "کوارنٹین" کا بھاگو اس کی مثال ہے اس کی روح ساری کائنات میں سما جانے کے لئے بے چین ہے۔ اس کی ہمدردیاں عالمگیر اس کی دلچسپیاں آفاقی اور اس کے حوصلے بے نہایت ہیں لیکن اس کی اقدار و تصورات۔ وہ اقدار و تصورات جن کے قائم کرنے کا حق ساری مخلوقات میں انسان اور صرف انسان ہی کو تفویض ہوا ہے۔ یہی اقدار و تصورات اس کے زندان و محبس ہیں اور اس کا ضمیر ان قید خانوں میں زنجیریں پہنے چھوٹا سا علم بغاوت بلند کئے ہوئے ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بیدی کا کینوس زیادہ وسیع نہیں البتہ اس کی گہرائی اتھاہ ہے اس پر رنگوں کی وہ تہیں ہیں جو پورے کینوس کو آفاقی بنائے دیتی ہیں کردار ہمارے آپ کے متوسط طبقے کے ہیں نہ کیڈی لاک اور کلب کے چرچے ہیں نہ پریم چند کی چوپالیں اور دھان کے کھیت ہیں لیکن اس متوسط طبقے کو پورے دور کی ــ کسی قدر طبقاتی رنگ میں ہی سہی ــ نمائندگی کرنے کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔ متوسط طبقے کی کئی پرتوں کو اور کئی سطحوں کو بیدی نے پیش کیا ہے۔ یہاں سندر جیسا سوشل ورکر بھی ہے اور مدن جیسا گندہ بیروزے کا بیوپاری بھی۔ رسالہ "کہانی" کے ایڈیٹر بھی اور دیز خراباتی حلال بھی۔ سیاسی ورکر لکھی سنگھ بھی ہے۔ بیکری کا کاروبار کرنے والے سندر اور سوہن بھی مگر ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ یہ سب زندگی کو یہ قانی اور روحانی آنکھوں سے نہیں دیکھتے حقیقت نگاری آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہ زندگی ایک سنگین اور سنجیدہ معاملہ ہے جس میں الجھی ہوئی شاخوں اور کانٹے دار ٹہنیوں کے بیچ سے چاندکرنیں بکھیرتا ہے۔ اس میں غالب رنگ مٹیالا ہے خوشی اور غم دونوں سے الگ مگر مثبت اور صبر آزما حد تک مثبت۔ اگر بیدی کے کھینچے ہوئے مناظر کو پیش نظر رکھا جائے تو ان پر پیکاسو کی الجھی ہوئی سنگین اور سخت، کسی حد تک کھردری سطح کی تصویروں ہی کا گمان ہوگا ان میں رو بن یا رینائی کی رنگینی اور سرمستی نظر نہ آئے گی۔" اپنے دکھ مجھے دے دو" میں مدن کی بے راہ روی کا بیان ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بنتے ہیں نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور اہرا آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ

join eBooks Telegram

نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لئے تڑپنے لگا
جبھی روشنی کی چوکور لہر ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی
ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔
پیچھے کوئی کتا رونے لگا اور پر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی۔"

بیدی کی زبان کے بارے میں اکثر مختلف شبہات کا اظہار کیا گیا ہے بیدی کا انداز بیان رواں اور شستہ نہیں ہوتا کبھی کبھی ان کی زبان میں ناہمواری بھی آجاتی ہے اور یہ الزامات بہت کچھ صحیح بھی ہیں لیکن پنجاب کی زندگی کی اس قدر بے محابا تصویر کشی دو ایک افسانہ نگاروں کے علاوہ شاید ہی کسی نے کی ہے اور بیدی کی عکاسی فوٹو گرافی کی نہیں بلکہ پنجاب کی تہذیبی روح کی عکاسی ہے بیدی کی نثر سے کوئی شعریت کا مطالبہ نہیں کرتا، ور نہ کرنا چاہیئے کیونکہ بیدی نثر کو آراستگی کے لئے استعمال نہیں کرتے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں ان کی کہانیوں کے بیچ میں سے کسی جملے کی تعریف کرنا یا کسی بیان پر سر دھننا مشکل ہے کیونکہ کہانی کا ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ، کردار، واقعہ، نقطۂ عروج و خم ایک مکمل اکائی کا جزو ہوتا ہے جو ہر لمحہ سننے اور پڑھنے والے کے ذہن، احساس اور نگاہ کو پوری یکسوئی کے ساتھ ایک مرکزی نقطے پر مرکوز کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں الگ الگ ایسے منفرد اور ممتاز جملے بہت کم ہوتے ہیں جو باقی عبارت میں سے ابھر کر خراج تحسین وصول کر سکیں۔ زبان اور بیان کا رنگین نہ ہونا عیب نہیں ہاں اس میں بیدی ذرا احتیاط کی حد سے زیادہ روانی پیدا کر سکتے تھے زیادہ شستگی اور صفائی لا سکتے تھے۔ اس انداز بیان اور زبان میں حقیقتوں کی سنگینی اور توانائی ہے یہ مصوری کی نہیں سنگ تراشی اور خارا شگافی کی زبان ہے جس میں پتھر کی صلابت ہے۔

بیدی کے فن کے بارے میں سب سے اہم اور نمایاں بات یہ ہے کہ اس کا در و بست (ARCHITECTONIC) فن تعمیر کا سا ہے اس کا مزاج علامتی ہے اور اسی علامت و رمزیت کے سہارے سے وہ اپنے فن کی پوری کائنات خشت بہ خشت چنتے ہیں یہ ایسی بات ہے جسے بیدی سے پہلے اور بیدی سے لے کر اب تک کسی دوسرے فن کار نے اردو افسانے میں استعمال نہیں کیا۔ علامتوں سے فن کبھی یکسر خالی نہیں رہا۔ رمزیت سے بھی ہماری شناسائی خاصی پرانی ہے لیکن بیدی نے جس طرح رمزیت اور علامتوں کو مختلف سطحوں پر استعمال کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے اس کی چند مثالیں "دس منٹ بارش میں" "لاجونتی" اور "اک چادر میلی سی" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جب کبھی بیدی کہانی لکھتے ہیں تو وہ محض ایک ہیرو یا ایک ہیروئین کی جذباتی یا نفسیاتی روداد نہیں ہوتی بلکہ اس مرکزی جذبے سے پوری فضا رنگ جاتی ہے مرکوزی تصویر پیڑ پودوں پورب کی ہوا، لہراتی ہوئی شاہراہ

join eBooks Telegram

چھدیہ بدیہ، چاند سورج حتیٰ کہ فطرت کے ہر منظر کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور افسانہ پڑھنے والے کی توجہ بنیادی تصور کے رنگ و آہنگ کی طرف کھینچ لیتا ہے گویا ان کی ہر کہانی بیک وقت ایک اندرونی اور خارجی مطابقت PARALLELISM سے معمور ہوتی ہے ہر مرکزی خیال ایسا مسلّم ہوتا ہے جس کی تال افسانے کی دنیا کی فضا کا ذرہ ذرہ دیتا ہے اور کہانی کا ہر خط جس کے متوازی کھینچا گیا ہے اس لحاظ سے بیدی سے زیادہ محتاط آرٹسٹ ہمارے ہاں کوئی نہیں ہے۔ "اک چادر میلی سی" کے ابتدائی حصے پر غور کیجئے منظر ہی ایسا ہے جو کہانی کے پہلے حصے کی فضا کو خاموش رمزیت کی زبان میں بیان کر دیتا ہے۔

"آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی۔۔۔۔ آج آسمان کے کوٹھے میں کسی
بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے تلوکے
کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے
تھے ڈبو منہ اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا ــــ"

ان ابتدائی جملوں میں ہی لوتے ہوئے سمبل استعمال کئے گئے ہیں سورج کی ٹکیہ کی سرخی ہی بتا دیتی ہے کہ تلوکے کا قتل ہونا ہے اور اس کے خون کے چھینٹے جس طرح بکائن پر پڑے ہیں اسی طرح رانی پہ پڑیں گے اور رانی پر ہی کیوں گھر بھر پہ۔ جینوں پہ بھی منگل پر بھی ۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار بھی سمبل ہی ہے جو رانی کی زندگی کا مظہر بن گئی ہے۔ جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے اس کے بعد کتے ڈبو کا رونا بھی اسی قتل کی طرف اشارہ کرتا ہے غرض کہ پوری فضا سمبالک ہے اور اس کا کلیدی واقعہ بن جاتا ہے تلوکے کا قتل

کبھی کبھی وہ ایک واقعے کو پس منظر بنا دینے اور سمبالک فضا پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں گرہن میں راہو اور کیتو کا چاند پر حملہ آور ہونا پھر گرہن کے موقعے پر لوگوں کا اشنان کرنا دان دینا اور دان لینے والے بدکاریوں کی "چھوڑ دو۔ چھوڑ دو دان کا وقت ہے" کی صدائیں ــــ یہ سب کچھ ہولی کی بپتا کے متوازی استعمال ہوا ہے اور اس کی مظلومیت کو اور زیادہ دردناک بنا دیتا ہے۔

اس خاموش سمبالزم اور ان متوازی خطوط کی اہمیت کیا ہے؟ یوں تو بنیادی طور پر یہ سوال تکنیک کا ہے لیکن اب جمالیات کا یہ ایک عام اور مسلّمہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ لذتِ احساس حقیقت سے زیادہ تخیل میں ہے اور پڑھنے یا دیکھنے والوں کو لطیف اشارات کی مدد سے اپنے تخیل سے کام لے کر داستان کے کچھ گوشے خود مکمل کرنے پڑیں تو لذت کا احساس کہیں زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ داستان کی تشکیل میں پڑھنے والے کا تخیل بھی کسی قدر شامل ہو جاتا ہے اسی لئے بعض فن کاروں نے ابہام کو بڑی چابک دستی سے برتا ہے بیدی کے یہاں ابہام نہیں ہر بات واضح اور بھرپور بنایا ہے مگر پڑھنے والے کے ذہن کو مرتعش اور متوازی خطوط کی تلاش میں ایک گونہ لذت ملتی ہے اور کہانی کا جمالیاتی تاثر دو چند

join eBooks Telegram

ہوجاتا ہے اور اسے بیدی نے فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

آخر میں اس ناگزیر سوال پر غور کرنا ضروری ہے کہ بیدی کا اردو افسانہ نگاروں میں کیا مقام ہے؟
فکر کے اعتبار سے بیدی کے افسانے انسانی شخصیت کے لطیف ترین گوشوں کے نازک مطالعے ہیں اس آئینہ خانے میں انسان اپنے سچے روپ میں نظر آتا ہے اور بیدی اس کے سطح کی تہوں کو ہٹا کر اس کے کمزور لمحوں میں اسے بے نقاب ہوتے دیکھ لیتے ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیدی کے افسانے محض نفسیاتی مطالعے یا تحلیل نفسی کی کیس ہسٹری (CASE HISTORIES) نہیں ہیں بلکہ جذبات کی رو اور گداز سے معمور، بصیرت کی تابانی سے روشن ایسے فن پارے ہیں جن سے فرد کی شخصیت کے لطیف گوشے ہی سامنے نہیں آجاتے بلکہ فرد اور سماج کے پر پیچ رشتے اور انسان کی شخصیت کے دلچسپ اور پراسرار تانے بانے پر روشنی پڑتی ہے۔ زندگی کی زیادہ بامعنی، زیادہ بلیغ زیادہ خیال انگیز اور فکر خیز تشکیل سامنے آتی ہے۔ جس میں احساس کا گداز بھی شامل ہوتا ہے اور فکر کا تجسس اور تجزیہ بھی۔

تکنیک کے اعتبار سے علامتی رمزیت اور تہ داری کا استعمال جس طرح بیدی نے کیا ہے اس نے اردو افسانے کو ایک نئی منزل پر پہنچا دیا ہے ابھی تک اردو افسانے کو اتنا محتاط آرٹسٹ نہیں ملا تھا لفظ کا رنگ اور نغمہ سمجھنے والے تو بہت سے تھے اور اب بھی ہیں لیکن لفظ کو لفظ سمجھنے والے معدودے چند ہی فن کار ہوتے ہیں بڑے سے بڑا آرٹسٹ بھی کبھی کبھی نمائشی آب و رنگ WINDOW DRESSING کے لالچ میں پھنس جاتا ہے اور غیر ضروری طور پر اپنے فن پارے کو یا انداز بیان کی خوبصورتی یا کسی قسم کی سستی لذت یا آرائش سے سجا کر اس میں دلکشی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ منٹو جیسا بات کا کھرا اور قلم کا سچا فن کار بھی کبھی کبھی جنسی عنصر کو افسانوں میں دلچسپی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ بیدی کے یہاں یہ کمزوری بہت کم ملتی ہے۔ بیدی نے مذاق عام کے پست پہلوؤں سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے ان کے ہاں نمائشی پہلو ہمارے تمام افسانہ نگاروں میں سب سے کم ہے۔ وہ نہ اپنی ذات میں اسیر ہوتے ہیں نہ مذاق عام اور قبول عام کے لالچ میں۔ زندگی کی ایسی بے کم و کاست عکاسی جو رومان کی رنگ آمیزی اور قنوطیت یا دل دوز ظلمت پرستی دونوں سے مغلوب نہ ہو بیدی ہی کا حصہ ہے اور اس سلسلے میں بیدی کے افسانے منٹو سے بھی زیادہ دور تک قطعی اور حقیقی ہیں۔

بیدی کے کرداروں میں کامیاب کردار بہت سے ہیں لیکن ابھی تک ان کے قلم نے کوئی خوجی کوئی امراؤ جان کوئی لیلی پیدا نہیں کی ہے۔ گو لاجونتی اندو اور رانی اس منزل کی طرف کئی قدم آگے بڑھ گئی ہیں۔ یہ ایک عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ بیدی کے نسوانی کردار دوسرے تمام کرداروں سے زیادہ توانا اور فنی اعتبار سے بالیدہ ہیں لیکن ہمارے دور میں وہ ایسے دو تین افسانہ نگاروں میں سر فہرست ہیں جن کے قلم سے کسی غیر فانی کردار کی تخلیق کی توقع کی جا سکتی

join eBooks Telegram

ہے ان کے پاس بصیرت بھی ہے اور سماجی پس منظر کا احساس بھی بیان کی قدرت بھی ہے اور کردار نگاری اور اس کی تہ در تہ پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی، اس لئے ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی عظیم کردار ان کی تخلیق ہوگا۔

بلا شبہ بیدی ہمارے عہد کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں شمار کئے جائیں گے اور ان کے مدھم لب و لہجہ، ان کی تہ داری، رمزیت، ان کی طرحداری اور خلوص کی کھنک ایک زمانے تک اردو دنیا کے کانوں میں گونجتی رہے گی اور اردو افسانے کو راہ دکھاتی رہے گی۔

"بیکراں" اور "ستاروں سے ذروں تک"
کے بعد
جگن ناتھ آزاد کا نیا مجموعۂ کلام

نوائے پریشاں

شائع ہو گیا ہے جس میں آزاد کی وہ تمام نظمیں شامل ہیں جنہوں نے چند برس کی مدت میں آزاد کی شہرت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا مثلاً دہلی کی جامع مسجد بھارت کے مسلمان، راوی کا سماں یاد آ گیا اور افسانۂ آں شبے کہ بایار گزشت وغیرہ۔

اس کے علاوہ اس نئے مجموعۂ کلام میں آزاد کی نئی غزلیں اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ اس مجموعہ کو ہم نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

قیمت:- تین روپے آٹھ آنے

ادارۂ انیسِ اردو۔ ہیوٹ روڈ چوک الہ آباد

join eBooks Telegram

باقر مہدی

بھولا سے بل تک

(راجندر سنگھ بیدی کے نگار خانے میں)

ورجینا وولف نے اپنے ایک تبصرے میں کہانی کی یوں تعریف کی تھی۔

"کہانی ایک عورت ہے — ایک ایسی عورت جس نے جانتے ہوئے، جانے کیسے اپنے کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اکثر یہ خیال اس کے چاہنے والوں کے ذہنوں میں آتا ہے۔"

راجندر سنگھ بیدی کی کہانیاں پڑھتے وقت اس خیال میں تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہیے" نہ جانے کیسے" پہلے جانتے ہوئے" کا ٹکڑا اور بھی معنی خیز بن جاتا ہے۔ یہ بات یوں بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ جب بھی "اصلی کہانی" کا آغاز ہوا ہوگا تو انجام کو "جانتے ہوئے بے خبری" کے جذبے نے اس میں کہانی پن کا طلسم "پیدا" کر دیا ہوگا۔ جب ہی تو شجر ممنوعہ کے پھل کھائے گئے اور اس طرح دنیا پر "آدمی" نے پہلا قدم جنت ہی میں رکھ دیا تھا۔ اس "پہلی کہانی" کی کتنی ہی داستانیں ملتی ہیں اور ان میں قدر مشترک اسی جذبے کی تفسیر ہے کہ "جانتے ہوئے نہ جانے کیسے" — اور یہیں سے کہانی شروع ہو جاتی ہے۔

بیدی نے جب اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا تو اس وقت اردو میں گنتی کی چند اچھی کہانیاں تھیں اور یہ ایک نئے فنکار کے لئے سب سے اچھی تخلیقی فضا تھی۔ جس میں وہ اپنی پسند کے نقش و نگار بنا سکتا تھا کیونکہ مقابلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ نقادوں کے تیز قلم اپنی نوکِ زبان پر دھار کے آنے کے خیال تک سے غافل تھے، ٹیگور اور پریم چند ہندوستانی ادب کے دو مشہور پرچم فضا میں لہرا رہے تھے۔ زندگی اور ادب کے تعلق پر بحث کا آغاز اختر رائے پوری کے پہلے طویل مقالے سے شروع ہو گیا تھا دوسری طرف سیاسی معنوں میں قومی آزادی کی جدوجہد آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔" رنگارنگ سماجی سیاسی اور ادبی پس منظر میں اردو کے نئے افسانے کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزی افسانہ نگاروں (خاص کر ناول نگاروں) کے اثرات کے ساتھ ساتھ روسی افسانہ نگاروں کا اثر بھی شامل ہو چلا تھا۔

join eBooks Telegram

بیدی نے یہ سب کچھ دیکھا، مشہور کتابیں پڑھیں - اور اپنی زندگی کے روز و شب میں ایک فنکار کی حیثیت سے سوچا کہ "میں کیا کروں" - یہ سوال یوسف کو بھی پریشان رکھتا تھا۔ (ملاحظہ ہو اقتباس جن کا مضمون جو ذیل پانچ نئے مصنفین کے مضامین کے مجموعہ میں شامل ہے) اتنے بے شمار و اہم موضوعات سے نظریں ہٹا کر انھوں نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی تو انھیں خیال آیا کہ "میں اپنے قریب ہی کے بارے میں لکھوں گا" اور یہ سوچ کر جو انھوں نے طے کیا تھا وہ اس پر آج تک قائم ہیں۔ بلکہ حقیقت نگاری کے انتخاب کے ساتھ انھوں نے تخیلی نقطۂ نگاہ کو بھی چن لیا۔ اس بات کا ذکر انھوں نے خود "گرہن" کے دیباچہ میں کیا ہے۔

"لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفسِ مضمون کا محض ظاہری پہلو ہوتا ہے۔ یہاں تک تو مشاہدے کا تعلق تھا اس کے بعد میرے تخیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو تلاش کر لیا۔ ذہن اور تحریر دونوں آپس میں یوں گھل مل گئے کہ مجموعی طور پر ایک تاثر کی صورت اختیار کر لی۔ علیٰ ہٰذا القیاس!" (۱۰ر مارچ ۱۹۴۲ء)

اس طرح بیدی نے اپنی حقیقت نگاری کو شروع سے نیچرل ازم سے بچائے رکھا۔ یہی نہیں بلکہ ایک اچھے فنکار کی طرح اپنے فن کی بنیاد مشاہدے اور تخیل کے سنگم پر رکھی۔ اور یہ رویہ شعوری طور سے اختیار کرنا، ایک ایسے دور میں جبکہ حقیقت نگاری، نیچرل ازم کے دائرہ میں مقید تھی، یقیناً ایک جرأت سے کم نہیں تھا۔ اس وقت حُبِّ وطن کے نام پر جو ادب تخلیق ہو رہا تھا اس کے پیشِ نظر بیدی نے اپنے افسانوں کا مرکز جانی بوجھی ہوئی چیزیں، دیکھے بھالے ہوئے رنگ، محسوس کئے ہوئے جذبات کو قرار دیا۔ ظاہر ہے آج حُبِّ وطن اور اس دور کا بیشتر ادب محض تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت کے نقاد نے اکثر کو رد کر دیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ سردار جعفری کا ترقی پسند ادب، اسی کو اچھا ادب سمجھتا ہے)

علاوہ جس تحریک نے اردو ادب میں سب سے زیادہ غلغلہ اٹھایا یعنی ترقی پسند تحریک، اس میں بھی بیدی ضم ہو کر نہیں رہ گئے۔ وہ ان فنکاروں میں ہیں جو تحریکوں کے سہارے پروان ہی نہیں چڑھتے چہ جائیکہ اس کے ہو کر رہ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کے افسانوں میں اس عہد کی ترقی پسندی کا اظہار تو کجا کہیں شائبہ بھی نہیں ملتا۔ تحریک کے مقاصد کو معقول سمجھتے ہوئے بھی اپنے قلم کو اس کا ترجمان بننے نہ دینا ایک ایسی خلاقانہ انفرادیت کو جنم دیتا ہے جو آرٹ کو اپنے رنگ روپ میں محسوس کرتی ہے۔ اسی انفرادیت سے بیدی کے فن کا خمیر اٹھا ہے۔

---

* "دانہ و دام" میں بیدی کا پہلا افسانہ آج بھی اس انفرادیت کا ہلکا سا اشاریہ معلوم ہوتا ہے "بھولا"

join eBooks Telegram

ایک ایسے معصوم بچے کی کہانی ہے جسے کہانیاں سننے کا بڑا شوق ہے۔ اپنی افسانہ نگاری کا آغاز بھی بیدی نے کسی بڑے ڈرامائی انداز یا "اہم موضوع" کو لے کر نہیں کیا تھا۔ بجد معمولی سی بات میں افسانویت پیدا کرنے کی کوشش نے اس افسانے کو کامیاب بنا دیا تھا۔ بھولا ایک بار اپنے نانا سے دن میں کہانی سنتا ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ نانا بھولا کے اصرار پر اُسے کہانی سُنا دیتے ہیں اور پھر واقعی بھولا کے ماموں راستہ بھول جاتے ہیں اور آخر بھولا سب لوگوں کے سونے کے بعد انھیں ڈھونڈنے جاتا ہے۔ اس طرف گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ اُسے کوئی اٹھالے گیا ہے مگر کچھ دیر کے بعد وہ اپنے ماموں کے ساتھ گھر میں واپس آجاتا ہے۔ یہ ایک بچے کے بھولے پن کی ہی کہانی نہیں ہے بلکہ انسان کی اس بنیادی خوبی کی کہانی بن جاتی ہے جو "بھٹکے" ہوئے کو راہ دکھلانے کے جذبہ میں مضمر ہے۔

دانہ ودام کی بیشتر کہانیوں میں "بچہ" کسی نہ کسی روپ میں ہر جگہ موجود ہے اور اس کا سایہ تو کتنے ہی بڑی عمر کے کرداروں پر بھی پڑتا ہے۔ بیدی نے بچہ کو اپنی کہانیوں کا اہم جزو بنا کر اس کو ایک سمبل کی طرح استعمال کیا ہے جو سب سے اچھی طرح ان کی کہانی "بل" میں ملتا ہے (جس کا ذکر آخر میں آئے گا)

من کی من میں "کا کردار مادھو بھی ایک بڑا بچہ ہے اس کے بارے میں افسانہ نگار کا کہنا ہے کہ ——

"تمہارا باپ ایک سو بیالیس گھنڈیوں والا جال لے کر رام تلائی یا شاہ بلور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا صرف جونکیں تھیں۔ ایک ننھا سا مینڈک عمر وجولاہے کے گھر کے سامنے روئی کے گلے پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ برسات کی خوشی میں گا رہا تھا۔ وہ تم نہیں تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔"

اور یہی مادھو اپنی معصومیت کی وجہ سے بڑا ہو کر بھی گاؤں والوں کے مذاق کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ یوں بھی سیدھے سادے اور شریف (شرافت کے معنوں میں) میں اکثر اپنی انھیں خوبیوں یا خصوصیات کی وجہ سے لوگوں کے "جذبہ احساسِ جرم" کا ہدف بنتے رہتے ہیں۔ اور جب مادھو کا لوگ مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ——

"کبو بھئی مادھو — من کی من میں رہی"۔ تو بھی وہ "ہاں" میں جواب دے کر رہ جاتا مگر اس کی معمولی شخصیت میں ایک اور خوبی کا پہلو تھا۔ وہ دوسروں کے کام کر کے خوش ہوتا تھا اور اس کی بیوی کلکارنی اسی لئے خفا رہتی تھی۔ اور جب مادھو گلاب گڑھ میں ایک بیوہ امبو کی مدد کرنا شروع کرتا ہے تو لوگوں کو اس "قصے" میں اور ہی مزہ آتا ہے۔ اس کی بیوی بھی بہت خفا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک تیوہار کے موقع پر اپنی بیوی سے بتیس روپے لے کر امبو کی مدد کرتا ہے کیونکہ ساہوکار نے اُسے بجد پریشان کر رکھا ہے ادھر بدگمان بیوی بجد خفا ہو جاتی ہے اور جب وہ دیر سے رات کو اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو دروازہ نہیں کھولتی۔ سخت سردی کی وجہ سے مادھو بیمار پڑ جاتا ہے اور جب پچھتا کر کلکارنی اس کی خدمت شروع کرتی ہے تو وقت آچکا ہے۔ مادھو مر جاتا ہے اور اس کی یہ بات یاد رہ جاتی ہے۔

join eBooks Telegram

کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر جھٹ سے مدن اندر ہی کے ہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے۔"

یہ انسانی برادری کا جذبہ ہرگز اوپری نہیں بلکہ بیدی کے کردار اس میں رچے بسے ہیں، یہی ان کی زندگی کی جان معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں جیسا کہ افسانہ نگار کہتا ہے "سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو وہ خود دینے سے ہچکچاتی ہے اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے"۔ اسی لئے بیوہ عورت کی مدد کر کے مادھو تو مر جاتا ہے لیکن یہ اثر چھوڑ جاتا ہے کہ اچھے سیدھے لوگوں کی کہانی میں زیادہ پیچ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا پہلو ہوتا ہے جو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"گرم کوٹ" بیدی کا بہت مشہور افسانہ ہے۔ یہ تقریباً پچیس سال پہلے لکھا گیا تھا اتنی مدت کے بعد آج اس کو پڑھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ اس کی شہرت میں اس وقت کی رو سے الگ طرح کی جو حقیقت پسندی ہے۔ وہی سبب بنی ہوگی۔ آج اس کلرک کی کہانی جو گرم کوٹ کیلئے بہت پریشان تھا اپنی ندرت کھو چکی ہے پھر بھی ایک معمولی کلرک کی زندگی کے چکر میں گرفتار شخص کا دلچسپ تجزیہ ہے۔ اس "غریب" کلرک کے لئے دس روپے ایک "طلسماتی دنیا" کی کلید بن جاتے ہیں۔ اور وہ جب اپنے گرم کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا چاہتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ اپنی شمی اور بچوں کے لئے چیزیں لانا چاہتا ہے۔ قلیل آمدنی اور اس میں گذر بسر، یہ معمولی مگر اہم مسئلہ ہی اس کی زندگی کا محور بن جاتا ہے اس میں ایک کلرک کا کردار، اس کی خواہشات، اور پھر گھر سے دفتر تک کی زندگی والی ذہنیت کے ساتھ بیوی بچوں سے پیار۔ یہی کردار کلرکوں کا ایک نمائندہ کردار بننے کے بجائے ایک کلرک ہی رہتا ہے اس لئے کہ بیدی نمائندہ کرداروں کی کھوج میں نہیں رہتے بلکہ جیتے جاگتے ایسے کردار پیش کرنے پر ہی قانع ہیں جو اپنی زندگی کے مسائل خود حل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اس کشمکش سے ان کی شخصیت پروان چڑھتی ہے اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

"چھوکری کی لوٹ" شادی بیاہ کی رسم پر جہاں طنز کرتی ہے وہاں اس بات کا اظہار بھی کرتی ہے کہ یہی ہوتا آیا ہے یہی ہوتا رہے گا۔ پرسادی اپنی بہن رتنی سے بہت محبت کرتا ہے وہ اس کی بہن ہی نہیں ہے بلکہ دوست بھی ہے اور جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ تنہا تنہا محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب رتنی چند روز کے لئے واپس آتی ہے تو وہ پھر خوش ہو جاتا ہے اور پھر اس کے جانے کے بعد وہ سمجھتا ہے رتنی اپنی خوشی سے گئی ہے اور لڑکیاں اپنی لوٹ پسند کرتی ہیں۔ اس میں ایک بچے کی اس نفسیاتی کیفیت کا اچھا بیان ہے جو بڑا ہونے سے پہلے ہی اپنے دوستوں کو چھپتے ہوئے دیکھتا ہے اور پرسادی کی اپنی بہن کا چلا جانا صدمہ سے ایک طرح کی رسم بن جاتا ہے۔ بیدی کی نقاشی ہیں لکیریں روزمرہ کے رنگ اور معصومانہ فقروں پر مشتمل ہوتی ہے ان فقروں میں جا بجا طنز کی چاشنی اور مزاح کا تیکھا پن ایک دلنشین تاثر چھوڑتا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری میں یہی خوبی ہے کہ معمولی سی بات سے وہ کہانی کی فضا میں ایسی لرزش پیدا کرتے ہیں کہ ڈرامائی کیفیت آجاتی ہے "کوارنٹین" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس میں خاکروب

join eBooks Telegram

بھاگو کا کردار بھی ایک ایسے حوصلہ مند انسان کی شخصیت پیش کرتا ہے جو بڑے بڑے مشہور لوگوں میں نہیں ہے اس کردار میں بھی وہی بنیادی جذبہ کارفرما ہے کہ دوسروں کی خدمت ہی زندگی ہے۔ وہ پلیگ سے نہیں ڈرتا۔ دن رات صفائی کرتا رہتا ہے۔ جہاں ڈاکٹر بھی جاتے ڈرتے ہیں وہ وہاں صرف جاتا ہی نہیں ہے بلکہ مریض کی ہر طرح سے خدمت کرتا ہے۔ اس میں وہ آدمی چھپا ہوا ہے جو بحران اور شدید پریشانی کے عالم میں کبھی کبھی جاگ اٹھتا ہے پھر اچھے اچھے بہادر اس سے چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کہانی میں بیدی نے ایک بڑا ڈرامائی سین بھی رکھا ہے۔ کوارنٹین میں روز کتنے ہی لوگ مرتے تھے اور ان کو ایک ساتھ ہی جلا دیا جاتا تھا۔ ایک بار ایک مریض کو مُردہ سمجھ کر پٹرول چھڑک کر جلایا گیا تو وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا یہ دیکھ کر اسی نوعیسائی ولیم بھاگو نے جلتی ہوئی آگ سے اُسے اٹھالیا۔ اس کا ہاتھ بھی جھلس گیا مگر اس نے پرواہ نہ کی۔ وہ اپنی یہ روداد جب ڈاکٹر کو سناتا ہے تو ڈاکٹر پوچھتا ہے "پھر کیا ہوا—؟"

"بابوجی وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا جس کی نیکی اور شرلیفی (شرافت) سے دنیا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اتنے درد و کرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا شکریہ ادا کیا—

"اور بابوجی" بھاگو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "اس کے کچھ عرصے بعد وہ اتنا تڑپا اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کے بعد وہ مرگیا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں۔ اُسے اسی وقت جل جانے دیتا۔ اُسے بچا کر میں نے اسے مزید دکھ سہنے کے لئے زندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں اب انہی جلے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اُسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں۔"

یہاں بیدی نے اس جذبے کی بڑی بیباکانہ ترجمانی کی ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ بچانے کا اور اس کا دوسرا رُخ۔ غم سے نجات دلانے کی کوشش میں جذبۂ تاسف۔ بھاگو بے اختیار اس مریض کو بچانا چاہتا ہے اور اپنی کوشش کے باوجود ناکام رہتا ہے۔ اس کی ناکامی ہی کی وجہ سے تاثر شدید ہو جاتا ہے اور بھاگو کا کردار آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک دم سے بڑا ہو جاتا ہے —— اور پھر کہانی ایک اور موڑ لیتی ہے جو اس کہانی کا نقطۂ عروج ہے۔ بھاگو کی بیوی بیمار پڑ جاتی ہے اس کے باوجود وہ کوارنٹین میں کام کرنے جاتا ہے اور جب وہ رات کو آکر اپنی بیوی کی حالت غیر دیکھتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کی شخصیت اس کے مقابلہ میں اب کمتر نظر آنا شروع ہو جاتی ہے وہ بھاگو کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ مگر وہی جذبۂ تاسف پھر ابھر آتا ہے اور وہ بھاگو کی بیوی کو دیکھنے جاتا ہے مگر اس کی کوشش ناکام رہتی ہے —— اس واقعہ کے بعد بھی بھاگو اسی طرح کوارنٹین میں کام کرتا رہتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بھی بڑی مستعدی سے کام کرنے لگتا ہے۔ آخر کار پلیگ کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور شہر میں بڑی دھوم دھام سے ڈاکٹر کے اعزاز میں جلسہ ہوتا ہے کیونکہ دنیا کی نظر میں ڈاکٹر ہی نے یہ معرکہ سر کیا ہے

join eBooks Telegram

جلسہ ختم ہوگیا اور جب ڈاکٹر گھر پہنچا تو بھاگو بھی ملنے آیا۔

"بابوجی۔ بہت بہت مبارکباد"

اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت رہی پرانا جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منڈا سا کھول دیا میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

"تم ہو! بھاگو۔ بھائی" میں نے بمشکل تمام کہا "دنیا تمہیں نہیں جانتی۔ بھاگو تو نہ جانے، میں تو جانتا ہوں تمہارا یسوع تو جانتا ہے۔"

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھنچ گئی۔ لتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر ناشناس دنیا کا ماتم کرنے لگا۔"

اس کہانی کا تفصیلی ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ میری رائے میں "دانہ و دام" کی سب سے اچھی کہانی "گرم کوٹ" نہیں۔ اس میں ایک بے نام (اس لئے کہ بھاگو ایک طرح کا بے نام ہی تو ہے) کردار کی شخصیت نامور سے صرف بلند اور بہتر ہی نہیں ہے بلکہ معمولی آدمی کی بڑائی کی ترجمان ہے جس کو "غریب شہر" کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہانی اپنی ڈرامائی فضا، اچھے مکالمے اور موت و زلیست میں گھرے ہوئے دو کرداروں کی کشمکش میں وہ چمک دمک بھر دیتی ہے کہ جس کا تاثر دیرپا ہے۔ دیرپا اس لئے کہ اس کو لکھے ہوئے بھی ایک زمانہ گذر گیا ہے اور آج بھی یہ پُر اثر ہے۔

اس مجموعے کی ایک اور کہانی آج بھی قابلِ مطالعہ ہے "دس منٹ بارش میں"۔ بیدی نے اس کہانی میں فلسفیانہ افکار کی ایسی آمیزش کی ہے کہ وہ ایک خلش بن کر دل میں رہ جاتے ہیں۔ "بہت تیز پانی برس رہا ہے۔ سب بھیگ رہے ہیں، راتا بھی بھیگ رہی ہے۔" راتا کو اس کا شوہر بے کاری سے تنگ آکر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ افسانہ نگار کے ایک جملے میں طنز بھی ہے اور صداقت بھی — "وہ اس سے محبت کرتی ہے اور جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو وہ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔"

یہ افسانہ بھی جزئیات نگاری کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ غریب کسان اپنے مریل بیل کو لئے ہوئے آیا ہے اور پھر بیل تھوڑی دور چل کر مر جاتا ہے۔ راتا کی گھوڑی بھیگ رہی ہے اس کا کاہل لڑکا مرے سے اپنی ماں کی گالیاں سنتے ہوئے بھی لیٹا ہوا ہے اور پھر راتا بارش سے تنگ آکر باہر دیکھتی ہے۔ میں نے کہا۔ "یہ بارش کا دامن کیا اس کے لئے کم ہے۔ راتا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں۔ جب کسی انسان پر عزت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں — تو خود بخود ایک بہت بڑا دامن کھل جاتا ہے۔"

اور یہ افسانہ اپنا ایک الگ ہی تاثر رکھتا ہے۔ سب چیزیں بھیگی ہوئی ہیں سب کچھ ڈوب رہا ہے

join eBooks Telegram

اور جیسے سب کچھ دھل جائے گا۔

یہ بیدی کے ابتدائی افسانے ہیں ان میں کہیں کہیں جذباتیت کی زیادتی، چابکدستی کی کمی اور کچے پن کا احساس ہوتا ہے مگر ان میں سب سے بڑی خوبی وہ ہے جو سچے آرٹ کی جان کہلائی جاتی ہے۔ یعنی دلی خلوص کا فنکارانہ احساس۔ اور اس خوبی نے معمولی "خامیوں" کو ابھرنے نہیں دیا ہے۔ یہی نہیں بیدی کا فن اسی کی بنیاد پر سربلند ہوا ہے۔ جس کی عمدہ مثالیں "گرہن" کے افسانوں میں جابجا ملتی ہیں مختصر مکالمے کرداروں کی اپنی زبان سے یوں ادا کئے جاتے ہیں کہ فطری حسن کے ساتھ شخصیت (کردار کی) کا اظہار بھی ہوتا رہے۔ جزئیات نگاری میں سب سے سخت مرحلہ انتخاب کا بہرحال ہوتا ہے۔ معمولی، بے بضاعت چیزوں، بے نام چہروں کے کردار، روزانہ کی بے کیفی اور بظاہر بے معنی کشمکش کے انبار سے چننا ایک مشکل امر ہی نہیں بلکہ بڑی جرأت مندانہ کوشش ہے اور اکثر بیدی ان چیزوں کے انفصال سے ایک خوبصورت افسانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے وہ "نگاہِ پُرفن چاہیئے جو پتھروں میں "صنم نو" کی دھڑکنوں کا اندازہ لگا سکے اس کے بعد بھی تلاش ختم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اصل امتحان تو ان کی تراش و خراش کا ہے اس "بت تراشی (ٹکنیک) میں اردو میں بیدی کا کوئی دوسرا ہم سر نہیں ہے۔

بیدی کے افسانوں میں عورت کا کردار ایک مرکزیت کی حیثیت رکھتا ہے وہ خوابوں کا سرچشمہ اور تعبیر نہیں۔ جیساکہ رومانی افسانہ نگاروں کا خیال ہے بلکہ ایک "نامیاتی حقیقت" ہے اس کے روپ بے شمار سہی مگر گھوم پھر کر وہ "ماں" ہی رہتی ہے۔ اس کی نگاہوں کے افسوں، تبسّم کے پھولوں اور خطوط میں جو دلکشی عیاں اور پنہاں ہے اس میں ایک طرح کا کرب مضمر ہے۔ یہ درد و کرب تخلیق کا "رازِ سربستہ" ہے اور اس کی زندگی کی دھوپ چھاؤں کی ساری دلفریبی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اُسے دوسروں کے دکھ اپنانے ہی میں زندگی کا آنند ملتا ہے۔ مردوں کے بنائے ہوئے سماج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی بے زبان شخصیت میں وہ جادو ہے جو جبار اور ظالم کو ٹھکرا دیتی ہے یہ الگ بات ہے کہ --- ۔۔۔ کوئی اس کا اعترافِ نہ کرے۔ بیدی عورت کے اس پہلو کو اجاگر کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔

ہولی کا کردار ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو معاندانہ کی دم گھٹا دینے والی زندگی سے عاجز آچکی ہے جسے ایک انسان نما جانور سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی۔ اُسے تو اتنا بھی پیار نہیں ملا جتنا کہ محبت کی ایک نظر میں ہوتا ہے۔ گرہن ایک تہوار سے کہیں زیادہ زندگی پر چھائی ہوئی سیاہی کا سمبل بن جاتا ہے۔ اس کا شوہر رسیلا اُسے بات بے بات پر مارتا رہتا ہے۔ اس کی ساس طعنے دے دے کر اُسے تنگ کر چکی ہے اور اس کے بچے بے جان کھلونے بھی نہیں ہیں

join eBooks Telegram

جن سے دل بہل سکے اور جب وہ گھبرا کر مجمع میں گم ہو کر اپنے میکے بھاگنا چاہتی ہے تو اور بھی پریشانی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ایک غار سے دوسرے غار میں۔ گھیسو رام اپنے "ٹکا" رکا بھائی "بن کر بھی حاملہ بھولی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اور وہ بھاگتی ہے مگر کہاں جائے، کیا کرے؟ شاید صرف بھاگتے ہی میں کوئی نجات کا راستہ نکل آئے ۔ بیدی نے عورت کی زندگی کا سارا درد، اس کی مظلومیت، اس کی بے پناہ مجبوریوں اور لاچاریوں کے سارے جوہر کو بھولی کے کردار میں سمو دیا ہے۔

جب ہی تو یہ کردار نچلے طبقے کی ہندوستانی عورت کی جیتی جاگتی تصویر بن گیا ہے۔ یہ افسانہ بیدی کے فن کی پختگی کا اعلامیہ بن گیا تھا ۔ جب کسی کتاب کا پہلا افسانہ ہی اتنا معیاری ہو تو قاری اور ناقد دونوں کی توقعات بہت بڑھ جاتی ہیں۔ بیدی بڑی سنجیدگی اور لگن سے ان توقعات کو پورا کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہی ایک سچے فنکار کی پہچان ہے۔

اور عورت کا ایک روپ اور بھی تو ہے وہ بیوی بن کر بھی زندگی کی جبلتوں سے لپٹی رہتی ہے جیسے اُسے بغیر پڑھے ہوئے یہ علم ہے کہ زندگی کا چکر چلتے چلتے اسی مرکز پر آ کر رکتا ہے۔ "آلو" کی جنتو اس راز سے واقف ہے۔ اس کا انقلابی شوہر لکھی سنگھ جب آلو تک لانے سے مجبور ہو جاتا ہے تو بھوک کی ماری عورت اس کے "انقلابی کامون" پر ایک ایسا سوالیہ نشان لگا دیتی ہے کہ وہ جواب تک نہیں دے پاتا۔ صرف یہ سوچتا ہے۔

"کیا جنتو رجعت پسند ہو گئی ہے؟"

"گھر میں بازار میں" ودشی کا کردار ایک اور ہی پہلو کو پیش کرتا ہے یہ متوسط طبقہ کے خوشحال خاندان کی پروردہ ہے اُسے پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی وہ اپنے پتاجی کے کوٹ سے اپنی ضرورت کے لئے پیسے لے لیتی تھی اس کی یہ عادت اس میں برابری کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے وہ اپنے شوہر سے مانگنا توہین سمجھتی ہے اور پھر ایک صبح اس کا شوہر رتن آ کر اُسے ایک واقعہ سناتا ہے کہ کیسے ایک بازاری عورت اپنے گاہک کا دامن پکڑے چلا رہی تھی کہ مجھے اور پیسے دو۔ اور یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگتا ہے۔

"ودشی نے سر سے پاؤں تک شعلہ بنتے ہوئے کہا۔ وہ پاپی پاجی آدمی ہے کمینہ ہے اور وہ بیسوا کسی گرہستن سے کیا بری ہے ۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ اُس جگہ اور اِس جگہ میں کوئی فرق نہیں ہے ۔؟"

"ہے کیوں نہیں، یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے ۔!"

اور یہ حقیقت پسندانہ تیز جملہ "شادی کی ساری تقدیس" کو پاش پاش کر دیتا ہے واقعی مرد عورت کو بیشتر طوائف ہی سمجھتا ہے برابر کا حصہ دار نہیں۔ اور ہندوستانی عورت جس کو ابھی تک معاشی آزادی نہیں ملی ہے۔ اس سے زیادہ کہہ بھی کیا

join eBooks Telegram

سکتی تھی۔ یہ ایک جری باشعور عورت کی تصویر ہے جو اپنا حق حاصل نہ کر پاتے ہوئے بھی اس کا شعور رکھتی ہے۔

"گرھن" میں بھی عورت ماں کے روپ میں ابھرتی ہے جو اپنے لڑکے گھمنڈی کو آوارہ ہونے سے روکنا بھی چاہتی ہے اور اس کے جوان ہونے سے خوش بھی ہے کیونکہ اس طرح اس کو اپنا ثمرہ مل جاتا ہے۔ اس افسانے میں بیدی نے عورت کے بارے میں اپنے خیال کا یوں اظہار کیا ہے۔

"دنیا میں کوئی عورت ماں کے سوا نہیں۔ بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے اور بیٹی بھی ماں تو دنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔ عورت ماں اور مرد بیٹا ــــــ ماں خالق اور بیٹا تخلیق۔"

لیکن لاجو ان سب سے مختلف ہے وہ خوبصورت ہے چھوئی موئی کے پودے کی طرح نازک ہے مار کھا کر بھی خوش رہتی ہے اس کا شوہر سندر لال باشعور ہمدرد انسان ہے اور جب فسادات کے دوران میں اُسے (لاجونتی) اغوا کر لیا جاتا ہے تو اس "خون کے طوفان" کے بعد مغویہ عورت کے بساؤ کی چھوٹی سی تحریک چلاتا ہے اور جب ایک دن لاجو مل جاتی ہے تو سندر لال اس کو لے آتا ہے پھر بھی وہ "دل میں بساؤ" کی تحریک میں برابر کام کرتا رہتا ہے۔

ایک رات وہ لاجو سے پوچھتا ہے۔

"کون تھا وہ ــــ؟"

"لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا "جماں"۔ پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہ سندر لال نے پوچھ لیا ــــ

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں۔"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا "نہیں تو ــ" اور پھر بولی "اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اگرچہ وہ مارتا نہیں تھا پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پھر بھی تم سے ڈرتی نہیں تھی اب تو نہ مارو گے؟"

"سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا "نہیں دیوی۔ اب نہیں ماروں گا ــــ نہیں ماروں گا۔"

"دیوی" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔"

join eBooks Telegram

اس لئے کہ عورت گر گر بھی اور بڑھ کر بھی عورت ہی رہنا چاہتی ہے وہ مورتی بن کر زندگی کے کرب سے الگ نہیں رہنا چاہتی ــ اسی لئے لاجونتی کی خوشی میں ایک شک تھا" - اور وہ عورت "نہ سمجھی گئی تو بس کر بھی اجڑ جاتی ہے"

لاجونتی ایک مغویہ عورت کی وہ خوبصورت کہانی ہے جس پر بیدی کا فن بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔ اس کا دھیما لب و لہجہ، فسادات کے بعد کی بگڑی ہوئی سہمی ہوئی فضا، گھر بساؤ کے بعد دل میں بساؤ کی تحریک اور ان سب کے امتزاج سے ابھرتی ہوئی دبی مظلوم عورت جس کی قدر جانتے کے بعد بھی نہ جانی گئی - یوں تو فسادات پر کہانیوں کا ایک انبار ہے لیکن بیدی کی یہ ایک کہانی ان سب سے الگ ایک گہرا نفسیاتی تجزیہ ہے - جذباتیت سے بچ کر اور نعرہ بازی سے ہٹ کر اس موضوع کو ایک فنکارانہ "مجسّمے" میں ڈھالنا بیحد مشکل تھا اس لئے یہ اُردو کے بہترین افسانوں کی فہرست میں شامل ہے۔

"اندو" بھی ایک ایسی تصویر ہے جس میں عورت مرد سے صرف اس کے دکھ مانگتی ہے۔ وہ ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں اپنی خدمت سے اپنے سسر بابو دھنی رام کی اچھی بہورانی، اپنے شوہر مدن کی پیاری بیوی اور اپنی چھوٹی نند کی بھابی ہے - بابو دھنی رام اپنی بہو میں اپنی "سورگ باش بیوی" کی جھلک دیکھتے ہیں۔ مدن اس میں ممتا اور بیوی کی ملی جلی تصویریں دیکھتا ہے اور نند اُسے اپنی سہیلی سمان سمجھتی ہے مگر وقت کا آہستہ لیکن تیز رو دھارا اس کو ماں کے روپ میں بدل کر مدن کے لئے اس میں دلچسپی کم کر دیتا ہے اب وہ اپنی راتیں کہیں اور گذارنے لگتا ہے عورت سب ظلم سہہ لیتی ہے مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا مرد اُسے تنہا بستر پر کروٹیں بدلنے پر مجبور کر دے اور ایک دن وہ بھی اپنے کو سنوارتی ہے، اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی میں چمک دمک پیدا کرتی ہے تاکہ مدن واپس آجائے۔ اور وہ واپس آجاتا ہے مگر ــــ

"اندو ــــ" مدن نے کہا۔ اس کی آواز شادی کی رات والی پکار سے دو سُر اوپر تھی اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا "جی" ــ اور اس کی آواز دو سُر نیچی تھی ــ پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی۔ - - - - "

چند لمحوں بعد مدن اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھکر رونے کا سبب پوچھتا ہے۔

"خوشی کے ہیں" - اندو نے جواب دیا - آج کی رات میری ہے۔" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ مدن سے چمٹ گئی ایک تلذّذ کے احساس سے مدن نے کہا " آج برسوں بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ــ"

"لیکن، تم نے کہا نہیں" اندو بولی - یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا۔

"ہاں" - مدن بولا " اپنے دکھ مجھے دیدو"

"تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے"

join eBooks Telegram

"میں نے" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا "میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا میرے عزیزوں سے پیار — ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں یہ پیارے پیارے بچے — یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی" اندو بولی "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں" پھر اندو نے رک کر کہا۔ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتے ہوئے بولی "اپنی لاج - - - اپنی خوشی - - - اس وقت تم بھی کہہ دیتے" اپنے دکھ مجھے دیدو" — تو میں — " اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی "اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

عورت اپنا سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جاتی ہے سب کے غم اپنا کر اپنا غم کسے دے! یہ کہانی ایک ایسا المیہ ہے جو زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں رونما ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا اور اس کے غم کی اتھاہ نہیں ہے۔ بیدی نے اپنے فن کی پوری جلوہ گری اس کہانی میں نمایاں کی ہے اس کی مانوس گھریلو فضا اس کے معمولی لوگ، ان کے غم اور خوشی اور ایک ایسا ڈرامائی موڑ جب بیوی اپنے کو" طوائف کی طرح سجاتی ہے تاکہ وہ پھر سے اپنے شوہر کو پالے — اس کہانی کی سچائی افسانوی ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے زیادہ سچی معلوم ہوتی ہے۔ یہی اس کہانی کے شدید تاثر کا راز ہے۔ اس میں بیدی کا فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے یہ صرف بیدی کی ہی سب سے اچھی کہانی نہیں ہے بلکہ اس کو بین الاقوامی معیار پر بھی اعلیٰ کہانی کہا جا سکتا ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ اُردو میں شاید ہی اس معیار کی کوئی دوسری کہانی ہوگی۔ اس میں ایک عورت کا صرف غم ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی اس "ابدی محرومی" کا اظہار ہے جو جیتے جی آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ شاید زندگی اسی کا سہارا لے کر ہمیشہ سنبھالا لیتی ہے۔

بیدی کے افسانوں میں بڑا تنوع ہے۔ ان کے مشاہدے اور تجربے میں ایک باطنی ربط ہے اور اُسے وہ فنی بصیرت سے یوں ملا دیتے ہیں کہ سارے رنگ الگ الگ رہتے ہوئے بھی ملے جلے لگتے ہیں۔ جیسے قوسِ قزح کے رنگ، اسی لئے ان کے افسانوں میں ندرت کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے۔

"گرہن" کے افسانوں میں (سوائے "بیچ" کے) ایک ایسا معیار ملتا ہے جس کو کتنے ہی مشہور افسانہ نگار اپنی تحریروں میں قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔ یہ معیار جذبات نگاری، جزئیاتی مصوری اور کہانی پن کے امتزاج سے

join eBooks Telegram

بنتاہے وہ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ معمولی بات بھی ایک بلند سطح سے کہی جائے تاکہ اس کا اثر دیرپا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی مدت گذر جانے پر بھی یہ افسانے اکثر و بیشتر اپنا تاثر قائم رکھتے ہیں اور اس تاثر کی وجہ سے تازگی بھی باقی رہتی ہے۔ "رحمن کے جوتے" "زین العابدین" اور "معاون اور میں" "بھی گرہن" کی طرح مکمل افسانے ہیں۔ "رحمن کے جوتے" ایک معمر آدمی کی بے کسی اور افلاس کی انوکھی کہانی ہے۔ جوتا ایک دوسرے پر چڑھ جائے تو کہاوت ہے کہ سفر کی علامت بن جاتا ہے اس کہانی میں نچلے طبقے کے بوڑھا اور بوڑھی جن "معصوم جذبات" کا اظہار کرتے ہیں وہ نئے نہ ہوتے ہوئے بھی پُراثر ہیں۔ اور جب وہ اپنے نواسے سے ملنے کی خوشی میں سفر کرتا ہے گاڑی میں اس کی گٹھری چوری ہو جاتی ہے پھر اُسے چوٹ آتی ہے اور ہسپتال پہنچ کر وہ اپنے "سفر" پر روانہ ہو جاتا ہے۔ ایک بوڑھے کی موت کوئی اہم واقعہ نہ سہی۔ لیکن بیدی نے کچھ اس طرح سیدھے سادے دردمند طریقے سے کہانی بیان کی ہے کہ قاری کی ساری ہمدردی رحمن کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

زین العابدین بیدی کی کہانیوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے اس کو پڑھتے وقت مجھے ژاں ژینے کی THEIF'S DIARY - "چور کی ڈائری" یاد آگئی تھی۔ زین العابدین "بیکار اوباش اور چور" ہے مگر اپنے گرد و پیش کے کتنے ہی "مہذب اور شریف لوگوں" سے بہتر ہے وہ چوری کرتا ہے اور اس کا اعتراف بھی بغیر کسی جرم کے احساس کے کرلیتا ہے۔ وہ غریب۔ ایک آ ... ہر قرض لیتا ہے چوری کرتا ہے مگر ایک ایمانداری کے ساتھ۔ اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا اور اتنا خراب و برباد ہونے کے باوجود اس میں انسانیت کی چنگاری روشن ہے اسی لئے اس کے چلے جانے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے۔

"جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے لیکن میرا قرض خواہ کوئی بڑا بے نیاز آدمی ہے جسے اپنے پیسے کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں۔"

بیدی کا یہ افسانہ اچھی کردار نگاری کا ایک بالکل ہی مختلف نمونہ ہے عام طور سے ان کے کردار سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ یہاں انھوں نے ایک پیچیدہ "شخصیت" کا تقابلی نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

"معاون اور میں" کا تیسرا ایک خوددار نوجوان کی کہانی ہے جو نہایت تنگدستی کے باوجود اپنی شخصیت کو پارہ پارہ نہیں ہونے دیتا اور بے عزتی کی زندگی پر فاقہ کشی کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔

یہ اور دوسرے کردار اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ بیدی نے اپنی افسانہ نگاری میں کردار نگاری کو بڑی اہمیت دی ہے مگر وہ منٹو کی طرح اپنی کہانی کا "سارا بوجھ" ان کے کندھوں پر نہیں ڈالتے بلکہ اس کو کہانی میں "اہم جزو" کی حیثیت ہی دیتے ہیں اس طرح کردار کے سہارے کے باوجود کہانی کی ساری اساس اس پر نہیں رہتی۔

join eBooks Telegram

دوستوئسکی نے عام لوگوں کے کردار پر بحث کرتے ہوئے اپنے عظیم ناول "ایڈیٹ" میں کہا تھا۔

"تاہم یہ سوال رہتا ہے کہ ایک ادیب عام لوگ یعنی بیحد معمولی قسم کے افراد کو کس طرح پیش کرے کہ اس کے قارئین ان میں دلچسپی لے سکیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ انھیں کہانی سے الگ ہی رکھا جائے اس لئے کہ معمولی لوگ انسانی واقعات کے درمیان خاص اور اہم کڑیاں ہیں۔ اگر ہم انھیں الگ رکھتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم صداقت کے شائبے تک کو کھو بیٹھے ہیں"

اس بات کو اور تفصیل سے یوں پیش کیا ہے۔

"ہمارے خیال میں ایک ادیب کو چاہیئے کہ ان معمولی لوگوں کے دلچسپ اور سبق آموز پہلوؤں کو دریافت کرے اس لئے کہ بعض لوگوں کی فطرت میں مستقلاً نہ بدلنے والی عمومیت ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ ان کی جان توڑ کوشش کے باوجود کہ وہ روزانہ زندگی کی بے کیفی سے بچ نکلیں، عموماً وہ اسی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کا اپنا ایک خاص کردار بن جاتا ہے۔ اس طرح کی عمومیت کا کردار یہ ہے کہ وہ اس بات کی خواہاں رہتی ہے کہ وہ آزاد اور اوریجنل بن سکے، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ یہ اس کے لئے کیسے ممکن ہے۔"

(ایڈیٹ ص ۴۵۱)

دوستوئسکی کے اس طویل اقتباس کے بعد اس مسئلہ پر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بیدی اس سے اپنی افسانہ نگاری کے آغاز ہی سے واقف تھے اور عام لوگوں کی زندگی کی تلاش کر کے انھوں نے کہانی کے "طلسم" کو اور بھی اثر پذیر بنا دیا ہے۔

بیدی ان کی نئی کہانی ہے "بھولا" سے جو لکیر شروع ہوئی تھی وہ بیل تک پہنچتے پہنچتے ایک طرح کے دائرے کو مکمل کر دیتی ہے بیل ایک بھکارن کا بچہ ہے جس کا باپ کوئی شخص بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بیل والٹ ڈزنی کے "خرگوش" کی طرح خوبصورت اور شوخ دکھائی دیتا ہے۔ یہ کہانی درباری اور سیتا کی محبت کو بیان کرتی ہے مگر بیل اس کا مرکزی خیال ہے۔ ایک معصوم بچہ۔ درباری ایک بیوہ کی لڑکی سیتا سے محبت کرتا ہے مگر اس کو اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتا۔ اور اس کے جسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ مصری (بھکارن) سے بیل دس روپے میں ایک دن کے لئے لیتا ہے۔ مصری بیل کو اپنا بچہ ہی نہیں بلکہ ایک معنی میں "مرد" سمجھتی ہے کیونکہ وہ اسی کی کمائی پر گذر بسر کرتی ہے۔ بیل کو لے کر درباری سیتا کے ساتھ ایک ہوٹل میں جاتا ہے اور جب سیتا خود کو ڈری ڈری درباری کے حوالے کرنا چاہتی ہے تو بیل گھبرا کر زور زور سے رونے لگتا ہے۔ درباری اٹھ کر ایک تھپڑ مارتا ہے لیکن دوسرے لمحے سیتا اسے اٹھا کر بہلانے لگتی ہے۔

join eBooks Telegram

"وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا جتنا بَبل سے۔"

"جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل سے اٹھایا اور ببل کی طرف دیکھنے لگا وہ سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ وہ ایک بہت بڑی حد تک برہنہ تھی اور ببل سے اپنی برہنگی کو چھپا رہی تھی۔"

اپنی اس وحشیانہ حرکت پر شرمندہ ہو کر درباری رونے لگتا ہے سیتا بھی سسکیاں لینے لگتی ہے مگر ان دونوں کو روتا دیکھ کر ببل ہنسنے لگتا ہے درباری سیتا سے شادی کا وعدہ کر لیتا ہے۔ ببل ایک حقیقت بھی ہے اور ایک سمبل بھی اس لئے کہ محبت کا سارا تار و پود تو معصومیت سے بنا ہے اور ببل معصومیت کی علامت ہے۔ اس کہانی میں بیدی نے مزاح، طنز، قہقہے اور اشکوں کا ایسا "سنگم" بنایا ہے کہ کہانی ہر لمحہ دلچسپ رہنے کے ساتھ نقطۂ عروج کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ سیتا کا کردار محبت میں گرفتار مجبور لڑکی کا کردار ہے جو رام کی سیتا سے زیادہ مختلف نہیں۔ دونوں اپنے محبوب کی پرستار ہیں مگر آج کے دور میں درباری رام نہیں ہے وہ صنعتی شہر بمبئی کا پروردہ ہے جہاں زندگی کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے اکثر روپے سے اور کبھی بہانے سے۔ ببل ایک ایسی مکمل کہانی ہے جو زندگی کے دائرہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ بیدی کا فن اس میں پوری طرح نکھر کر آیا ہے۔

بیدی کی زبان پر اکثر اعتراض کیا جاتا ہے لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ بیدی اپنے کرداروں کے ذریعے خود ہم کلام نہیں ہوتے بلکہ اکثر ان کی ہی زبان لکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات تو وہی ہے جو ایذرا پاونڈ نے فرانسیسی ناول نگار استاندال کے بارے میں کہی تھی SOLIDITY ٹھوس پن۔ بغیر اس کے افسانوی زبان کامیاب نہیں کہلائی جا سکتی۔

مجتبیٰ حسین بیدی کے فن کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ "ان میں وہ چنگاری نہیں ملتی جو یکایک ڈھیلے ڈھالے افسانوں کو بھی روشن کر دیتی ہے۔" (شعور ۲۴ صفحہ ۳۵) ظاہر ہے یہ تنقید بہت مبہم ہے پتہ نہیں مجتبیٰ حسین چنگاری سے کیا مراد لیتے ہیں۔ میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ اکثر وہ ننھی سی چنگاری ہی سے شعلہ بنا کر اپنے ایوان کو روشن کرتے ہیں جس کی نمایاں مثالیں "دیوالہ" "لاجونتی" "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "ببل" میں ملتی ہیں۔

بیدی کے فن میں بڑی گہرائی ہے مگر اتھاہ نہیں۔ بڑی بلندی ہے مگر اتنی نہیں کہ نگاہ نہ پہنچ سکے۔ ان کا کینوس پھیلتا جا رہا ہے اور "ببل" سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیدی کا فن اب نئی راہوں کی تلاش میں ہے۔

ادیب
مترجم :- خیر النساء

دِل کی بستی

یہ ایک خام دیہاتی زندگی کی کہانی ہے۔ اس کی فضا میں لہسن، رائی، جنس، خون پسینہ اور گوبر کا تعفن پھیلا ہوا ہے۔ اس کے لوگ وحشت پرور ہیں۔ وہ گنّے کے کھیتوں کی رکھوالی کرتے ہیں، اپنے چھوٹے موٹے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں، شراب پیتے ہیں، نوجوان لڑکیوں کو پھانستے ہیں اور اپنے چند پیسوں کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اس کی عورتیں کینہ و حسد سے بھری ہوئی ہیں اور ایک دوسرے پر طعنہ زنی کرتی رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان لوگوں کے مکانات کے گرد دیواریں نہیں ہیں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔

بجز اس کے کہ اس گاؤں میں جہاں یہ لوگ رہتے ہیں دیوی کوٹلہ کا ایک مندر ہے یہ بھی ایک عام گاؤں کی طرح ہے۔ تلوکہ ایکہ چلاتا ہے۔ وہ بڑا شرابی ہے۔ جب اس کی بیوی رانو اسے سٹھا ماٹا پینے سے روکتی ہے تو وہ اسے مارتا پیٹتا ہے۔ یہی نہیں کہ رانو اس حیوان صفت مرد سے وابستہ ہے بلکہ اپنی گھٹیا قسم کی ساس سے بھی نباہ کرنے پر مجبور ہے۔ ایک دن ایک نوجوان جس کی بارہ سالہ بہن کی اس گاؤں میں آبرو ریزی کی گئی تھی تلوکہ کو مار ڈالتا ہے۔ رانو اس غم سے پاگل سی ہو جاتی ہے۔ گاؤں والے سمجھتے ہیں کہ رانو کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنے چھوٹے دیور منگل سے شادی کر لے۔ رانو نے منگل کی ایک بیٹے کی طرح پرورش کی تھی وہ اس خیال ہی سے بھڑک اٹھتی ہے کہ اس کی ہمبستر بنے۔ یہی حال منگل کا تھا۔ لیکن گاؤں کے سرپنچ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں آخر کار وہ دونوں یعنی رانو اور منگل ایک دوسرے کو جذباتی طور سے بندھا ہوا پاتے ہیں۔ بہت سال گذر جاتے ہیں اور وہ امیر نوجوان جس نے تلوکہ کو قتل کیا تھا رہا ہو جاتا ہے۔ وہ تلوکہ کی لڑکی بڑی سے محبت کرنے لگتا ہے اور گاؤں میں آ کر اس سے شادی کی کوشش کرتا ہے۔ جب رانو کو پتہ چلتا ہے کہ وہ نوجوان کون ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بڈھے سسر کی منت و سماجت اور اس کی اپنی لڑکی کی وحشت زدہ ملتجیانہ نگاہیں ایسا کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

"ماں یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو نہ بولی تو میں بن بیاہی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی" آخر کار

join eBooks Telegram

رانو کو ماں لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

یہ تو ہوا اس کہانی کا خاکہ لیکن بیدی کے بیان نے اس میں ایک معنی خیز گہرائی پیدا کر دی ہے۔ بہ ظاہر یہ کہانی کھردری معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جگہ جگہ شاعری کی لطافت ملتی ہے۔ بلھے شاہ اور وارث شاہ کے بول بھی ان لوگوں کی یوں ہی زبان زد ہیں جیسے کہ گالیاں۔ اس کہانی کو شعریت بخشنے میں ان لوگوں کے نغماتِ خوشی اور نوحۂ غم ہی کا دخل نہیں ہے بلکہ شعریت تو دراصل ان لوگوں کے تہ در تہ طنز کی نشتریت میں پوشیدہ ہے۔ یہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو کتنی اذیت پہنچاتے ہیں اور کتنی راحت بھی۔ ان کی زندگیاں کس قدر گھٹی ہوئی ہیں اور اس کے بعد بھی ارمانوں سے کتنی بھرپور۔ رانو کو شراب سے اس لئے نفرت نہیں ہے کہ وہ اس کے بچوں کے منہ سے نوالہ چھین لیتی ہے بلکہ اس ناپسندیدگی کی بنا جذبہ رشک و رقابت ہے۔ شراب اس کے شوہر پر قابو پالیتی ہے جسے وہ صرف اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔

رانو بڑی جیالی ہے۔ اس کا حسد اسے خاکستر نہیں بنانے پاتا صرف کوئلہ بنا دیتا ہے جب پڑوس کی عورتیں اسے دلاسا دینے آتی ہیں تو وہ خفا ہو کر انہیں باہر نکال دیتی ہے۔ اسے ان کی دیا کی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی نے گو اسے سخت دل بنا دیا ہے لیکن اس کے لطیف جذبات کو کچل نہ سکی۔ منگل کی آغوش میں اسے وہی محبت مل جاتی ہے جس کے لئے وہ ایک عرصے سے ترسی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا نہال نئی کونپلیں کھلاتا ہے۔ آخر کار وہ اس راز کو پالیتی ہے جسے وہ اب تک اپنے دل میں چھپائے پھرتی تھی۔ یہ انکشاف اس کا صرف اپنا ہی نہیں، منگل کا بھی ہے۔ وہ سلامتی سے نہیں، رانو سے محبت کرتا ہے۔ اس راز کو جاننے کے لئے کسی کو آسمان میں چاند تاروں پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ یہ محض بیدی کا ایک تصور ہے۔ اگر رانو اور منگل کو اب تک اس کا سراغ نہیں ملا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے اس کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ کہیں منگل کا شراب کی بوتل کو ٹھوکر مارنا اس بات کا اظہار تو نہیں کہ اس میں رانو کو اپنے بھائی کے ظلم وستم کا نشانہ بنتا ہوا دیکھنے کی تاب نہ تھی؟ شاید یہ رانو کے لئے محبت کا ایک غیر شعوری اعتراف تھا۔ ایسا اعتراف جس کا اس وقت وہ اقرار کرنے کی جرأت کبھی نہ رکھتا تھا۔

رانو جو اپنے آپ کو پژمردہ سمجھنے لگی تھی اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب تک باطنی طور سے شاداب ہے۔ بڑی بھی اپنے میں اس احساس کو پالیتی ہے۔ وہ ایک ایسے جنگلی پھول کی طرح تھی جو کسی گھور پر اگتا ہے۔ کبھی خیال آتا تھا کہ یہ پھول مرجھا جائے گا لیکن یہ مرجھاتا نہیں ہے۔ زندگی اس کے لئے عذاب تھی اس میں اس کا پورا قصور نہ تھا کہ وہ اپنی ماں کو منگل سے محبت کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اور اکثر اس کی توہین بھی کر دیتی تھی۔ لیکن آخر کار بڑی کے دل میں بھی محبت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے وہ بھی اس حد تک

join eBooks Telegram

کہ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہونے والا شوہر اس کے باپ کا قاتل ہے تب بھی اس کے ضمیر میں جنبش نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ حضور سنگھ سے بڈھے کھوسٹ میں بھی انسانیت کی چنگاری موجود ہے۔ اس کے ان دل گداز جملوں سے زیادہ موثر کیا شے ہو گی جو وہ اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھتے ہوئے رانو سے کہتا ہے۔

• بیٹا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔ اسے تو نہیں جانتی۔ میں جانتا ہوں، نہ یہ لوگ جانتے ہیں۔ تو اسے سمجھنے کی کوشش بھی مت کر ___ یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں ۔"

بڈھا ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بھلا انسانی دل کی تلون مزاجیوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ لیکن صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرنا پیش پا اُفتادہ سی بات ہو گی۔ بیدی اسے وہیں پر نہیں چھوڑ دیتے۔ وہ بڑے حساس ہیں اس لئے اخلاقی درس بھی نہیں دیتے اور یوں نہیں کہتے: ان کی زندگیاں کتنی گندی ہیں اور کتنی خوبصورت بن سکتی ہیں ۔" انہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کی زندگی کتنی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے۔ پھر بھی انہیں زندگی سے کتنا پیار ہے اور وہ کس طرح اس سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ لوگ کبھی ناامیدی اور مایوسی کے آگے ہار نہیں مانتے. کتنے سادہ لوگ ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ زندگی کتنی بے معنی ہے۔

بیدی دیہاتی زندگی کی رومانی فضا کے قصیدہ خواں نہیں ہیں۔ وہ ان کے ہاں نیچر کا جو تھوڑا بہت ذکر ملتا ہے وہ بھی حقیقت پسندانہ ہے۔ بے شک وہاں گنّے کے کھیت ہیں جن میں، محبت کرنے والے پر تجسس نگاہوں سے روپوش ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بکائن اور ببول کے پیڑ ہیں۔ ایک میں کڑوا رس بھرا ہوا ہے اور دوسرے پر کانٹے اُگے ہوئے ہیں۔ گاؤں میں صرف ایک ہی پیپل کا پیڑ ہے جس کی پتیاں جھڑ چکی ہیں۔ اس پر حقیقت کہانی میں صرف اتنی ہی افسانہ طرازی ہے کہ بیدی نے اپنے کرداروں کی زندگی کو چاند سورج اور ستاروں کی حرکات سے وابستہ کر رکھا ہے۔ جب کہیں ظلم ہوتا ہے تو سورج غصے سے لال ہو جاتا ہے۔ کسی کو تکلیف پہنچتی ہے تو سورج اپنا چہرہ بادلوں میں چھپا لیتا ہے۔ رانو کی چیخیں سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیا دان گاگ کے ذہنی کرب نے سرو کے درختوں کو لرزہ فگن نہیں کر دیا تھا؟ یہ سیدھے سادے دیہاتی ستاروں کے فاصلوں کو کیا جانیں جن کی روشنی برسوں کے بعد زمین تک پہنچتی ہے۔

اگر کوئی گاؤں والوں کے معاملات میں سورج اور چاند اور ستاروں سے بھی بڑھ کر شریک ہے تو وہ مندر کی دیوی ہے۔ لوگ اس کی پوجا کرنے اسی طرح آتے ہیں جس طرح وہ ٹونے ٹوٹکے کے لئے اس سادھو کے پاس جاتے ہیں جو بے برگ پیپل کے نیچے بیٹھا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ دیوی بھی ان لوگوں میں سے ایک ہے۔

join eBooks Telegram

آخر وہ بھی ایک عورت ہی تو ہے جو محبت کی ہوس ناکیوں کو سمجھتی ہے۔ وہ بھیڑیوں کے جنگل سے بچتی بچاتی اس گاؤں میں آنکلی تھی۔ اگر اپنی حفاظت کے لئے اس کے پاس ترشول نہ ہوتا تو وہ اپنے گستاخ عاشق کو اپنے سے دور نہ رکھ پاتی۔ اسی سمدتی کے سامنے وہ نوجوان رقص کناں ہے جس نے اپنی بہن کی بے عزتی کا انتقام لیا تھا۔ اور پھر اسی مقتول کی لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ دیوی ان نفرتوں اور محبتوں کو سمجھتی ہے جو ان مرد اور عورتوں کو کبھی فرشتہ بنا دیتے ہیں اور کبھی حیوان۔ وہ خود ان تجربات سے گزر چکی تھی۔

یہ کہانی ایک شہ پارہ ہے۔ یہی نہیں کہ پیرٹ اس میں شریک ہیں۔ بلکہ دیوی اور دیوتاؤں کو بھی انسانی سطح پر پیش کیا گیا ہے یہ کسی رومانوی شاعر کا گاؤں نہیں جو کہ دیہاتیوں کی سادگی میں یقین رکھتا ہے نہ یہ کسی انقلابی کا گاؤں ہے جسے امروز کی پریشان حالی میں اس خوش آیند مستقبل کی تصویر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جب بے کھیتیا کسان اپنے حقوق کے لئے بغاوت کریں گے اور ان لوگوں سے انتقام لیں گے جنہوں نے انہیں اپنی زمینوں سے محروم کر دیا ہے اور عورتیں اپنا حق مانگنے کے لئے مسلح ہو جائیں گی۔ اس کہانی کا گاؤں ایک معنی میں دل کی بستی ہے جس میں ہر ایک فرد الجھنوں میں گھری ہوئی زندگی سے خوشی کے چند لمحے چھین لینا چاہتا ہے۔ اس میں محبت و نفرت دعائیں بددعائیں خوف اور خوشی ایک دوسرے سے بے انتہا الجھی ہوئی ہیں یہاں ہر شخص ہر ایک کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اس کے باوجود ہر ایک کے ذہن میں کوئی راز ہے جو اسے کچوکے دیتا رہتا ہے اور جس کا نشان تک کسی کو نہیں ملتا۔

یہی نہیں بلکہ اس بوڑھی کھوسٹ ہارڈ کے پاس بھی ایک راز ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا رونا پیٹنا جو کہانی کو انجام تک پہنچاتا ہے سب سوانگ ہے؟ اور کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ میلی چادر جس کے سائے میں رانو اور منگل کی شادی ہوئی تھی واقعی میلی تھی؟ تمام اچھی کہانیوں کی طرح بیدی کا یہ مختصر ناول جہاں کہیں پورے یقین کا اظہار کرتا ہے وہاں ہلکے سے شک کی گنجائش بھی چھوڑ دیتا ہے۔

نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

تاثرات و تعصبات

قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مہتمم ریسرچ اینڈ پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ مدرسہ عالیہ۔ ڈھاکہ

join eBooks Telegram

ژاں پال سارتر

مترجم :- حمیداللہ صدیقی

دیوار

انھوں نے ہمیں ایک بڑے سے کمرے میں دھکیل دیا جس میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی تھی۔ میری پلکیں جھپکنے لگیں۔ کیونکہ روشنی سے آنکھوں کو تکلیف ہورہی تھی۔ آخر میری نظر ایک میز کے چاروں طرف بیٹھے چار غیر فوجی افسروں پر پڑی جو کاغذات دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے قیدیوں کے ایک دوسرے گروہ کو اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا۔ اور ان لوگوں تک پہنچنے کے لئے ہمیں پورا کمرہ طے کرنا پڑا۔ قیدیوں میں سے اکثر کو تو میں جانتا تھا۔ لیکن ان میں بعض غیر ملکی بھی تھے۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں قیدیوں کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور چہرے گول تھے۔ وہ دونوں تقریباً ہمشکل تھے۔ میرے خیال میں وہ فرانسیسی تھے۔ ان میں سے چھوٹا رہ رہ کر اپنی پتلون اوپر چڑھاتا۔۔۔۔۔ اعصاب۔

کارروائی تقریباً تین گھنٹہ جاری رہی۔ میں تنگ کر چید ہوگیا تھا اور اب معلوم ہوتا تھا جیسے میرا دماغ خالی ہوگیا ہے لیکن کمرہ کافی گرم تھا جس سے ایک طرح کا لطف آرہا تھا ورنہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں ہم برابر ٹھنڈ سے کانپتے رہے تھے۔ سنتری قیدیوں کو ایک ایک کرکے میز کے سامنے لے جاتے وہ چاروں آدمی ہر قیدی سے اس کا نام و پتہ دریافت کرتے یا یونہی ایک آدھ ادھر اُدھر کا سوال کر بیٹھتے۔

"کیا بارود خانہ کی آتش زدگی سے تمہارا کوئی تعلق ہے؟ یا" تم نو تاریخ کی صبح کو کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟"

وہ ان سوالات کے جوابات سنتے بھی نہ تھے۔ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش بیٹھے سامنے دیوار کو تکتے رہتے اور پھر لکھنے لگتے۔ انھوں نے ٹام سے پوچھا کہ کیا وہ واقعی بین الاقوامی دستہ میں تھا و ٹام کو ان کاغذات کی وجہ سے جو اس کی جیب سے نکلے تھے اقرار

join eBooks Telegram

کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ انھوں نے یوآن سے کچھ بھی نہ پوچھا بلکہ صرف اس کا نام پوچھ کر بڑی دیر تک لکھتے رہے۔

میرا بھائی جوزے انارکسٹ تو ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ میرا تو کسی بھی جماعت سے تعلق نہیں۔ میرا سیاست سے کبھی بھی کوئی تعلق نہ تھا۔"

وہ کچھ نہ بولے۔ یوآن کہتا رہا "میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ میں دوسروں کے گناہوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا چاہتا۔"

اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ایک سنتری نے اُسے چپ کرادیا اور وہ اُسے وہاں سے لے گئے۔ اب میری باری تھی۔

"تمہارا نام پابلو آبیٹا ہے؟"

"ہاں" اس آدمی نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔

"رومن گرس کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"تم نے اُسے ۶ سے ۱۹ تاریخ تک اپنے مکان میں چھپا رکھا تھا؟"

"نہیں۔"

انھوں نے ایک منٹ تک کچھ لکھا اور پھر سنتری نے مجھے بھی باہر بھیج دیا۔ راستہ میں ٹام اور جوآن دو سنتریوں کے ہمراہ میرے منتظر تھے۔ ٹام نے ایک سنتری سے پوچھا۔

"پھر؟"

"پھر کیا؟" سنتری بولا۔

"یہ سب جرح تھی یا فیصلہ؟"

"فیصلہ"

"وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں؟"

"تمہیں قید خانہ میں فیصلہ سُنا دیا جائے گا۔" سنتری نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

درحقیقت ہم جس جگہ قید تھے وہ ایک ہسپتال کا تہہ خانہ تھا وہاں سیلن کی وجہ سے بڑی ٹھنڈ تھی۔ ہم تمام رات کانپتے رہے۔ دن میں بھی صورتِ حال کچھ بہتر نہ ہوئی۔ پچھلے پانچ دن میں نے ایک خانقاہ کی تنگ کوٹھری میں گزارے تھے۔ وہ کوٹھری بالکل دیوار کے

join eBooks Telegram

سوراخ کی طرح تھی جو یقیناً قرونِ وسطیٰ میں بنی ہوگی۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے انھوں نے جہاں موقع ملا بند کردیا تھا۔ کوٹھری میں زیادہ تکلیف نہ تھی۔ وہاں سردی کم تھی۔ لیکن میں اکیلا تھا اور تنہائی ذرا دیر بعد ہی کھلنے لگتی ہے۔ یہاں تہہ خانے میں کئی آدمی تھے۔ یوآن بالکل خاموش تھا۔ وہ خوفزدہ تھا اور پھر ابھی اس کی عمر کچھ کہنے کی نہ تھی۔ لیکن ٹام بڑا باتونی تھا۔ اور اسے ہسپانوی خوب آتی تھی۔

تہہ خانہ میں ایک بنچ اور چار چٹائیاں تھیں۔ وہ جب ہمیں وہاں واپس لے گئے تو ہم بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹام بولا "ہم پھنس گئے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں بولا "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس لڑکے کے ساتھ کچھ نہ کریں گے۔"

"ہاں اس کے خلاف ان کے پاس کچھ ثبوت نہیں ہے" ٹام بولا۔ "اس کا بھائی دستہ میں ہے اور بس۔"

میں نے یوآن کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سُن ہی نہیں رہا ہے۔ ٹام بول رہا تھا۔ "معلوم ہے سارا گوسا میں وہ کیا کرتے ہیں؟ آدمیوں کو زمین پر لٹا کر لاریاں اور ٹرک چلا دیتے ہیں۔ مراقش کے ایک مفرور نے مجھے بتایا۔ وہ کارتوس بچانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔"

"لیکن پٹرول تو پھر بھی خرچ ہوتا ہی ہے۔" میں بولا مجھے ٹام پر غصہ آرہا تھا۔ اسے ایسی بات نہ کہنی چاہئے تھی۔ "پھر وہاں افسر سڑک پر نگرانی کے لئے ٹہلتے رہتے ہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ فوراً مار ڈالتے ہیں۔ نہیں۔ وہ انھیں تڑپنے اور چیخنے دیتے ہیں۔ ایک گھنٹہ تک۔ وہ مراقشی کہہ رہا تھا کہ پہلی مرتبہ اسے قے آنے لگی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ یہاں وہ ایسا نہ کریں گے الّا یہ کہ واقعی ان کے پاس کارتوس کم ہوں" میں نے کہا۔

چھت میں چار چھوٹے چھوٹے ہوادان تھے جن سے روشنی بھی آتی تھی۔ اور بائیں طرف تھوڑا سا حصہ کھلا ہوا تھا جس میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اس سوراخ سے جو عموماً ڈھکن سے بند کردیا جاتا تھا وہ تہہ خانہ میں کوئلہ گرادیا کرتے تھے۔ وہاں اب بھی زمین پر کوئلہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور ذرات کا انبار تھا۔ یہ تہہ خانہ ہسپتال کو گرم رکھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن جنگ شروع ہوتے ہی مریض یہاں سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ اس لئے وہ کوئلہ یونہی پڑا رہ گیا تھا۔ کبھی

join eBooks Telegram

کبھی اس پر بارش کا پانی بھی گرتا کیونکہ وہ ڈھکن بند کرنا بھول گئے تھے۔

ٹام کپکپانے لگا "یسوع مسیح" وہ بولا "اب یہ پھر شروع ہوا۔"

وہ اٹھ کر ورزشیں کرنے لگا۔ ہر حرکت سے اس کی قمیص کھل جاتی اور سینہ کے بال اور سفیدی دکھائی دینے لگتی۔ وہ چت لیٹ کر ٹانگیں ہوا میں ہلاتا۔ اس کے کولھے ہلتے نظر آتے۔ ٹام خشک تھا۔ مگر اس کے بدن پر چربی بہت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ عنقریب گوشت کے اس نرم و نازک انبار میں بندوق کی گولی یا سنگین کی نوک اس طرح اترتی چلی جائے گی۔ جیسے مکھن میں چھری۔ وہ اگر دبلا پتلا ہوتا تو شاید مجھے یہ احساس نہ ہوتا۔

میں بہت زیادہ ٹھنڈ نہیں محسوس کر رہا تھا لیکن میرے بازو اور کولھے بے حس ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا کہ جیسے میری کوئی چیز کھو گئی ہے اور میں اپنا کوٹ ادھر اُدھر ڈھونڈھنے لگتا۔ پھر مجھے یاد آتا کہ ان لوگوں نے میرا کوٹ مجھے واپس نہ دیا تھا۔ اس سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہمارے کپڑے لے کر سپاہیوں کو دیدیئے تھے۔ صرف قمیص چھوڑ دیا تھا اور اس کے ساتھ ہسپتال کا کینوس کا پتلون جسے مریض گرمیوں میں پہنتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹام اٹھا اور میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

"کچھ گرمی آئی ؟"

"یا اللہ۔ بالکل نہیں لیکن اب دم نہیں رہا۔"

شام کے تقریباً آٹھ بجے ایک میجر دو سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اس نے سنتری سے پوچھا۔

"کیا نام ہیں ان تینوں کے ؟"

"اسٹین باک۔ آبیٹا اور مرابل" سنتری نے بتایا۔

میجر نے چشمہ ناک پر رکھ کر فہرست پر نظر دوڑائی "اسٹین باک۔۔۔۔اسٹین باک۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔۔۔" تمہیں سزائے موت دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی ماری جائے گی۔" وہ فہرست دیکھتا رہا۔ "بقیہ دو کو بھی۔"

"یہ ناممکن ہے۔" یوآن بولا "مجھے بھی !"

میجر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"یوان مرابل" اس نے کہا۔

"نام تو ہے تمہارا" میجر بولا" تمہیں بھی سزائے موت دی گئی ہے۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔" یان نے کہا۔

میجر نے کندھوں کو جھٹکا دیا اور پھر ٹام اور میری طرف مڑا۔

"تم لوگ باسک ہو؟"

"کوئی بھی باسک نہیں ہے۔"

اسے ناگوار سا گذرا" انھوں نے بتایا ہے کہ یہاں تین باسک ہیں۔ میں ان کی تلاش میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا تب ظاہر ہے کہ تمہیں پادری کی ضرورت نہیں ہے؟"

ہم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کہا: ایک بلجین ڈاکٹر ابھی آئے گا۔ اُسے تمہارے ساتھ رات بسر کرنے کی اجازت ہے۔" وہ ایک فوجی سلام کر کے چلا گیا۔

"میں نے تم سے کیا کہا تھا" ٹام بولا" ہمیں سزائے موت ہوئی۔"

"ہاں" میں نے کہا" لیکن اس لڑکے کے ساتھ یہ زیادتی ہے۔"

میں نے یہ بات اخلاقاً کہہ دی تھی حالانکہ وہ لڑکا مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور خوف اور تکلیف نے اس کے خدوخال مسخ کر دیئے تھے تین دن پہلے وہ بڑا چاق و چوبند تھا لیکن اب وہ بالکل کسی بڈھی پری کی طرح لگ رہا تھا اور مجھے احساس ہوا کہ اب اگر اسے چھوڑ بھی دیں پھر بھی وہ کبھی نوجوان نہ معلوم ہوگا۔ اگر لوگ اس کے ساتھ رحم کرتے تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ لیکن رحم کئے جانے کے تصور سے مجھے خود وحشت ہوتی ہے۔ سخت وحشت۔ اس نے کوئی اور بات نہ کہی تھی مگر اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بیٹھا زمین کو دیکھ رہا تھا۔ ٹام دل کا اچھا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا مگر یوآن نے ہاتھ کھینچ لیا اور منہ بنانے لگا۔

"اسے نہ چھیڑو" میں نے آہستہ سے کہا" تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اب اس پر ہذیان طاری ہوگا۔"

ٹام نے بادلِ ناخواستہ میری بات مان لی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لڑکے کی تسلی کرے اس طرح اس کا وقت بھی کٹ جاتا اور وہ اپنے متعلق سوچنے سے بھی نجات پا جاتا۔ لیکن مجھے اس سے چڑ ہو رہی تھی۔ میں نے موت کے متعلق اس سے پہلے کبھی نہ سوچا تھا کیونکہ اس کا کوئی موقع نہ آیا تھا۔ لیکن اب وہی موقع تھا اور اس کے متعلق سوچنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ٹام پھر باتیں کرنے لگا" بتاؤ تم نے کسی کی جان لی ہے۔" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مجھے بتانا شروع کیا کہ اس نے اگست کی ابتدا سے چھ آدمیوں کو مارا ہے

join eBooks Telegram

اُسے موقع کی نزاکت کا بالکل احساس نہ تھا بلکہ وہ اس کا احساس کرنا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں نے خود بھی اُسے اچھی طرح سمجھا نہ تھا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے گولیوں کے متعلق سوچا کہ کس طرح وہ دہکتی ہوئی آگ کی طرح بدن میں داخل ہوں گی۔ لیکن یہ سب اصل سوال سے غیر متعلق تھا۔ میں پُرسکون تھا۔ ہمارے پاس ان باتوں کا احساس کرنے کے لئے ساری رات تھی۔ تھوڑی دیر بعد ٹام نے بولنا بند کر دیا۔ اور میں نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بال بھی سفید ہو گئے ہیں اور وہ بالکل سڑا ہوا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا "اب یہ شروع ہو رہا ہے" اب اندھیرا تقریباً پھیل چکا تھا۔ اور ایک مدھم سی روشنی ہوا دان سے گذر کر کوئلہ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی اور آسمان کے نیچے وہاں ایک دھبہ سا بن گیا تھا۔ مجھے سوراخ کے پار اب ایک ستارہ نظر آ رہا تھا۔ رات بہت صاف اور برفیلی ہو گی۔

دروازہ کھلا اور دو سنتری اندر داخل ہوئے۔ جن کے پیچھے سیاہ وردی میں ایک سنہرے بالوں والا آدمی تھا۔ اس نے ہمیں سلام کیا "میں ڈاکٹر ہوں" اس نے کہا "مجھے اجازت ہے کہ ان جبر آزما لمحات میں تمہاری مدد کروں۔" اس کی آواز بڑی بھلی اور صاف تھی۔ میں نے کہا۔

"تم یہاں کیا چاہتے ہو؟"

"میں آپ لوگوں کی خدمت کے لئے ہوں۔ میں آپ کے آخری لمحات کو آسان بنانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"تم یہاں کس لئے آئے ہو۔ اور لوگ بھی تو ہیں۔ سارا ہسپتال بھرا پڑا ہے۔"

"مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "اوہ! آپ لوگ سگار پئیں گے۔" اس نے جلدی سے کہا "میرے پاس سگریٹ بھی ہیں اور سگار بھی۔"

اس نے ہمیں سگریٹ اور سگار پیش کئے لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا مگر وہ چڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے کہا "تم یہاں رحم و کرم کرنے نہیں آئے ہو۔ اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔ جس دن میں گرفتار ہوا تھا میں نے تمہیں بارکوں کے سامنے فاشسٹوں کے ساتھ دیکھا تھا۔"

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن یکایک میرے اندر ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوئی اس ڈاکٹر کے وجود سے یکایک مجھے کچھ دلچسپی نہ رہ گئی۔ عموماً جب میں کسی کے پیچھے پڑ جاتا ہوں تو اتنی آسانی سے نہیں بخشتا۔ لیکن میرے اندر سے بولنے کی خواہش بالکل ختم ہو گئی تھی۔ میں سر جھٹک کر

join eBooks Telegram
دوسری طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پھر سر اٹھایا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ سنتری ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ پڈرو جو دبلا پتلا مگر لمبا تھا تفریحاً اپنے انگوٹھے گھما رہا تھا۔ اور دوسرا بار بار اس خیال سے سر جھٹک رہا تھا کہ کہیں سو نہ جائے۔

"کیا آپ کو روشنی کی ضرورت ہے" پڈرو نے یکایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ دوسرے نے گردن ہلا کر ہاں کہی۔ ڈاکٹر کسی شہتیر کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ لیکن پھر بھی بُرا نہ لگتا تھا۔ اس کی سرد نیلی آنکھوں میں جھانک کر مجھے احساس ہوا کہ اس کا واحد گناہ تخیل کا فقدان ہے۔ پڈرو باہر سے ایک لیمپ لے کر آیا جسے اس نے بنچ کے ایک سرے پر رکھدیا۔ اس کی روشنی کم تھی مگر اندھیرے سے بہتر تھا۔ گذشتہ رات ہم نے بالکل تاریکی میں گذاری تھی۔ بڑی دیر تک میں روشنی کے اس دائرہ کو دیکھتا رہا جو لیمپ کی وجہ سے چھت پر بن گیا تھا۔ میں بالکل مبہوت تھا۔ پھر یکایک جیسے میں جاگ گیا۔ روشنی کا دائرہ غائب ہوگیا اور میں نے محسوس کیا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اسے چور چور کئے ڈال رہا ہے۔

یہ بوجھ نہ تو موت کا خیال تھا نہ خوف۔ یہ بے نام تھا۔ میرے رخسار جلنے لگے اور سر میں درد ہونے لگا۔ میں نے ایک جھرجھری لے کر اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ٹام نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا۔ مجھے صرف اس کی سفید گردن کی پشت نظر آرہی تھی۔ چھوٹے یوآن کی حالت بدتر تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور ناک کپکپا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جاکر اپنا ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھا جیسے وہ اُسے تسلی دے رہا ہو۔ لیکن اس کی آنکھیں بالکل سرد رہیں۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے یوآن کے بازوؤں سے پھسل کر اس کی کلائی تک جاتے دیکھا۔ یوآن نے کوئی توجہ نہ کی۔ ڈاکٹر نے اس کی کلائی کو تین انگلیوں سے پکڑلیا اور ذرا پیچھے ہٹ کر میری طرف پیٹھ کرلی۔ لیکن میں نے پیچھے کی طرف جھک کر دیکھا کہ اس نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی اور اسے دیکھتا رہا اور ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں نبض کو محسوس کرتی رہیں۔ ایک منٹ کے بعد اس نے ہاتھ چھوڑدیا اور اپنی جگہ پر جاکر دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا اور پھر جیسے یکایک اسے کوئی بات یاد آگئی ہو وہ جیب سے نوٹ بک نکال کر کچھ لکھنے لگا "حرامی کہیں کا" میں نے غصہ سے دل ہی دل میں کہا "اگر ذرا میری نبض تو دیکھے۔ وہ گھونسہ ماروں گا اس کے غلیظ چہرہ پر کہ۔۔۔۔"

وہ میرے پاس نہ آیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر اس سے آنکھیں ملائیں۔ اس نے بڑی بیگانگی سے کہا "تمہیں یہاں ٹھنڈ نہیں معلوم

join eBooks Telegram

ہوتی"۔ وہ خود ٹھنڈ سے نیلا پڑ رہا تھا۔ "مجھے ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی کڑی نظریں نہ ہٹائیں۔ یکایک میں سمجھ گیا اور اپنا ہاتھ چہرہ پر پھیرنے لگا۔ میں پسینہ میں شرابور تھا۔ اس تہہ خانہ میں اتنی سخت سردی اور سیلن کے باوجود مجھے بُری طرح پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بال پسینہ سے چپک گئے تھے۔ اسی لمحہ مجھے احساس ہوا کہ میری قمیص بھیگ کر بدن سے چپک گئی تھی۔ میں ایک گھنٹہ سے پسینہ میں نہا رہا تھا اور مجھے اس کا احساس تک نہ ہوا! لیکن اس سور کے بچے ڈاکٹر نے ایک ایک بات دیکھ لی۔ اس نے پسینہ کے قطرے میرے چہرے سے گرتے دیکھ کر سوچا ہوگا کہ یہ خوف اور دہشت کی حریفانہ کیفیت ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی اسے فخر محسوس ہوا ہوگا کہ وہ بالکل عام آدمیوں کی طرح سردی محسوس کر رہا ہے میرا دل چاہا کہ اٹھ کر اس کا منہ توڑ دوں لیکن ابھی میں نے ذرا حرکت کی تھی کہ میرا غصہ اور شرم بالکل کافور ہو گیا۔ میں بے تعلقی سے بنچ پر لیٹ گیا۔

میں نے رومال سے اپنی گردن پونچھنی شروع کی کیونکہ اب پسینہ کے قطرے بالوں سے گردن تک بہہ رہے تھے جو مجھے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ جلد ہی میں نے پونچھنا چھوڑ دیا کیونکہ یہ بیکار تھا۔ میرا رومال بالکل بھیگ گیا تھا۔ اور پسینہ اب بھی بہہ رہا تھا۔ میری کمر کے نیچے بہت پسینہ بہہ رہا تھا اور میری پتلون بنچ سے چپک گئی تھی۔

یکایک یوآن بولا "آپ ڈاکٹر ہیں؟"

"ہاں۔"

"کیا بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیر تک؟"

"آئیں ۔ ۔ ۔ ۔ کب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں۔" ڈاکٹر نے بڑی شفقت سے کہا "بالکل نہیں۔ یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔" اس نے اس طرح کہا جیسے وہ اپنے کسی مریض کی تشفی کر رہا ہو۔

"لیکن میں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کہہ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی کبھی انھیں دوبارہ گولی چلانا پڑتی ہے۔"

"کبھی کبھی" ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گولیوں کی پہلی بوچھار سے اعضائے رئیسہ بچ جاتے ہیں۔"

"پھر انھیں دوبارہ بندوقیں بھر کر نشانہ لینا پڑتا ہے۔" اس نے ذرا دیر سوچ کر کہا "اس میں وقت لگتا ہے۔"

join eBooks Telegram

اُسے اس وقت کی تکلیف سے بڑا خوف لگ رہا تھا۔ وہ صرف اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ میں نے اس پر کبھی زیادہ غور نہیں کیا تھا اور مجھے تکلیف کے خوف سے پسینہ بالکل نہ آرہا تھا۔

میں اٹھ کر کوئلہ کے ڈھیر تک گیا۔ ٹام چونک پڑا۔ اور اس نے بڑی نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میرے جوتے چرچرا رہے تھے جس سے اسے غصہ آرہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میرا چہرہ بھی اتنا ہی خاکستری ہوگیا ہے جتنا کہ اس کا نظر آرہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اسے بھی خوب پسینہ آرہا تھا۔ آسمان شاندار تھا۔ اس تاریک گوشہ تک روشنی بالکل نہ آرہی تھی۔ لیکن صرف سر اٹھانے سے آسمان نظر آجاتا تھا۔ لیکن اب یہ پہلے جیسا نہ تھا۔ گذشتہ رات اپنی خانقاہ کی کوٹھری سے مجھے آسمان کا بڑا سا ٹکڑہ نظر آجاتا تھا اور دن کے مختلف اوقات میں مختلف یادیں تازہ ہوتیں۔ صبح صبح جب آسمان سخت اور ہلکا نیلا نظر آتا تو مجھے بحر اوقیانوس کے ساحل یاد آتے۔ دوپہر میں اُسے دیکھ کر مجھے سیوآئل کا ایک شراب خانہ یاد آتا جہاں میں نے زیتون اور انتوزہ کھایا تھا اور نزنیلہ پیا تھا۔ سہ پہر میں جب میری کوٹھری میں سایہ ہوتا تب مجھے اسپین کے وہ اکھاڑے یاد آتے جن میں آدمی بیل سے لڑتا ہے اور جس کے نصف حصہ میں سایہ ہوتا ہے اور بقیہ نصف سہ پہر کی لطیف دھوپ سے چمکتا رہتا ہے۔ لیکن آسمان میں اس طرح ساری دنیا کا عکس دیکھنا مشکل تھا۔ اب میں جس قدر چاہتا آسمان کی طرف دیکھتا۔ کیونکہ اس سے کوئی یاد تازہ نہ ہوتی۔ یہ مجھے زیادہ پسند تھا۔ میں واپس آکر ٹام کے قریب بیٹھ گیا۔ کافی وقت گذر گیا۔

ٹام نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ اس کے لئے بولنا ضروری تھا کیونکہ بغیر اس کے وہ اپنی شخصیت کے وجود کے احساس سے بیگانہ نہ ہونے لگتا۔ میں نے سمجھا کہ وہ مجھ سے باتیں کر رہا ہے مگر وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ یقیناً میرے سفید بال اور بہتے ہوئے پسینہ کو دیکھنے سے خائف تھا۔ ہم اس وقت ایک ہی جیسے لگ رہے تھے اور ایک دوسرے کا آئینہ تھے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا جس کا شمار ابھی زندوں میں تھا۔

"تمہاری سمجھ میں آرہا ہے" اس نے کہا "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔"

میں نے بھی آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ میں بھی ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا "کیوں؟ کیا بات ہے؟" "کچھ ہونے والا ہے جو ابھی سمجھ میں آرہا ہے۔"

ٹام کے بدن سے عجیب طرح کی مہک آرہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری سونگھنے

join eBooks Telegram

کی صلاحیت دوسروں سے بہتر ہے۔ میں مسکرایا " جلد ہی تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔"

"یہ بہت مبہم ہے۔" وہ مصر رہا " میں جری رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن کم از کم میں جاننا چاہتا ہوں ۔۔۔۔ سنو۔ وہ ہمیں صحن میں لے جانے والے ہیں۔ اچھا ہے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے کتنے؟

"پانچ یا آٹھ۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

"بہتر ہے۔ آٹھ ہوں گے۔ ان میں سے کوئی چلائے گا:" نشانہ لو" اور مجھے آٹھ بندوقیں اپنی طرف اٹھی نظر آئیں گی۔ میں سوچوں گا کہ کس طرح میں دیوار کے اندر سما جاؤں۔ میں اپنی پیٹھ سے زور لگاؤں گا ۔۔۔ اپنی پوری قوت سے ۔۔۔۔ لیکن دیوار کسی ہیبتناک خواب کی طرح قائم رہے گی۔ میں یہ سب سوچ سکتا ہوں۔ کاش تم جانتے ہوتے کہ میں اس کا کتنی اچھی طرح تصور کر سکتا ہوں۔"

"اچھا بابا اچھا" میں بولا: " میں بھی اس کا تصور کر سکتا ہوں۔"

"تکلیف بہت شدید ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ آنکھ اور چہرہ کا نشانہ لیتے ہیں۔ تاکہ شکل مسخ ہو جائے۔" اس نے شرارتاً کہا " میں ابھی سے زخموں کو محسوس کر سکتا ہوں۔ گذشتہ ایک گھنٹہ سے میری گردن اور سر میں درد ہو رہا ہے۔ صرف درد ہی نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور چیز کل صبح بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوگا۔ اور پھر کیا ہوگا؟"

میں اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ میں خود بھی درد محسوس کر رہا تھا۔ بدن میں درد جیسے بیشمار چھوٹے چھوٹے زخم ہوں۔ ابھی تک میں ان کا عادی نہ ہو سکا تھا لیکن میری حالت اسی جیسی تھی۔ میں اسے کوئی اہمیت نہ دے رہا تھا۔

"پھر" میں نے کہا " پھر تمہاری قبر پر سوسن کے پھول اگیں گے۔"

وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ڈاکٹر کو بھی برابر دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کچھ بھی نہ سن رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہاں وہ کس لئے آیا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ وہ صرف ہمارے جسم دیکھنے آیا تھا۔ انسانی جسم جو زندگی کے باوجود موت کے کرب سے دوچار تھے۔

"یہ سب کسی ہیبتناک خواب کی طرح ہے۔" ٹام کہہ رہا تھا " ہم کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اور ابھی سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ اور بات نکل جاتی ہے ذہن سے محو ہو جاتی ہے، مٹ جاتی ہے۔ میں اپنے ذہن کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد کچھ نہ رہے گا۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں سمجھ سکتا ہوں
۔۔۔۔ اور بات پھر ذہن سے نکل جاتی ہے۔ اور پھر میں اس درد و کرب کے متعلق سوچنے لگتا ہوں۔
گولیاں، دھماکہ۔ میں ایک مادیت پرست ہوں۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔۔۔۔ میرا دماغ خراب نہیں
ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ بات ضرور ہے مجھے اپنی لاش نظر آ رہی ہے۔ یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔ لیکن
یہ مجھے نظر آ رہی ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنی ہی لاش دیکھ رہا ہوں مجھے سوچنا ہے۔۔۔۔ یہ سوچنا
ہے کہ اب میں کچھ بھی نہ دیکھ سکوں گا۔ اور دنیا میں دوسرے سب لوگ لطف اٹھاتے رہیں گے۔
پابلو۔ اس طرح سے سوچنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ تم یقین مانو۔۔۔۔۔ میں رات بھر کسی چیز
کا انتظار کرتا رہا ہوں۔۔۔ لیکن یہ وہ چیز نہیں ہے۔ پابلو۔ یہ ہمارے پیچھے پھیلتی رہے گی۔ بڑھتی رہے گی۔
اور ہم اس کی کوئی تیاری نہ کر سکیں گے۔"

"ابے چُپ رہ" میں بولا "کیا میں تیرے لئے پادری بلا دوں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ابھی سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی نبی کی طرح مجھے پابلو
کہہ کر غیر مرئی انداز میں خطاب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ لیکن
آئرستانی بالعموم ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے ایک ہلکا سا احساس تھا کہ اس کے بدن سے پیشاب
کی مہک آ رہی ہے۔ بنیادی طور پر مجھے ٹام سے کچھ زیادہ ہمدردی نہ تھی۔ اور میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ
محض اس لئے کہ ہم ایک ساتھ مرنے والے ہیں۔ میں کیوں اس سے زیادہ ہمدردی رکھوں۔ ممکن ہے
کہ میرے جذبات بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ مختلف ہوتے۔ مثال کے طور پر ریمون گرس
کے ساتھ۔ لیکن ٹام اور یوآن کی صحبت میں میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ یہ مجھے زیادہ
اچھا لگ رہا تھا۔ ریمون کی صحبت میں بھی زیادہ اثر قبول کرتا لیکن اس وقت میرا دل سخت تھا۔
اور میں ایسا ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ اسی طرح الفاظ چباتا رہا۔ جیسے اس کا ذہن منتشر ہو۔ وہ یقیناً اس لئے بول رہا تھا کہ
اسے سوچنا نہ پڑے۔ اس کے بدن سے پیشاب کی مہک اس طرح آ رہی تھی جیسے وہ مثانہ کا پرانا
مریض ہو۔ فطری طور پر مجھے اس سے اتفاق تھا۔ میں بھی ہر وہ بات کہہ سکتا تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا۔ مرنا
کوئی فطری بات نہیں ہے اور چونکہ میں مرنے والا تھا۔ اس لئے کوئی چیز بھی مجھے فطری نظر نہ آ رہی تھی
کوئلوں کا ڈھیر یا پنچ یا پنڈرو کا کریہہ چہرہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مجھے ٹام کی طرح ان چیزوں
کے متعلق سوچنا کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ مجھے یہ احساس برابر رات کے ہر ہر لمحہ میں رہا تھا کہ ہم بہت سی

join eBooks Telegram

باتیں سوچتے رہیں گے۔ میں نے پہلی بار اُسے بغل سے دیکھا اور وہ مجھے بڑا عجیب وغریب معلوم ہوا اس کے چہرہ پر موت کی نقاب پڑی ہوئی تھی۔ میرا پندار مجروح ہوگیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے میں ٹام کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ اس سے باتیں کی تھیں اور جانتا تھا کہ ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے اور اب ہم محض اس لئے جڑواں بھائیوں کی طرح لگ رہے تھے کہ ساتھ مرنے جارہے تھے۔ ٹام نے بغیر میری طرف دیکھے ہوئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"پابلو۔ میں سوچتا ہوں۔۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا حقیقت ہے کہ ہر چیز ختم ہوجاتی ہے۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "سور کہیں کے! ذرا اپنی ٹانگوں کے درمیان تو دیکھ۔" اس کے پیروں کے درمیان کافی پانی جمع ہوگیا تھا۔ اور پیشاب کے قطرے اس کے پائنچوں سے ٹپک رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے خوفزدہ ہوکر پوچھا۔

"تم اپنی پتلون میں پیشاب کر رہے ہو۔" میں نے اُسے بتا دیا۔

"غلط ہے۔" اس نے غصہ ہوکر کہا "میں پیشاب نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں محسوس ہو رہا ہے۔"

ڈاکٹر ہمارے قریب آیا۔ اس نے بناوٹی شفقت سے پوچھا "کیا تمہاری طبیعت بگڑ رہی ہے؟" ٹام نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر نے پیشاب کی طرف دیکھا مگر خاموش رہا۔

"مجھے بالکل خبر نہیں کہ یہ کیا ہے۔" ٹام نے مجنونانہ انداز میں کہا "لیکن میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے ذرہ برابر خوف نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹام اٹھ کر کونے میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ وہ پتلون کے بٹن بند کرتا ہوا واپس آیا اور بلا کچھ کہے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر کچھ نوٹ کر رہا تھا۔

ہم تینوں اُسے غور سے دیکھتے رہے کیونکہ وہ زندہ تھا۔ اس کے اندر ایک زندہ انسان کے جذبات واحساسات تھے۔ وہ تہہ خانہ میں اس طرح کپکپا رہا تھا جس طرح کسی زندہ انسان کو کپکپانا چاہیئے تھا۔ اس کا تندرست جسم اس کے قابو میں تھا۔ اس کے برعکس ہم بمشکل اپنا وجود محسوس کرسکتے تھے۔ کم ازکم اس طرح نہیں۔ میں اپنی رانوں کے درمیان پتلون کو محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے حوصلہ نہ تھا۔ میں ڈاکٹر کو دیکھتا رہا جو اپنی ٹانگوں پر کھڑا تھا جسے اپنے اعضا پر اختیار تھا، جو کل کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ وہاں ہم بھی تھے، تین سائے جن کا خون خشک ہوچکا تھا۔ ہم اُسے دیکھتے

اور اس کے اندر کی زندگی کو جونک کی طرح چوستے رہے۔

آخرکار وہ یوآن کے پاس گیا۔ کیا وہ پیشہ ورانہ مقاصد کی خاطر اس کی گردن کا معائنہ کرنا چاہتا تھا یا یہ محض ایک وقتی ہمدردی کا جذبہ تھا؟ اگر وہ کسی رحم کے جذبے کے ماتحت ایسا کر رہا تھا تو تمام رات میں پہلی بار اس سے یہ حرکت سرزد ہو رہی تھی۔

اس نے یوآن کے سر اور گردن پر ہاتھ پھیرا۔ لڑکے نے اسے ہاتھ پھیرنے دیا۔ وہ مستقل اسے دیکھتا رہا اور پھر یکایک اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ حالانکہ ان میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ دو سفید چھٹے اس کے موٹے سُرخ ہاتھ کو پکڑے ہوئے تھے مجھے ذرا تشویش سی ہوئی کہ آخر کیا ہونے والا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ٹام کو بھی تشویش تھی لیکن ڈاکٹر نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ وہ بڑی شفقت سے مسکراتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکے نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں دانت سے کاٹنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکھڑاتا ہوا دیوار کے قریب چلا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خوفزدہ ہو کر ہماری طرف دیکھتا رہا۔ شاید یکایک اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ ہم اب اس کی طرح انسان نہ رہ گئے تھے۔ میں ہنسنے لگا اور ایک سنتری چونکتا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا سویا پڑا تھا اور اس کی آنکھیں ہر احساس سے خالی تھیں۔

میں نے بیک وقت اپنے کو بہت پُرسکون اور بہت زیادہ جذباتی محسوس کیا۔ اب میں یہ بالکل نہ سوچنا چاہتا تھا کہ صبح سویرے کیا ہوگا۔۔۔۔ موت کے متعلق بھی نہیں۔ یہ بالکل بیکار تھا۔ مجھے الفاظ اور خلاء کے علاوہ کچھ نہ ملتا۔ لیکن جونہی میں کسی اور چیز کے متعلق سوچنا شروع کرتا۔ مجھے اپنے سینے پر رائفلیں تنی نظر آتیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے مجھے بیس دفعہ سزائے موت دی گئی ہو اور ایک دفعہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ شاید ایک لمحہ کے لئے میری آنکھ لگ گئی تھی وہ مجھے دیوار کی طرف گھسیٹ رہے تھے اور میں ہاتھ پیر مار رہا تھا اور ان سے رحم کی درخواست کر رہا تھا میں چونک اٹھا اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ شاید میں نیند میں چیخ پڑا ہوں۔ لیکن وہ اپنی مونچھیں اینٹھ رہا تھا۔ اور اس نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں چاہتا تو تھوڑی دیر کے لئے سو لیتا۔ میں اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

لیکن میں زندگی کے دو گھنٹے ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے صبح کو جگانے آتے اور میں نیند کا مارا ان کے پیچھے پیچھے چلتا جاتا اور بلا "اُف" تک کئے جان دے دیتا۔ میں یہ نہ چاہتا تھا۔ میں کسی جانور کی طرح نہ مرنا چاہتا تھا۔ میں سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ پھر مجھے بھیانک خوابوں سے ڈر لگتا تھا۔ میں خیالات

join eBooks Telegram

کارخ موڑنے کے لئے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اور اپنی گذری ہوئی زندگی کے متعلق سوچنے لگا۔ یادوں کا ایک ہجوم سا ہوا۔ ان میں اچھی بھی تھیں اور بُری بھی یا کم از کم ان کے متعلق میری یہی رائے تھی۔ ان میں واقعات بھی تھے اور شبیہیں بھی۔ میں نے ایک سودما کو دیکھا جسے ویلینسینا کے تھیٹر میں ایک بیل نے مار ڈالا تھا۔ اپنے ایک چچا کا چہرہ اور ریمون گرس کا چہرہ۔ مجھے اپنی پوری زندگی یاد آئی۔ کس طرح ۱۹۲۶ء میں میں بیکار تھا اور فاقوں سے تقریباً مرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مجھے ایک رات یاد آئی جو میں نے غرناطہ میں تین دن کے فاقے کے بعد ایک بنچ پر گذاری تھی۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ میں مرنا نہ چاہتا تھا۔ اس خیال سے مجھے ہنسی آئی۔ میں کس طرح مسرت، عورت اور آزادی کے لئے پاگلوں کی طرح دوڑتا رہا۔ کیوں؟ میں ہسپانیہ کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں پائی مارگال کا مداح تھا، میں نے انارکسٹوں کی ایک جماعت میں شرکت کرلی تھی۔ میں نے عوامی جلسوں میں تقریریں کیں۔ میں نے ہر چیز کو اتنی اہمیت دی جیسے میں خود لافانی ہوں۔

اس لمحہ مجھے محسوس ہوا جیسے ساری زندگی میرے سامنے کھڑی ہو اور میں نے سوچا یہ زندگی ایک زبردست جھوٹ ہے۔" اس کی کوئی قیمت نہ تھی کیونکہ یہ ختم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں کس طرح لڑکیوں کے ساتھ ہنستا بولتا اور ٹہلتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو میں اپنی چھوٹی سی انگلی بھی ہلانے کی زحمت نہ کرتا۔ میری ساری زندگی میرے سامنے ایک بند تھیلے کی طرح تھی۔ جس میں ہر چیز ابھی باقی ہو۔ ختم نہ ہوئی ہو۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے اس کا محاکمہ کرنا چاہا۔ میں اپنے آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ زندگی بڑی حسین ہے۔ لیکن میں اس پر کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ یہ صرف ایک خاکہ تھا۔ میں نے اپنی ساری زندگی ابدیت کا سوانگ بھرنے میں گذاری اور میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ مجھ سے کوئی چیز بھی نہ چھوٹی تھی۔ بہت سی چیزیں، ایسی چیزیں جن سے میں بے بہرہ رہ جاتا۔ جیسے منزنیلہ کا مزہ یا کارڈز کے ساحل پر موسم گرما میں نہانے کا لطف، لیکن موت نے ہر مزہ کرکرا کردیا تھا۔

ڈاکٹر کو یکایک ایک نیک خیال آیا "میرے دوستو" اس نے کہا "اگر فوجی حکومت نے اجازت دیدی تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ تمہارے پیغام پہنچا دوں گا۔"

ٹام بڑبڑایا "میرا کوئی نہیں ہے۔"

میں بھی خاموش رہا۔ ٹام منتظر رہا اور میری طرف عذر سے دیکھنے لگا "تم کونچہ کے پاس بھی کچھ نہیں کہلانا چاہتے۔"

"نہیں۔"

join eBooks Telegram

میں اس لطیف جذبہ میں کسی شرکت سے متنفر تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔ گذشتہ رات میں نے کو تجہ کے متعلق خود ہی بتا دیا تھا۔ حالانکہ مجھے ایسا ذکر نا چاہیئے تھا۔ میں اس کے پاس ایک سال تک رہا تھا۔ گذشتہ رات صرف پانچ منٹ کی ملاقات کی خاطر میں اپنا ایک ہاتھ قربان کر سکتا تھا۔ اس لئے میں اس کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ اس کا تصور مجھ سے قوی تھا۔ اب اسے دیکھنے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ اور میرے پاس اس سے کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اب میں نے اسے سینہ سے بھی نہ لگایا ہوتا کیونکہ مجھے اپنے پسینہ سے شرابور خاکستری بدن سے وحشت ہو رہی تھی اور مجھے یہ احساس تھا کہ شاید اس کا بدن بھی میرے اندر گھن پیدا کردے۔ کو تجہ میری موت کی خبر سنکر رودے گی۔ چند مہینوں تک اسے زندگی بالکل بدمزہ معلوم ہوگی لیکن پھر بھی یہ میں تھا جو موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ میں نے اس کی نرم حسین آنکھوں کا تصور کیا۔ جب وہ مجھے دیکھتی تو اس کے وجود سے کوئی شئے نکل کر میرے وجود میں شامل ہو جاتی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور اب اگر وہ مجھے دیکھے گی تو اس کی نگاہ مجھ تک آنے کے بجائے اس کی آنکھوں ہی میں ٹھہر کر رہ جائے گی۔ میں تنہا تھا۔

ٹام بھی اکیلا تھا لیکن اس کی حالت مجھ سے مختلف تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا وہ مسکرا کر بنچ کو گھور رہا تھا جیسے وہ مبہوت ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اتنی احتیاط سے بنچ کو چھوا جیسے وہ ڈر رہا ہو کہ کہیں کچھ ٹوٹ نہ جائے اور پھر جلدی سے ہاتھ کھینچ کر کانپنے لگا۔ اگر میں ٹام کی جگہ ہوتا تو بنچ چھو کر دل نہ بہلاتا یہ بھی آئرستانیوں کی ایک حماقت تھی۔ لیکن پھر میں نے بھی محسوس کیا کہ اشیا نے عجیب و غریب روپ دھار لیا ہے۔ وہ معمول سے زیادہ غیر مرئی اور کم ٹھوس نظر آرہی تھیں۔ اس بات کا احساس تازہ کرنے کے لئے کہ میں مر رہا ہوں میرے لئے بنچ، لیمپ اور کوئلے کے ڈھیر وغیرہ کی طرف دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ فطری طور پر میں موت کے متعلق بہت واضح طور پر نہ سوچ سکتا تھا لیکن موت مجھے ہر جگہ اور ہر چیز میں نظر آرہی تھی۔ جیسے چیزیں ایک دوسرے سے دور دور تھیں اور اپنے درمیانی فاصلوں کو قائم کئے ہوئے تھیں۔ جیسے لوگ مرنے والے کی پائنتی اور سرھانے کھڑے دھیرے دھیرے باتیں کر رہے ہوں۔ وہ ٹام کی موت تھی جسے اس نے ابھی ابھی بنچ پر چھو لیا تھا۔

میری جو حالت تھی اس میں اگر کوئی آکر یکایک مجھ سے یہ کہتا کہ میں خاموشی سے اپنے گھر جا سکتا ہوں اور وہ لوگ مجھ سے کوئی تعرض نہ کریں گے تو میں یقیناً بے حس اور سرد ہو جاتا۔ جب انسان کی نظر میں اس کی ابدیت کا سراب بکھر جائے تو پھر چند گھنٹوں یا چند سال کی زندگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا کوئی سہارا نہ تھا۔ ایک طرح سے میں پُرسکون تھا۔ لیکن یہ سکون بڑا خوفناک تھا۔

join eBooks Telegram

میرے جسم کی وجہ سے۔ وہ جسم جس کی آنکھوں سے میں دیکھ رہا تھا، جس کے کانوں سے میں سن رہا تھا اب میں نہ تھا۔ وہ جسم اب خود بخود پسینہ میں نہا رہا تھا۔ کانپ رہا تھا اور میں اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خود میرے جسم میں کیا ہو رہا ہے، مجھے اپنے بدن کو چھونا اور دیکھنا پڑتا جیسے یہ جسم میرا نہ ہو کسی اور کا ہو۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ ڈوب رہا ہے یا ابھر رہا ہے۔ وہی احساس جو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہوتا ہے جب وہ نیچے غوطہ لگاتا ہے یا اوپر کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے۔ میں اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا لیکن اس سے یہ اعتماد بحال نہ ہوتا۔ ہر چیز جو میرے بدن سے تعلق رکھتی وہ مبہم ہوتی۔ زیادہ تر سکون رہتا اور مجھے سوائے ایک طرح کے وزن کے اور کچھ محسوس نہ ہوتا جیسے میں اپنے مقابلہ پر کوئی خبیث وجود یا کسی بہت بڑے کیڑے سے بندھا ہوا ہوں۔ ایک بار میں نے اپنا پتلون دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ بھیگا ہوا ہے۔ پتہ نہیں وہ پسینہ تھا یا پیشاب لیکن احتیاطاً میں کوئلے کے ڈھیر تک پیشاب کرنے چلا گیا۔

ڈاکٹر نے گھڑی نکالی اور اسے دیکھ کر بولا "اس وقت ساڑھے تین بجے ہیں۔" حرامی کہیں کا! اس نے یقیناً جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ ٹام اچھل پڑا۔ ہم بھول گئے تھے کہ وقت گذرا جا رہا ہے۔ رات ہمارے چاروں طرف کسی بے ہیئت سنگین مادہ کی طرح محیط تھی۔ مجھے یہ بھی نہ یاد آسکا کہ یہ شروع ہو چکی ہے۔

کم عمر لڑکا رونے لگا۔ وہ اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر چلایا "میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔" وہ فضا میں ہاتھ ہلاتا ہوا پورے تہہ خانے میں دوڑنے لگا۔ اور پھر ایک چٹائی پر گر کر رونے لگا۔ ٹام نے اسے تشفی دینے کی ذرہ بھر خواہش کے بغیر اسے غمناک نظروں سے دیکھا کیونکہ غمگساری کی کوشش بیکار تھی۔ لڑکا ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا لیکن اس پر ہم سے کم اثر تھا۔ اس کی حالت اس مریض کی تھی جو بخار سے بیماری کا مقابلہ کرتا ہے کیونکہ جب بخار نہیں رہتا تو حالت زیادہ تشویشناک ہو جاتی ہے۔

وہ رو رہا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ موت کے متعلق نہیں سوچ رہا ہے بلکہ اپنے اوپر رحم کھا رہا ہے۔ ایک سکنڈ۔ صرف ایک لمحہ کے لئے میں خود بھی رونا چاہتا تھا اور اپنے اوپر رحم کھانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ میں نے لڑکے کی طرف نگاہ اٹھائی اور اس کے منحنی شانوں کو ہچکیوں کی وجہ سے ہلتا دیکھ کر لیکایک میرا دل سخت ہو گیا۔ میں نہ تو اپنی ذات پر رحم کھا سکتا تھا نہ دوسروں پر۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "میں بہت صفائی سے مرنا چاہتا ہوں۔"

ٹام کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ چھت کے سوراخ کے نیچے کھڑا آسمان پر صبح کی روشنی دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفاست سے مرنے کا عزم کر لیا تھا اور میں صرف اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لیکن جب سے ڈاکٹر نے وقت بتایا تھا۔ میں وقت کو پرواز کرتے، قطرہ قطرہ کر کے بہتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں نے ٹام کی آواز سُنی "تم سن رہے ہو۔"

"ہاں۔"

لوگ باہر میدان میں ایک ساتھ چل رہے تھے۔

"وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ وہ اندھیرے میں تو گولی بھی نہیں چلا سکتے۔"

تھوڑی دیر کے بعد آوازیں بند ہو گئیں۔ میں نے ٹام سے کہا "صبح ہو گئی۔"

پیڈرو جمائی لیتا ہوا اٹھا اور لیمپ بجھانے کے لئے آیا "جہنم کی طرح سرد ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

تہہ خانہ میں ملگجا اجالا تھا۔ ہم نے دور گولیاں چلنے کی آواز سُنی۔

"اب شروع ہو رہا ہے۔" ٹام بولا "وہ پیچھے میدان میں ایسا کر رہے ہیں۔"

ٹام نے ڈاکٹر سے ایک سگرٹ مانگا۔ مجھے سگرٹ کی ضرورت نہ تھی۔ میں نہ سگرٹ چاہتا تھا نہ شراب۔ اس کے بعد سے پھر گولیوں کی آواز کبھی بند نہ ہوئی۔

"تمہیں معلوم ہے کیا ہو رہا ہے۔" ٹام بولا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو کر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا اور ایک لفٹیننٹ چار سپاہیوں کے ہمراہ داخل ہوا۔

"اسٹنبابک"

ٹام نے جواب نہ دیا۔ پیڈرو نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"یوان مرابل۔"

"چٹائی پر۔"

"اٹھو" لفٹیننٹ نے کہا

یوآن بالکل نہ ہلا۔ دو سپاہیوں نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کر دیا لیکن جیسے ہی انھوں نے اسے چھوڑا وہ پھر گر پڑا۔

"یہ کوئی پہلا شخص تو نہیں ہے جس کی حالت خراب ہے۔" لفٹیننٹ بولا "تم دونوں اسے لے جاؤ۔ وہاں وہ سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔" وہ ٹام کی طرف مڑا۔

"چلیں۔"

join eBooks Telegram

تام دو سپاہیوں کے درمیان چلا گیا۔ بقیہ دو سپاہی لڑکے کی ٹانگیں اور ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھائے گئے۔ وہ بیہوش نہ ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل کھلی تھیں اور آنسو کے قطرے گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔ جب میں نے باہر جانا چاہا تو لفٹیننٹ نے روک دیا۔ "تم ایلیٹا ہو۔"

"ہاں۔"

"تم یہاں رکے رہو۔ وہ بعد میں تمہارے لئے آئیں گے۔"

وہ چلے گئے۔ ڈاکٹر اور دونوں سنتری بھی چلے گئے۔ میں تنہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ بہتر ہوتا کہ وہ میرا کام بھی تمام کر دیتے۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد برابر گولیاں چلنے کی آواز سنتا اور ہر ایک دھماکہ سنکر کانپ کانپ اٹھتا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چلاؤں اور سر کے بال نوچوں۔ لیکن میں نے اپنے دانت کس کر بند کر لئے تھے اور دونوں ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ڈال لیا۔ کیونکہ میں اچھی طرح رہنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد وہ مجھے لینے کے لئے آئے اور پہلی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جہاں خوب گرمی تھی اور سگار کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ آرام کرسیوں پر دو افسر گھٹنوں پر کاغذات رکھے بیٹھے سگار پی رہے تھے۔

"تم ایبٹیا ہو۔"

"ہاں۔"

"ریمون گرس کہاں ہے۔"

"معلوم نہیں۔"

سوالات کرنے والا موٹا آدمی چھوٹے قد کا تھا۔ محدب شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں بڑی سنگین تھیں۔

"یہاں آؤ۔" وہ بولا۔

میں اس کے پاس گیا۔ اس نے اٹھ کر میرے بازو پکڑ لئے اور ایسی کڑی نظروں سے دیکھا جو مجھے زمین پر گرا دینے کے لئے کافی تھیں۔ اس نے میرے بازوؤں کو پوری قوت سے دبایا۔ مجھے تکلیف بالکل نہ ہو رہی تھی۔ یہ محض ایک تماشہ تھا جس سے وہ میرے اوپر قابو حاصل کرنا چاہتا تھا اور پھر وہ اپنا گندہ سانس میرے منہ پر چھوڑ رہا تھا۔ ہم ایک لمحے کے لئے اسی طرح کھڑے رہے اور میرا جی چاہا کہ میں ہنس دوں۔ ایک ایسے آدمی پر دھونس جمانا ذرا مشکل ہے جو مرنے کے لئے جا رہا ہو۔

join eBooks Telegram

اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس نے مجھے زور سے دھکیل دیا اور بیٹھ گیا۔

"اب اس کی یا تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ تم اس کا پتہ بتا کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔"

یہ گھوڑ سواروں کی وردی اور بوٹ پہنے ہنٹر لے کر اکڑنے والے لوگ بھی مرنے والے تھے لیکن مجھ سے ذرا دیر بعد۔ زیادہ دیر بعد نہیں۔ وہ اپنے کاغذات میں لوگوں کے نام تلاش کرتے پھرتے اور دوسروں کو دبانے اور قید کرنے کے چکر میں رہتے۔ ہسپانیہ کے مستقبل اور دوسرے موضوعات اور مسائل پر ان کے اپنے مخصوص نقطۂ ہائے نظر تھے۔ ان کی یہ چھچھوری حرکتیں مجھے حیرت انگیز بلکہ مضحکہ خیز معلوم ہوئیں۔ میں خود کو ان کی جگہ پر رکھ کر سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میرے خیال میں وہ پاگل تھے۔

پستہ قد آدمی اپنا چابک بوٹ پر مار رہا تھا۔ اور مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی تمام حرکتیں بہت سوچی سمجھی تھیں۔ ان کے ذریعہ وہ خود کو ایک خوفناک وحشی درندہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

"پھر؟ سمجھ میں آیا؟"

"مجھے پتہ نہیں کہ گرس کہاں ہے۔" میں نے جواب دیا "میرے خیال میں وہ میڈرڈ میں ہوگا۔"

دوسرے افسر نے اپنا زرد ہاتھ بڑے تکلف سے اٹھایا۔ اس کا یہ تکلف سوچا سمجھا تھا۔ میں ان کی ایک ایک حرکت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں اس قسم کی حرکتوں میں مزا آتا ہے۔

"تمہیں سوچنے کے لئے پندرہ منٹ کی مہلت ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "اسے لانڈری میں لے جاؤ اور پندرہ منٹ کے بعد واپس لاؤ۔ اگر یہ اس کے بعد بھی بتانے سے انکار کرے گا تو اسے فوراً گولی مار دی جائے گی۔"

وہ کچھ کر رہے تھے اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری ساری رات انتظار میں گزری تھی۔ پھر اس کے بعد انہوں نے تہہ خانہ میں ایک گھنٹہ اور انتظار کرایا تھا اور اس دوران میں ٹام اور یوان کو گولی مار دی تھی اور اب مجھے لانڈری میں بند کر رہے تھے۔ انھوں نے یہ ساری اسکیم گذشتہ رات ہی بنالی ہوگی۔ انھیں یقین ہوگا کہ بالآخر اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ مجھ پر قابو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

انھیں شدید غلط فہمی تھی۔ لانڈری میں میں ایک بنائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ لیکن میں ان کی تجویز پر بالکل نہ غور کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ گرس کہاں ہے۔ وہ شہر سے دو تین میل دور اپنے رشتہ کے بھائیوں کے گھر چھپا ہوا تھا۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک وہ مجھے اذیت

نہ دیں گے میں انہیں ہرگز نہ بتاؤں گا۔ (لیکن شاید ان کا اذیت دینے کا کوئی ارادہ نہ تھا) یہ سب بالکل سوچی سمجھی باتیں تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صرف اپنے رویے کے اسباب سمجھنا چاہتا تھا۔ گرس کا پتہ بتانے کے بجائے میں مرنا پسند کروں گا۔ کیوں؟ مجھے ریمون گرس سے اب کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سحر سے پہلے میری اس کی دوستی اسی طرح دم توڑ چکی تھی جس طرح میری امد کو لچہ کی محبت یا میری زندہ رہنے کی خواہش۔ بیشک یہ اس کے متعلق بہت اچھی رائے تھی۔ وہ بڑا جفاکش تھا۔ لیکن یہ وہ وجہ نہ تھی جس کی بدولت میں اس کی خاطر جان دینے پر آمادہ تھا۔ جس طرح میری زندگی بے قیمت تھی۔ اسی طرح اس کی زندگی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کسی کی زندگی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ لوگ آدمی کو دیوار سے باندھ کر گولی مارنے والے تھے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ وہ آدمی میں ہوں یا گرس۔ میں جانتا تھا کہ ہسپانیہ کی فلاح کے لئے وہ مجھ سے زیادہ مفید تھا لیکن جہنم میں جائے ہسپانیہ اور انارکی۔ اب کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ پھر بھی میں یہاں تھا اور میں گرس کا پتہ بتا کر اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

مجھے یہ بات مضحکہ خیز نظر آئی۔ یہ محض ضد تھی۔ میں نے سوچا "مجھے اپنی جگہ اٹل رہنا چاہیئے" اور میں ایک مضحکہ خیز مسرت سے معمور ہو گیا۔

وہ آئے اور مجھے پھر ان دو افسروں کے پاس لے گئے۔ ایک چوہا میرے پیر کے پاس سے بھاگا۔ میں نے ایک سپاہی سے پوچھا "تم نے دیکھا اس چوہے کو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سنجیدہ تھا اور اپنے کو اہم سمجھتا تھا۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی لیکن میں نے ضبط کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک دفعہ میں نے ہنسنا شروع کر دیا تو پھر ضبط کرنا مشکل ہو جائے گا۔ سپاہی کے مونچھیں تھیں۔ میں نے اس سے کہا "او کمینے۔ تمہیں اپنی مونچھیں مونڈ دینی چاہئیں۔" مجھے یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوئی کہ وہ اپنی زندہ شخصیت پر اپنے بالوں کو چھا جانے دے۔ اس نے بلا کسی اعتماد کے مجھے ٹھوکر ماری اور میں خاموش رہا۔

"ہاں" اسی موٹے افسر نے کہا "تم نے سوچ لیا اس کے متعلق؟"

میں نے اس استعجاب سے اس کی طرف دیکھا جیسے کوئی بڑے نایاب قسم کے کیڑے کی طرف دیکھے۔ میں نے کہا "میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ وہ قبرستان میں چھپا ہوا ہے۔ گورکن کے مکان کے ایک کمرہ میں۔"

یہ محض بکواس تھی۔ میں چاہتا کہ وہ اٹھ کر تیاریاں کریں۔ اور احکامات جاری کریں

وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے "مولس۔ آؤ چلیں۔ لفٹیننٹ لورینز سے پندرہ آدمی اور لے لو" "تم" پستہ قد افسر بولا۔ "اگر تم نے ٹھیک بتایا ہے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا لیکن اگر تم ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔"

وہ خاصے ہنگامہ خیز انداز میں چلے گئے۔ اور میں اطمینان سے ان سپاہیوں کے ساتھ رہ گیا۔ ان کی آئندہ حرکتوں کا رہ رہ کے خیال آتا۔ اور میں مسکرا دیتا۔ میں تصور میں انھیں ایک ایک کرکے قبریں کھودتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس مسئلہ پر اس طرح سوچنا شروع کیا جیسے میں کوئی اور ہوں۔ وہ قیدی جو کسی ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا ہو اور وہ افسر اپنی مونچھوں اور بادردی سپاہیوں ——— کے ساتھ قبروں کے درمیان دوڑ رہے ہوں۔ یہ بہت ہی مضحکہ خیز تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد پستہ قد کا موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ میری موت کا حکم دینے آیا ہے۔ دوسرے یقیناً قبرستان میں رہ گئے ہوں گے۔

افسر نے میری طرف دیکھا۔ وہ احمق بالکل نہ لگ رہا تھا: اسے دوسروں کے ساتھ بڑے صحن میں لے جاؤ۔ اس نے کہا" فوجی کارروائیوں کے بعد ایک باقاعدہ عدالت اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے دریافت کیا "پھر وہ۔ ۔ ۔ وہ ابھی مجھے گولی نہ ماریں گے!"

"ابھی بہرحال نہیں۔ بعد میں کیا ہوتا ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا "لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کندھے ہلا کر رہ گیا۔ سپاہی مجھے لے کر چلے گئے۔ بڑے صحن میں تقریباً سو قیدی تھے جن میں عورتیں بچے اور کچھ بڈھے تھے۔ میں صحن کے وسط میں گھاس کے ایک قطعہ کے گرد ٹہلنے لگا۔ میں مبہوت تھا۔ دوپہر میں انھوں نے ہمیں کھانے کے کمرہ میں کھانا کھلایا۔ دو تین آدمیوں نے مجھ سے سوالات کئے۔ میں ان کو ضرور جانتا رہا ہوں گا لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا مجھے بالکل پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام کے قریب انھوں نے دس نئے قیدیوں کو صحن میں داخل کیا۔ میں نے گرسیا نانبائی کو پہچان لیا۔ وہ بولا "تم کتنے قسمت والے ہو۔ مجھے امید نہ تھی کہ تمہیں زندہ دیکھوں گا۔"

"انھوں نے مجھے موت کی سزا دی اور پھر اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کا سبب میری سمجھ میں

join eBooks Telegram

نہیں آتا۔"

"مجھے انھوں نے دو بجے گرفتار کر لیا" گریسیا بولا۔

"کیوں۔" گریسیا کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔

"پتہ نہیں کیوں۔" وہ بولا" وہ ان تمام لوگوں کو گرفتار کر لیتے ہیں جن کا انداز فکر ان سے مختلف ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا "گرسن بھی پکڑا گیا۔"

میں کانپ اٹھا "کب"؟

"آج صبح۔" غلطی اسی کی ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں کا گھر منگل کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ اسے چھپانے کے لئے تیار تھے مگر وہ کسی کا احسان لینے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے کہا۔ "میں جا کر ابیٹیکے گھر چھپ جاتا مگر انھوں نے اسے گرفتار کر لیا ہے اس لئے میں" قبرستان میں چھپوں گا۔"

"قبرستان میں"

"ہاں۔ کیا حماقت تھی۔ بلاشبہ وہ آج وہاں پہنچ گئے۔ یہ ہونا ہی تھا۔ انھوں نے اسے گورکن کے گھر میں پکڑ لیا۔ اس نے ان پر گولی چلائی مگر انھوں نے اسے پکڑ لیا۔"

"قبرستان میں!"

میری نگاہوں کے سامنے ہر چیز ناچنے لگی اور میں زمین پر بیٹھ گیا۔ میں اس قدر ہنسا کہ رو پڑا۔

اردو کے جواں سال اور خوش فکر شاعر
ناصر شہزاد کی غزلوں کا مجموعہ
چاندنی کی پتیاں
مکتبۂ گفتار منٹگمری

join eBooks Telegram

پانچ نظمیں

- بنتِ لمحات
- لوگو، اے لوگو
- بازآمد
- بے تعلقی
- کوزہ گر

اخترالایمان

یہ پانچ نظمیں اخترالایمان کے زیرِ طبع مجموعۂ کلام "بنتِ لمحات" سے لی گئی ہیں۔
اخترالایمان کی پچیس ۲۵ نئی اور غیر مطبوعہ نظموں پر مشتمل یہ مجموعہ مکتبۂ سوغات سے شائع ہو رہا ہے

❁

join eBooks Telegram

اختر الایمان

join eBooks Telegram

اختر الایمان

بنتِ لمحات

تمہارے لہجے میں جو گرمی و حلاوت ہے
اسے بھلا سا کوئی نام دو وفا کی جگہ
غنیمِ نور کا حملہ کہو اندھیروں پر
دیارِ درد میں آمد کہو مسیحا کی
رواں دواں ہوئے خوشبو کے قافلے ہر سو
خلائے صبح میں گونجی سحر کی شہنائی
یہ ایک کہرہ سا، یہ دھند سی جو چھائی ہے
اس التہاب میں، اس سرمگیں اجالے میں
سوا تمہارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔
حیات نام ہے یادوں کا تلخ اور شیریں
بھلا کسی نے کبھی رنگ و بو کو پکڑا ہے؟
شفق کو قید میں رکھا صبا کو قید کیا؟
یہ ایک لمحہ گریزاں ہے، جیسے دشمن ہے
نہ تم ملو گی نہ میں، ہم بھی دونوں لمحے ہیں
وہ لمحے، جا کے جو واپس کبھی نہیں آتے۔

join eBooks Telegram

اخترالایمان

لوگو، اے لوگو

مری انتہائے محبت، مسرت سوا اس کے کیا اور ہوگی
بجائے کوئی مسندِ عالیہ، تختِ طاؤس و زر مانگنے کے
بجائے کوئی سر برآوردہ، بہترِ صفت شخصیت چاہنے کے،
تمہاری معیت، رفاقت "تگ" و دو کا انداز مانگوں۔
یہ حجمِ غفیر ایک سیلِ رواں زندگی کا جو "لا" سے نکل کر،
اسی "لا" میں پھر ڈوب جاتا ہے۔ یہ ریت ہے یونہی جاری۔
سمندر، جو پھیلا ہے ہر سمت افق سے افق تک،
سمندر جو ہے آئینہ دارِ ہستی، جہادِ مسلسل، کشاکش،
سمندر، جو سفاک ہے اور طوفاں سے بریز ہے، پُر جنوں ہے،
سمندر جو بیباک ہے، جنم داتا ہے اور موت کا نغمہ سرمدی ہے،
یہ سیلِ رواں جو یوں بہتا رہتا ہے، اس سیل میں ڈوب جاؤں۔
میں جو ایک قطرہ ہوں، گہرائی، گیرائی کا، حجم کا اس کے بن جاؤں حصہ۔
مجھے کوئی مکتی نہیں چاہئے۔ کوئی نروان کی آرزو کوئی خواہش، تمنا
کوئی سلسبیل اور کوثر، نجات و جزا، پر سکوں کوئی لمحہ
نہیں، صرف امواج کی شورشِ رائیگاں چاہئے۔ یہ اگر رائیگاں ہے۔!

join eBooks Telegram

اختر الایمان

بازآمد

تتلیاں ناچتی ہیں۔
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہو جو،
کان میں کہتی ہو خاموشی سے۔ کہی
اور ہر پھول ہنس پڑتا ہے سن کر یہ بات۔ ہنسا

دھوپ میں تیزی نہیں
ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے،
دستِ شفقت ہے مری عمر کی محبوبہ کا۔ بڑی
اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے،
جیسے میں نیند میں ہوں۔

عورتیں چرخے لئے بیٹھی ہیں۔
کچھ کپاس اوٹتی ہیں۔
کچھ سلائی کے کسی کام میں مصروف ہیں یوں
جیسے یہ کام ہے دراصل ہر اک شے کی اساس

join eBooks Telegram

ایک سے ایک چُہل کرتی ہے۔
کوئی کہتی ہے "مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکا رہی مری ساس"۔
کوئی کہتی ہے "بھری چاندنی آتی نہیں راس"۔
رات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
بات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
"لذتِ وصل ہے آزار" کوئی کہتی ہے۔
"میں تو بن جاتی ہوں بیمار" کوئی کہتی ہے۔
میں گھسا آتا ہوں اس شیش محل میں دیکھو
سب ہنسی روک کے کہتی ہیں "نکالو اس کو"

اک پرندہ کسی اک پیڑ کی ٹہنی پہ چہکتا ہے کہیں۔
ایک گاتا ہوا یوں جاتا ہے دھرتی سے فلک کی جانب،
پوری قوت سے کوئی گیند اچھالے جیسے۔
اک پھُدکتا ہے ہر اک شاخ پہ جس طرح کوئی
آمدِ فصلِ بہاری کی خوشی میں ناچے۔
گوندنی بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے،
نازنیں جیسے ہے کوئی یہ بھری محفل میں
اور مکل ہاتھ ہوئے ہیں پیلے۔

کوئلیں کوکتی ہیں،
جامنیں پکّی ہیں، باغوں پہ بہار آئی ہے۔
ارغنوں بجتا ہے یکجائی کا
نیم کے پیڑوں میں جھولے ہیں جدھر دیکھو اُدھر

ساؤنی گاتی ہیں سب لڑکیاں آواز ملا کر ہر سو
اور اس آواز سے گونج اٹھتی ہے بستی ساری۔
میں کبھی ایک، کبھی دوسرے جھولے کے قریں جاتا ہوں
ایک ہی کم ہے، وہی چہرہ نہیں
آخرش پوچھ ہی لیتا ہوں کسی سے بڑھ کر
"کیوں، حبیبہ نہیں آئی اب تک ؟
کھلکھلا پڑتی ہیں سب لڑکیاں سن کر یہ نام
"لو یہ سپنے میں ہیں" کہتی ہے کوئی
"باؤلی سپنا نہیں شہر سے آئے ہیں ابھی"
دوسری ٹوکتی ہے۔
بات سے بات نکل چلتی ہے
"ٹھاٹ سے آئی تھی بارات" چنبیلی نے کہا
"بینڈ باجا بھی تھا" دیپا نے کہا
"اور دلہن پہ ہوا کتنا بکھیر"
کچھ نہ کچھ کہتی رہیں سب ہی مگر میں نے صرف
اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی کہ نہیں ؟
جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری۔
"کیوں نہیں بہتی" چنبیلی نے کہا
اور وہ برگد کا گھنا پیڑ کنارے اس کے ؟
"وہ بھی قائم ہے ابھی تک یوں ہی"

وعدہ کر کے جو حبیبہ نہیں آتی تھی کبھی
آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جا کر

join eBooks Telegram

اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

ماہ و سال آتے چلے جاتے ہیں
فصل پک جاتی ہے، کٹ جاتی ہے
کوئی روتا نہیں اس موقعہ پر۔
حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپا کر ڈھالیں
کوئی زنجیر نہ ہو،
زلیست در زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے !

بھیڑ بچوں کی ہے چھوٹی سی گلی میں دیکھو
ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آکے مجھے
میں نے جا پکڑا اسے دیکھی ہوئی صورت تھی
"کس کا ہے"؟ میں نے کسی سے پوچھا
"یہ حبیبہ کا ہے"۔ رمضانی قصائی بولا
بھولی صورت پہ ہنسی آگئی اس کی مجھ کو
وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے
دیر تک ہنستے رہے۔ !!

تتلیاں ناچتی ہیں،
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہو جو،
کان میں کہنی ہے خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسِ پڑتا ہے سن کر یہ بات

join eBooks Telegram

دخترالایمان

بے تعلقی

شام ہوتی ہے، سحر ہوتی ہے، یہ وقت رواں
جو کبھی سنگِ گراں بن کے مرے سر پہ گرا
راہ میں آیا کبھی میری ہمالہ بن کر،
جو کبھی عقدہ بنا ایسا کہ حل ہو نہ سکا
اشک بن کر مری آنکھوں سے کبھی ٹپکا ہے،
جو کبھی خونِ جگر بن کے مژہ پر آیا۔
آج بے واسطہ یوں گزرا چلا جاتا ہے
جیسے میں کشمکشِ زیست میں شامل ہی نہیں!!

join eBooks Telegram

اختر الایمان

کوزہ گر

کہیں قومیت ہے کہیں ملک و ملت کی زنجیر ہے۔
کہیں مذہبیت، کہیں حریت ہر قدم پر عناں گیر ہے۔
اگر میں یہ پردے ہٹا دوں جنہیں لفظِ "ماضی" سے تعبیر کرتے رہے ہیں،
اگر میں حدودِ زمان و مکاں سب مٹا دوں،
اگر میں یہ دیواریں جتنی کھڑی ہیں گرا دوں،
تو ہر قید اٹھ جائے، یہ زندگی جو قفس ہے
یونہی دیکھتے دیکھتے تیلیاں سب بکھر جائیں اس کی،
اور انسان اپنے صحیح روپ میں ہر جگہ دے دکھائی۔
کسی غار کے منہ پہ بیٹھا، کسی سخت الجھن میں غلطاں،
کہیں شعلہ دریافت کرنے کی خواہش میں پیچاں،
کہیں زندگی کو نظام و تسلسل میں لانے کا خواہاں
جہاں کو حسیں دیکھنے کی تمنا میں کوشاں
زمیں دور تک ایسے پھیلی ہوئی ہے
کشادہ کوئی خوانِ نعمت ہے جیسے،

جہاں کوئی پہرہ نہیں، کوئی تخصیص و تفریقِ انساں
یہ سب کی ہے، سب کے لئے، یہاں سب ہیں مدعو۔

○

میں اس شخص کو ڈھونڈتا ہوں جو بانیٔ شر ہے
جو نبیوں، رسولوں کی محنت کو برباد کرتا رہا ہے
میں اس شخص کو ڈھونڈتا ہوں جو ہر دور میں بے محابا
نئے بھیس میں سامری بن کے آتا ہے اور موہتا ہے دلوں کو،
اسے ڈھونڈتا ہوں، میں جس نے ہر اک خوانِ نعمت پہ پہرے لگائے
زمیں کو زمیں سے الگ کر دیا سینکڑوں نام دے کر۔
اجارے کی بنیاد ڈالی، کیا جاری پروانۂ راہداری۔
بجائے حسیں اعلیٰ قدروں کے، تاسیسِ عالم
رکھی مصلحت پر، مفادات پر، خود پرستی پہ ساری
اور انسان کو خام اشیا میں تبدیل کر کے،
بہت پہلے اس سے کہ انسان، انسان بنتا
اسے ایک شطرنج کا چوبی مہرہ بنا کر
مقابل کھڑا کر دیا ایک کو دوسرے کے۔

○

کہاں ہے وہ قوت، وہ ہستی جو ہر عصر کی روح بن کر

join eBooks Telegram

فضاؤں کو مسموم کرتی ہے، لاشوں سے بھر دیتی ہے خندقوں کو۔
میں للکارتا ہوں اسے وہ اگر اتنا ہی جادوگر ہے
تو سورج کو مشرق کے بدلے نکالے کبھی جا کے مغرب سے اک لمحہ بھر کو۔
ہواؤں کی تاثیر بدلے، پہاڑوں کو لاوے میں تبدیل کر دے۔
سمندر سکھا دے، ہر اک جلتے صحرا کو زرخیز میداں بنا دے۔
اصول مشیت بدل دے، زمیں آسمانوں کے سب سلسلے توڑ ڈالے۔

○

مگر میں اُسے کیسے للکار سکتا ہوں یہ تو خدا ہے !
حیات و نمو کی وہ قوت، "تغیر"، جو خود سامری ہے
جو انساں کو غاروں سے لے کر گزرتا ہوا مختلف منزلوں سے
یہاں آن پہونچا ہے۔ خود مسخ کرتا ہے چہرے بنا کر۔
یہ وہ کوزہ گر ہے اسی ایک مٹی کو ہر بار متھ کر
بنا کر نئے ظرف رکھتا ہے کچھ دیر شیشوں کے پیچھے سجا کر
انہیں خود ہی پھر توڑ دیتا ہے۔ سب ظرف، کوزے، قوانین اخلاق سارے۔
جہاں اتنی شکلیں بنائی، بگاڑی ہیں، اس قومیت، حریت، مذہبیت کو اک دن
فرامُشگاری کے اس ڈھیر میں پھینک دیگا جہاں ایسی کتنی ہی چیزیں پڑی ہیں۔
کہ یہ چاک تو چل رہا ہے، یونہی آفرینش سے گردش میں ہے اور رہے گا۔

○

join eBooks Telegram

باقر مہدی

اخترالایمان کی پانچ نظمیں

کبھی جب شاعر چُپ چاپ متجسّس نظروں سے تیز رفتار زندگی کو دیکھتا رہتا ہے تو اُسے ایک ساتھ دو باتوں کا خیال آتا ہے ایک تو وہ ان سب سے الگ ہے۔ دوسرے وہ بھی ان میں جذب ہو جانا چاہتا ہے اور اس طرح "تنہائی کا احساس" ختم ہو سکتا ہے مگر اس خیال میں شاعر کی اپنی "بے بضاعتی" کا اعتراف اور "کچھ بننے" کی آرزو چھپی رہتی ہے۔ آخر زندگی کا یہ بحرِ بیکراں کہاں سے کہاں تک پھیلا ہے؟ کیا اس میں کھو جانا ہی زندگی ہے! اس میں ڈوبے ہوئے رہنا اور پھر بھی الگ! کیا انسانی زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔!

یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات برسوں سے شاعروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں اگر شاعر "فلسفی" بن جاتا ہے تو اکثر شاعری اس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ جیسے اقبال کی شاعری اور گھوم پھر کر اُسے شاعر ہی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے مگر خیالات، جذبات اور ان کے ملے جلے تانے بانے سے پیدا تاثرات کے بغیر اچھی شاعری کا تار و پود بھی نہیں بنایا جا سکتا اس لئے شاعر کے لئے جذبات سے زیادہ خیالات سوہانِ روح بن جاتے ہیں وہ کیسے اپنائے کیسے رد کرے؟ اور پھر ان سب کے لئے کون سا نظریہ، کون معیار مقرر کرے؟ —— اس منزل پر پہنچ کر اکثر شعراء مقبول عام معیار اور نظریہ کو اپنا لیتے ہیں اور اس طرح" ادبی کاروبار" کو فروغ دیتے ہیں۔ لیکن اخترالایمان نے ان سب سے بہت الگ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی راہ کچھ الگ ہی بنائی تھی مگر وہی سوال کوئی کہاں تک سب سے الگ: تنہا اپنی راہ پر جانے کی ہمت رکھتا ہے؟ ظاہر ہے یہ کسی حد تک ناممکن ہے۔ اسی لئے ہمیں اخترالایمان کے یہاں زندگی اور شاعری کے بارے میں ایک جانا بوجھا نظریۂ حیات ملتا ہے وہ ہے اشتراکی نقطۂ نظر۔ یہ اگر اکتسابی ہوتا تو ان کی شاعری بھی نعرہ بازی سے بچ نہ سکی ہوتی اور آج اس نظریہ پر خود اس کے "محافظین" نے جو "وار" کئے ہیں کچھ اس کا "احساسِ زیاں" ہوتا۔ مگر نہیں اخترالایمان نہ تو اکتسابی اشتراکی ہیں اور نہ ہی اس تحریک کے سرگرم رکن البتہ وہ ترقی پسند تحریک کے سائے میں ضرور پروان چڑھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں اس تحریک کے عروج و زوال کے اسباب کا احساس نہ ہوتے ہوئے بھی یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ عوامی زندگی سے وابستگی ہی اصل زندگی ہے۔ یہ ان کے یہاں "عقیدے" کی حیثیت رکھتا ہے اسی لئے کتنے ہی طوفان آئیں، نظریات

پاش پاش ہوں، سب سے بڑا اشتراکی سب سے ظالم ثابت ہو جائے مگر ان کے "خیالات" پر آنچ نہیں آتی اس لئے کہ یہ انھوں نے کسی سے حاصل نہیں کئے تھے بلکہ یہ "عقیدہ" تو انھیں زندگی کے چکر میں برسوں گھومنے سے ملا تھا اسی لئے ان کے یہاں باغی اور نکار افکار کی جرأت اظہار، آزادیٔ تقریر وغیرہ دوسرے اس سلسلے سے وابستہ سوالات کی جھلک تک نہیں ملتی کیونکہ انھوں نے ان کو لائق اعتنا ہی نہ سمجھا۔ وہ تو اپنے احساسات اور معاشرہ کی ذہنی اور مادی زندگی کی آویزش یا دبی اور اسکے سرچشمہ ہی کو اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں۔

یہ نئی پانچ نظمیں ان کی دوسری نظموں سے بہت مختلف نہیں ہیں کم از کم میری ناچیز رائے یہی ہے۔ البتہ ان میں وہ اپنے آس پاس کے ہنگاموں (اور وہ اکثر ان سے باخبر رہے ہیں جیسے جنگ، امن کے موضوع پر قافلہ) پر ذرا زیادہ گہری نگاہ ڈالتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں مگر وہ کسی چیز کی "انتہا کے بعد" دیکھنا فضول سمجھتے ہیں انھیں تھوڑے ہی سے "سفر" میں کافی مل جاتا ہے اس لئے بہت آگے کیوں جائیں! —

"ڈگرا ے وگو" اسی سفر کی پہلی منزل کا احساس ہے۔ انھوں نے یہ مان لیا ہے کہ "عام لوگوں کی محبت اور رفاقت" ہی حاصلِ زندگی ہے اور اس محبت میں چھپی نفرت اور رفاقت میں پنہاں دشمنی پر وہ نظر بھی نہیں ڈالنا چاہتے جیسے کہ عام انسان "مجسّم خیر" ہے۔ اول و آخر ایک ہی جذبے سے معمور ہے۔ اس نظم کا سیدھا سادا لب و لہجہ، رواں دواں بحران کے اس جذبے کے اظہار میں بڑی معاون ثابت ہوئی ہے اور طنز کی نشتریت بھی ایک مصرع سے دیکھا ئے کوئی سر برآور دہ پتھر صفت شخصیت چاہنے کے) ابھر آئی ہے۔ وہ کچھ نہیں چاہتے صرف زندگی کے سیل میں ڈوب جانا چاہتے ہیں کیوں؟ یہ سوال اخترالایمان کی شاعری میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے، کیا یہ اقبال کا وہ خیال (جو خود اقبال کا نہیں بلکہ برگساں کے قوت نمو سے لیا گیا تھا) نہیں ہے کہ "زندگی ہر دم جواں پیہم رواں ہے"۔ ظاہر ہے یہ نیا خیال نہیں ہے مگر اخترالایمان پُرسکون لمحے تک کے متلاشی نہیں ہیں کیونکہ انھیں اپنے تجربے سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پھر ایسا کوئی لمحہ نہیں آتا اسی لئے جب نظم کا آخری مصرع آتا ہے تو ایک "ندرت" کی لہر نظم کی فضا پر چھانے لگتی ہے — نہیں صرف امواج کی شورش رائیگاں جا ہیئے۔ یہ اگر رائیگاں ہے"۔ اور اس مصرع کے آخری ٹکڑے نے اس میں "زندگی کی لہر" دوڑا دی ہے اور اس مصرع نے اس کو معمولی نظم کے درجے سے بلند کر دیا ہے ورنہ یہ "خطابت" کی نذر ہو چکی تھی۔

ان نظموں کا مرکزی خیال "ایک معنی میں" ایک ہے یعنی "وقت" اس کی رفتار اس کی تباہ کاری، اس کے فیصلے، اس کی خوبصورتی، اس کو ہی کبھی زندگی کا سیل کہا ہے اور کبھی موسموں کی تبدیلی اور کبھی لمحات کی آمیزش اور جب کبھی "ماضی کے پردے" ہٹائے ہیں تو بھی وہی وقت مختلف روپ میں نظر آیا ہے غرضیکہ "وقت" اخترالایمان کی ان نظموں پر "پوری طرح" سے عکس ریز ہے اور اس کے سائے میں کتنی ہی باتیں، واقعات، اور لوگ یاد آتے ہیں۔ کیونکہ یاد بھی تو وقت کے ایک احساس کا نام ہے۔ وقت جو گہرے سے گہرے گھاؤ کو بھر دیتا ہے اور مستحکم رشتوں کو

join eBooks Telegram

کچے دھاگوں کی طرح توڑ دیتا ہے مگر یہ کونسی قوت ہے کیا صرف قوت نمو ہے؟ انسان اس کے ہاتھوں میں مجبور ہے؟ کہیں یہ مارکس کا تاریخی مادیت کا نظریہ تو نہیں ہے جسے کوئی نہیں روک سکتا ہے وہ سارے بندھن توڑتا ہوا بہتا رہتا ہے لیکن نہیں۔ یہ ہے بھی اور نہیں بھی ـــ اختر الایمان اس کو مارکسی جدلیاتی نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے ورنہ کتنے ہی اور مسئلے اُٹھ کھڑے ہوتے یہی کہ تاریخ میں فرد کا رول اور پھر وہی DETERMINISM - جبریت کا مسئلہ، نورجاں لیوس تک نے اس میں ترمیم کی کوشش کی ہے اور تاریخی شعور کے معیار، صحت اور معقولیت کے مسائل مگر جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ اختر الایمان کو تھوڑے ہی سے "سفر" میں کافی مل جاتا ہے وہ ان سوالات میں الجھ کر" اپنی آواز" کھو دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ وہ اول و آخر شاعر ہیں اور ان کے یہاں افکار کی "جھلکیاں" ملتی ہیں اس کی پیچیدگیاں اور گہرائی نہیں ـــ

"بے تعلقی" میں وہی احساس ابھرا ہے جس کا ابتدائی سطروں میں ذکر کیا گیا تھا یہ میر کے مصرع، سے نکل کر زندگی میں اجنبیت" کے احساس کی ترجمانی کرتی ہے مختصر نظمیں اختر الایمان کی گرفت میں رہتی ہیں (اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ طویل نظمیں نہیں رہتیں) میرا خیال ہے کہ ان کی اکثر مختصر نظمیں شدت تاثر اور انداز بیان کی ندرت کو ایک طویل عرصہ تک زندہ رکھتی ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گذر کر بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے وقت کے ساتھ چلتے رہنا ضروری تھا مگر جب لمحے رک کر ان گذرے ہوئے "لمحوں" پر نظر ڈالی اسی وقت یہ احساس ہوا کہ جیسے اس "کارواں" سے کبھی وابستہ ہی نہ تھے اس "بے تعلقی" کا احساس کچھ اور معنی خیز سوالات اٹھا سکتا تھا مگر اس بات کے خوبصورت اظہار ہی پر اختر الایمان نے "قناعت" کرلی۔ میں نے یہ نظم کتنی ہی بار پڑھی ہے اس کا درد کتنے ہی ہوشمندوں کی "سعی رائیگاں" کی یاد دلاتا ہے جب وقت کے ساتھ ہر لمحہ رہے تو پھر یہ بیگانگی کیسی؟ مگر شاید کوئی شاعر صرف "وقت" کا ہو کر نہیں رہ سکتا اور وہ اس سے وابستہ دوسرے خیالات اور جذبات میں بھی غلطاں رہتا ہے جب ہی تو وہ ایک منزل پر پہنچ کر دیکھتا ہے تو یہ خیال آتا ہے ؎

آج بے واسطہ یوں گذرا چلا جاتا ہے
جیسے میں کشمکش زیست میں شامل ہی نہیں!

"بنتِ لمحات" ایک خوبصورت نظم ہے اس کی ابتدا اور انتہا ہی نہیں بلکہ اکثر مصرعے ترشے ہوئے ہیں۔ بہت نئے نہ سہی مگر دوسرا مصرع ؎ "اسے بھلا سا کوئی نام دو وفا کی جگہ" ـــ واقعی بڑا خوبصورت ہے۔ یہ تین مصرعے ؎ "یہ ایک کہرہ سا، یہ دھند سی جو چھائی ہے،۔ اس التہاب میں اس سرمگیں اجالے میں۔ سوا تمہارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا" ـــ "عشق کی اس کیفیت کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جب دم بخود ہو کر کسی کے وجود کا احساس رہتا ہے مگر یہاں تو یہ "جذبہ" لمحاتی ہے جس کی شدت میں ہی اس کی تیز اثر آفرینی کے ساتھ

join eBooks Telegram

یہ احساس بھی شامل ہے کہ یہ صرف لمحہ ہے۔ اور ایسے لمحے جو کبھی دوبارہ نہیں ملتے ۔۔ اس نظم میں تاثر اسی جدائی کی وجہ ہی سے آیا ہے۔ یہ اچھی خاصی نظم ہے اور ایسی اخترالایمان کے یہاں کتنی ہی نظمیں ہیں۔

البتہ "بازآمد" اخترالایمان کی دوسری نظموں سے کسی حد تک مختلف ہے اس میں "یادیں" کی طرح مختلف تصویریں ہیں مگر اس نظم میں "محبت کی کہانی" کو کچھ ایسے ترتیب دیا گیا ہے کہ ماہیت اور معنویت دونوں اعتبار سے ایک بہت اچھی نظم بن گئی ہے اس کی تیکنیک فلمی "مونتاج" (چھوٹی چھوٹی تصویروں سے ایک تاثر بنانا) سے لی گئی ہے اس میں انداز بیان نہایت سیدھا اور دلنشین ہے اس کی تشبیہوں میں نیاپن اور پرانی بات میں بھی تازگی ہے جیسے ؎

دھوپ میں تیزی نہیں
ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے
دستِ شفقت ہے بڑی عمر کی محبوبہ کا

جیسے یہ کام ہے دراصل ہر اک شے کی اساس

اور جب نظم کے چوتھے حصہ میں جیبہ کی شادی کے بعد یہ ٹکڑا آتا ہے ؎

کچھ نہ کچھ کہتی رہیں سب ہی مگر میں نے صرف
اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی کہ نہیں
جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری
کیوں نہیں بہتی، چنبیلی نے کہا
اور وہ برگد کا گھنا پیڑ کنارے اس کے
وہ بھی قائم ہے ابھی تک یونہی
وعدہ کر کے جو جیبہ نہیں آتی تھی کبھی
آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جاکر
اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

تو میرے اس خیال کو بڑی تقویت ملتی ہے کہ اخترالایمان مکالماتی انداز کے ذریعہ جو تصویر کھینچتے ہیں وہ بظاہر عام سی ہوتے ہوئے بھی بڑی پُراثر ہوتی ہے اور اپنی جگہ نئی بھی ورنہ ندی کنارے برگد کے پیڑ تو کتنے ہی ہوتے ہیں مگر یہاں یہ وقت کا بہتا ہوا دھارا ہے اور برگد یادوں کا گھنیرا پیڑ ہے جو ہمیشہ قائم رہے گا۔ معمولی سی بات

join eBooks Telegram

میں جاذبیت اور شعریت پیدا کر دینا ہی فنکار [illegible] بن جاتا ہے اور اخترالایمان کے یہاں اس کی بھی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں۔

پانچویں حصہ کا یہ مصرعے ؂

ماہ و سال آتے چلے جاتے ہیں
فصل پک جاتی ہے کٹ جاتی ہے
کوئی روتا نہیں اس موقع پر

کتنے سیدھے سادے اور کتنے موثر ہیں خاص کر تیسرا مصرع تو درد کی موجوں میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ بھی بڑا خوبصورت ہے ؂

"بھولی صورت پہ ہنسی آگئی اس کی مجھ کو
وہ بھی ہنسنے لگا ہم دونوں یونہی ہنستے رہے
دیر تک ہنستے رہے"

یہ نظم تکنیک، انداز بیان، تشبیہات، اور شعری کہانی کے امتزاج کی وجہ صرف پُر اثر ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظم ہے۔ درد کی بات میں شگفتگی قائم رکھنا بڑا مشکل امر ہے اور اس کی فضا میں غم کے جگنو ہی کی روشنی ہے مگر زیاں کا احساس نہیں اسی لئے تلخی کی جگہ تیری ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے اس میں ہلکی سی تلخی بھی شامل ہو گئی ہے۔

اس سلسلے کی آخری نظم "کوزہ گر" میں وقت کا "سورج" کافی نیچے آگیا ہے اور ایسا خیال آتا ہے کہ اخترالایمان اب اس کے بارے میں "فیصلہ کن" باتیں کہہ دیں گے مگر وقت پر فیصلہ کرے کون؟ — اور پھر یہ فیصلہ کب تک صحیح رہے گا اور پھر —— !؟

"کوزہ گر" ایک طرف انسانی تہذیب کی مختصر کہانی ہے تو دوسری طرف قوتِ نمو کی "بازیگری" پر طنز بھی ہے اس کی ابتدا اپنے موضوع کے مطابق کافی سنجیدہ ہے اس میں تیزی کی جگہ آہستگی نے ایک قسم کے تفکر کا حسن پیدا کر دیا ہے۔ اور براہ راست تخاطب سے لب و لہجہ میں خاصی حرارت کا احساس ہوتا ہے یہ حصہ خاص طور سے قابلِ غور ہے ؂

"میں اس شخص کو ڈھونڈتا ہوں جو باقی تر ہے
جو رشیوں، رسولوں کی محنت کو برباد کرتا رہا ہے
میں اس شخص کو ڈھونڈتا ہوں جو ہر دور میں بے محابا
نئے بھیس میں سامری بن کے آتا اور موہتا ہے دلوں کو"

مگر اس کو "پالینے" کے بعد شاعر کو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو "حیات و نمو کی قوت" ہے جو خیر و شر میں ڈھلتی رہتی ہے"

join eBooks Telegram

کیسے اور کیوں ؟ — یہی نہیں حسین اعلیٰ قدریں کون کون سی ہیں۔ اس کا بھی کوئی اظہار نہیں کیا گیا ہے ؟ اس کے علاوہ اگر خیر و شر کا سرچشمہ ایک ہے اور ہم پر مختاری کی تہمت لگائی (میر) گئی ہے تو اس زندگی کی بے بسی پر سوچنے سے حاصل جب کہ آدمی انجام کار کچھ نہیں کر سکتے ؟ — مگر اختر الایمان نے اس "دائرہ" (یعنی قوت نمو) میں رہ کر اس کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم کافی (FATALIST) "جبریہ" ہے اور انسان اپنی ساری جرأت کے باوجود "حیات نمو کی قوت" کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا آخری حصہ بھی خاصہ اچھا ہے ؎

یہ وہ کوزہ گر ہے اسی ایک مٹی کو ہر بار متھ کر
بنا کر نئے ظرف رکھتا ہے کچھ دیر شیشوں کے پیچھے سجا کر
انھیں خود ہی پھر توڑ دیتا ہے سب ظرف ٹکڑے، قوانین اخلاق سارے
جہاں اتنی شکلیں بنائی بگاڑی ہیں اس قومیت، حریت، مذہبیت کو اک دن
فراموشگاری کے اس ڈھیر میں پھینک دیگا جہاں کتنی چیزیں پڑی ہیں
کہ یہ چاک تو چل رہا ہے یونہی آفرینش سے گردش میں ہے اور رہے گا

یہ نظم کتنے ہی سوالات ادھورے چھوڑ دیتی ہے اس لئے کہ وقت کی "ستم کاری یا ستم ظریفی" کے اسباب و علل کا بیان یہاں مقصود نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کا شاعر نے کیا ردعمل قبول کیا ہے صرف اس کا اظہار مقصود ہے۔ اس میں کسی جگہ خطابت کا انداز بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں "کھردرے پن کی جھلک" بھی نظر آتی ہے مگر اصل بات تو یہ ہے کہ وقت کے بارے میں اختر الایمان کی فکر زیادہ دور نہیں جاتی۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے آگے کسی فلسفی یا سائنسداں کی مدد سے کبھی گئے ہیں نہ جائیں گے اس لئے کہ وہ شاعر ہیں انھیں اپنے پر پورا بھروسہ ہے اور وہ اس "کامرانی" سے مطمئن ہیں اس کے بعد بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔

مجموعی طور سے یہ نظمیں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ اختر الایمان زندگی کے مسائل پر زیادہ غور و فکر سے سوچنے لگے ہیں۔ اس کے ساتھ شعریت کو پوری طرح سے برتنا بھی ان کے ایک بہت اچھے شاعر ہونے کا بین ثبوت ہے اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ آج اردو کے جدید نظم گو شعراء میں ان کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے مگر جیسا کہ میں نے ایک گفتگو میں ان سے عرض کیا تھا کہ یہ ساری نظمیں (پچھلے دو تین مہینے میں اختر الایمان نے قریب پچیس نظمیں کہی ہیں) ایک واقعی عظیم نظم کا پیش خیمہ ہیں اور جس کی انھیں بھی فکر ہے۔ وہ "شاہکار" اس "پس منظر" میں اور بھی تابناک نظر آئے گا۔ آج شاعر کا بجیدا الجھے اور خطرناک حد تک مشکل مسائل سے سابقہ ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس "تصادم" میں کون جیتتا ہے، مسائل یا شاعر ؟ —

join eBooks Telegram

شروَن کمار ورما

"اے لالۂ صحرائی"

جب میں نے پہلی مرتبہ ساوتری کو سُرکھ کے ساتھ دیکھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے چنبیلی کا ننھا نازک پھول کیکر کے پیڑ پر کھلا ہو۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ دو دن سے سُورج نہیں نکلا تھا۔ اور کبھی ایک آدھ گھنٹہ کو تھم کر بارش پھر ہونے لگتی تھی۔ اس وقت بھی بارش ہو رہی تھی اور میں سردی اور پانی سے بچنے کیلئے "پلازا" میں آ بیٹھا تھا خیال تھا ایک کپ کوفی اور سگریٹ پی کر چلا جاؤں گا لیکن موسم کے نشیلے پن نے ذرا لطف لینے پر اُبھار دیا تھا اور میں صوفے میں تقریباً دھنسا شیشے سے باہر برستے پانی کو دیکھ رہا تھا۔

سڑک ویران اور اُداس سی تھی۔ اور درختوں اور جھاڑیوں پر مینہ برس رہا تھا، سڑک پر سے باغ میں داخل ہونے کے لئے لوگوں نے جھاڑی کاٹ کر جو ایک غیر قانونی راستہ بنا لیا تھا، اس پر ایک آدمی تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ نزدیک والے سینما کی گھنٹی بجی اور میں سمجھ گیا کہ ساڑھے تین بجے ہیں، ہال میں ٹنگے گلدان میں سے مدھم مدھم آواز میں مکیش گا رہا تھا ؎

نظر میں پیار، زباں چپ، جھکی جھکی پلکیں
عجب ادا سے کوئی آج پہلی بار ملا ہے

ایک خوب صورت سی لڑکی تارے ٹنگے اس گلدان کو شو ... حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھے نوجوان نے اسے شاید یہ بتایا کہ وہ لاؤڈ سپیکر ہے۔ لڑکی مُسکرا دی۔ میں لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اُوپر بالکونی میں مجھے سرکھ کی شبیہ کا دھوکا ہوا۔ اس سے ملاقات ہوئے ایک طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ اُڑتی اُڑتی خبر سُنی تھی کہ سرکھ کو بارڈر پر پولیس کے مقابلے میں گولی لگی۔ مجھے یہ سنکر حیرت تو نہیں، افسوس ہوا تھا۔ وہ لاکھ بُرا سہی۔ سمگلر، بدمعاش چھُری باز۔ سب کچھ تھا جیل بھی کاٹ آیا تھا، پھر بھی وہ میرا بچپن ساتھی تھا۔ ہم گاؤں کے سکول میں کئی سال اکٹھے پڑھے تھے۔ وہ دسویں جماعت میں

join eBooks Telegram
ہی سکول سے نکال دیا گیا تھا۔ اور میں نے بہر حال کر ایم اے بھی کر لیا تھا اور اب ایک کالج میں پڑھا رہا تھا۔
سرنگھ کو اچانک وہاں دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ وہ زندہ تھا۔ یہی کافی تھا۔

ادھر جنگلے کے ساتھ کھڑا وہ ایسا لگتا تھا، جیسے ننھے پودے کے ساتھ کھجور اُگ آئی ہو۔ وہ شاید کسی سے باتیں کر رہا تھا، اس کے انداز سے میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی عورت ہے۔ سرنگھ کے ساتھ ایسے تو بہ شکن موسم میں کسی عورت کا نہ ہونا تو حیران کن ہو سکتا تھا، ہونا نہیں۔ میں تو یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ہمراہ کس قسم کی عورت ہو سکتی ہے، اسے خاص قسم کی عورتیں پسند تھیں۔ وہ جن کے چہرے پر حرام لکھا ہو۔ بالوں کی چوٹیاں بنی ہوں، گالوں پر ڈھیر سارا پوڈر وغیرہ تھپا ہو۔ ہونٹوں پر موٹا تھدا سُرخ پلستر ہو، آنکھوں میں کاجل انڈیلا گیا ہو، لباس ایسا کہ جسم باہر نظر آئے۔ منہ میں بڑی بڑی، دگلوریاں ہاتھ میں سگریٹ بھی ہو سکتا ہے، تتنے میں بھی ہو سکتی ہے اور اس کے ہر انداز سے عریانی نمایاں ہو۔ وہ بڑے ٹھاٹھ سے کہا کرتا تھا۔ مجھے تو یہ شارعِ عام ہے ؛ قسم کی عورتیں اچھی لگتی ہیں، جو ایک گالی کا جواب دو سے دیں جو بیچ سڑک کھڑی ہو کر میرے ساتھ بے باکی سے قہقہہ لگا ئیں ؛ وہ ایسی ایسی عورتیں ڈھونڈ کر لاتا۔ کچھ عرصہ ساتھ رکھتا، پھر چلتی کرتا۔ اپنے تمام دوستوں سے ملاتا اور جب چھوڑتا تو نہایت بے باکی سے کہتا۔

یارو میری طرف سے کھُلی چھٹی ہے۔"

مجھے سرنگھ کی یہ باتیں پسند نہیں تھیں اور وہ جانتا بھی تھا۔ لیکن کئی معاملات میں اسے خود پر قابو نہیں تھا۔ اور میں اس کی اس کمزوری سے بھی اسی طرح واقف تھا جس طرح اپنی عادت سے۔

اس سمے سرنگھ نے سر پر قراقلی ٹوپی ترچھی کر کے پہنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ملٹری افسروں والا کالا رول تھا۔ تن میں کھڑ کھڑ کرتی لٹھے کی شلوار، پیروں میں تلے دار جوتی، جو وہ پاکستان سے خاص طور پر منگوایا کرتا تھا۔ سرج کا نیا نیلا کوٹ، گلے میں چیکوسلواکیہ کا چھپا ہوا خوبصورت مفلر، جو وہاں عورتیں بطور سکارف کے استعمال کرتی ہیں۔ اور سب پر چھایا ہوا چھ فٹ کا قد۔ چوڑا سینا مضبوط بھاری ہاتھ جنہیں چھو کر اس کے جسم کی گرمی اور سختی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور میں تو یہ بھی جانتا تھا کہ ڈب میں کمانی دار کٹ کٹ کر کے کھلنے والا تیز چاقو بھی ہو گا۔ چاقو رکھنے کی عادت اسے سکول کے دنوں سے ہے۔ اس نے کلاس میں ماسٹر کا چانٹا کھا کر پل بھر کو ڈب پر ہاتھ رکھا تھا، میری رُوح فنا ہو گئی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ ماسٹر کو گھورتا ہوا بستہ اٹھا کر کلاس سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد نہ ماسٹر پڑھا سکا، نہ ہم توجہ سے پڑھ سکے۔ اسی شام نہر کی پٹڑی پر کہتے ہیں سرنگھ نے ماسٹر کو گریبان سے پکڑ لیا اور کمانی دار چاقو کھول کر ماسٹر کو ایک دو مرتبہ چھبویا۔ یہ واقعہ اس نے خود ہی مجھے سُنایا تھا اور اس سمے کی ماسٹر کی حالت بیان

join eBooks Telegram

کر کے خوب ہنسا تھا پھر اسے سکول سے نکال دیا گیا اور پھر وہ چند روز بعد وہ گاؤں ہی سے چلا گیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ میری ہمیشہ مدد کیا کرتا تھا۔ میں دُبلا پتلا، ڈرپوک اور کمزور تھا۔ کچھ لڑکے مجھے تنگ کرتے اور وہ ایک آدھ کے جڑ دیتا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ کلکتے میں اپنے ماموں کے پاس ہے۔ اور ٹیکسی چلانے لگا ہے، ایک چینی لڑکی کے چکر میں کیش کٹوا دیئے اور کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہا پھر اُسے اس کی چپٹی ناک اور چوڑے چہرے سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اُسے ایک شکایت اور بھی تھی کہ چاول کھانے والی لڑکیاں بہت زرخیز ہوتی ہیں۔ کلکتے اور ٹیکسی سے اُکتا کر وہ پنجاب لوٹ آیا اور چپکے سے سمگلر ہو گیا۔

ایک لڑکی کی شبیہہ جنگلے کے پیچھے اُبھری۔ میں نے غور سے دیکھا۔ گورا چٹا رنگ، گول چہرہ، جس سے معصومیت اور گھریلو پن ٹپکتا تھا، آنکھیں جھکی جھکی سی، نہایت سادہ، سفید ساری، جس کا آنچل سر پہ پیشانی تک آیا ہوا تھا، جیسے وہ مندر سے پوجا کر کے لوٹ رہی ہو۔ بدن ایسا جیسے ساون کی گھٹا ہو جو پہاڑ کی اونچی نیچی ڈھلوانوں پر جھک رہی ہے۔ لیکن مجموعی تاثر آرتی کے سمے مندر کی فضا کا سا تھا۔

اسے دیکھ کر میرے احساس کو شدید جھٹکا لگا۔ جیسے تیز رفتار گاڑی اچانک پٹڑی سے اتر گئی ہو۔ وہ سرمکھ کی پہلی داشتاؤں سے بالکل مختلف تھی یہ لڑکی سرمکھ کے ہتھے کیسے چڑھ گئی وہ.........

اغوا کر کے لانے اور لڑکیاں خرید کر گھر میں ڈالنے کے حق میں کبھی نہیں تھا۔ عورت کو اس کی مرضی سے لاتا اور اپنی مرضی سے چھوڑ دیتا۔ شادی اس نے نہ کرائی تھی، نہ کبھی کرانے کا ارادہ تھا۔ وہ اس رشتے کو سرے سے ہی فضول سمجھتا تھا۔ جب شادی کا ذکر ہوتا تو وہ چٹکی بجا کر سگریٹ جھاڑتا اور مسکرا کر کہتا۔

عورت کی ذات بڑی کتی ہوتی ہے، اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ پکڑی، چار دن عیش کی اور چلتی کی۔ بیوی بنا لو تو بور کرنے لگتی ہے، زکام کی طرح کسی کام کا نہیں چھوڑتی مجھے تو ایسی عورت پسند ہے جو داشتہ بن سکتی ہو، کھل کھیل سکے، تجربہ کار ہو، جو اس لوہے کی طرح گرم ہو جس پر پانی کی بوند پڑتے ہی چھن، سے بھاپ بن جاتی ہے، ایسی نہیں جس پہ ٹھنڈے گلاس کی طرح باہر کی ہوا پانی بننے لگتی ہے۔ میں اس سے کبھی متفق نہیں ہو سکا تھا۔ وہ زندگی کو راکٹ کی سی تیزی سے گزارنے کا عادی تھا۔ ہنگاموں کا شوقین اور مار دھاڑ میں یقین رکھنے والا۔ وہ مجھے بھمبو کاٹ، کہہ کر میرا مذاق اڑایا کرتا تھا، لیکن پھر بھی مجھ سے ملتا تھا۔ مجھے ہر بات آ کر سناتا تھا۔ میں اکثر چڑ کر اس سے کہتا۔

• دیکھ، سرمکھ! مجھے تیری کسی بات سے اتفاق نہیں، تیرا حشر بُرا ہو گا۔

وہ ہنس کر جواب دیتا۔

• میری جان جو مجھ سے متفق ہو جاتے ہیں، وہ میرے دوست نہیں رہ سکتے۔ میں انہیں،

join eBooks Telegram

کرتا رپرشاد مجھ کر کسی گرہستی کو دے آتا ہوں۔ باقی رہی حشر والی بات، تو پیارے، جس طرح چپ چاپ گاؤں سے نکلا تھا، زندگی سے بھی نکل جاؤں گا۔"

میں ایسے موقعوں پر اُسے دیکھتا رہ جاتا۔ میں صدق دل سے چاہتا تھا کہ وہ اس راستے سے پلٹ آئے اور نیک زندگی گزارے۔ جب کبھی میں اپنے خلوص سے مجبور ہو کر اُسے نصیحت کر بیٹھتا تو وہ چڑ کر کہتا۔

"اے میرے چچا، مجھے نصیحت کرنے والوں سے سخت نفرت ہے۔ میں جھٹکا کر دیا کرتا ہوں، پر تو اپنا لنگوٹیا ہے۔"

اور وہ اٹھ کر چلا جاتا۔

سیڑھیاں اُترتے جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو مسکراتا ہوا میری طرف آ گیا۔ اور بولا۔

"ابے او ماسٹر! کیا حال ہے تیرا، بھابی کیسی ہے اور بھتیجو۔ اب تو بولتا ہو گا۔" ایک دم پلٹ کر اس نے ساوتری کی طرف دیکھا، جو ذرا فاصلے پر سمٹی سمٹائی، سر جھکائے کھڑی تھی۔

"آ جا، اپنا یار خاص ہے۔"

وہ ایک ایک قدم رکھتی، نظریں فرش پر جمائے، قریب آ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جا، بھئی شرماتی کیوں ہے۔" سر مکھُ نے اس سے کہا۔

وہ سمٹ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں حیران سا کبھی سر مکھُ کی طرف دیکھتا اور کبھی ساوتری کی طرف۔ میرا ذہن اسے سر مکھُ کے ساتھ قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔ لیکن سر مکھُ جیسے میری اس کیفیت سے قطعی ناواقف تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں اس کی تعریفیں کئے جا رہا تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ اپنی جس داشتہ سے مجھے ملاتا، اس کی تعریفیں کچھ اس طرح اور ایسے الفاظ میں کرتا کہ مجھے شرم آنے لگتی۔ اور وہ چھوٹو قسم کی وقتی محبوبہ اس طرح مسکرائے جاتی جیسے بہت خوش ہو۔ لیکن سامنے بیٹھی ساوتری کو دیکھ دیکھ کر میں ڈر رہا تھا کہ کہیں سر مکھُ اپنے مخصوص انداز میں اس کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر نہ کرنے لگے۔ نہ جانے میں کیوں یہ چاہنے لگا تھا کہ وہ اس لڑکی کی موجودگی میں ایسی کوئی بات نہ کرے۔ اسے ہر بات نہایت تفصیل سے سنانے کی عادت تھی۔ وہ ان تمام بے ہودہ اور نازیبا حرکتوں اور باتوں کا ذکر مزے لے کر کیا کرتا، جو وہ عورت اس سے تنہائی میں کیا کرتی تھی۔ اس روز جانے کیا ہوا کہ اس نے ساوتری کے بارے میں کوئی ایسی گھٹیا بات نہیں کی۔ بڑی سنبھل سنبھل گفتگو کرتا رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنی

طبیعت پر جبر کئے ہے اور اسے ایسا کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ تعارف کرانے لگا۔

"یہ میرا لنگوٹیا ساتھی ہے۔ نام اس کا شیام سندر ہے۔ نہ تو یہ شیام (مہاراج کرشن) ہے اور نہ سندر (خوبصورت)۔ بڑا شریف اور ڈرپوک، برخوردار خاوند ہے، اس لئے مجھے اس سے نفرت ہے۔ نہایت پر خلوص اور سچا دوست ہے، اس لئے کمبخت سے محبت بھی کرنا پڑتی ہے۔ اور یہ ساوتری ہے۔ باقی تو خود سمجھ لے۔"

لڑکی کا نام سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بالکل اسم با مسمّیٰ شخصیت تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ سر مکھ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہا۔ ستی ساوتری۔ وہ عورت جو اپنے ستی بل سے یم راج (ملک الموت) سے اپنے خاوند ستیہ وان کی زندگی واپس لے آئی تھی۔ سر مکھ میرے اس تصور، اس جذبے کی ہنسی تو نہیں اڑا رہا جو مشرقی عورت کے بارے میں میرے دل و دماغ میں جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ میں نے تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ اطمینان سے بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

اس سے پیشتر میں اس کے ساتھ جن عورتوں کو ملا تھا، وہ شراب پیتی تھیں، جوا کھیلتی تھیں، سگریٹ پھونکتی تھیں، انہیں دیکھ کر ایسے گھنے اور خطرناک جنگلوں کا خیال آتا تھا، جن میں جا کر کوئی زندہ نہیں لوٹتا۔ کشوری تو اپنے خاوند کو قتل کر کے آئی تھی۔ ایسی بھرپور عورت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دیکھ کر پسینہ چھوٹتا تھا۔ میری بیوی کو پہلا بچہ ہونے والا تھا اور وہ رسم کے مطابق جاپے کے لئے مائکے گئی ہوئی تھی۔ ایک شام سر مکھ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ رات کو بارش ہونے لگی تو اس نے مجھے وہیں روک لیا۔ وہ اور کشوری شراب پینے بیٹھ گئے، میں قصہ پورن بھگت، جو ایک طاق میں پڑا تھا۔ اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب سو گیا۔ آدھی رات کو مجھے اپنے ساتھ کسی اور کا احساس ہوا۔ گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو واقعی کوئی تھا۔ میں کود کر دور جا کھڑا ہوا اور بتی روشن کر دی۔ کشوری بالکل ننگی بستر پر پڑی مسکرا رہی تھی، باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا اور مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سر مکھ نشے میں دھت کمرے میں آیا اور جھٹکے سے کشوری کو بستر سے کھینچ کر بولا۔

"حرامزادی، یہ تو بھنا ہوا گوشت بھی نہیں کھاتا، تجھے کو کیا ہاتھ لگائے گا۔"

اور اس نے کھڑے کھڑے کشوری کو گھر سے نکال دیا۔

"کیا سوچ رہا ہے، بات کر کوئی۔" سر مکھ نے میری کمر میں ٹھوکا دیا۔ اور سامنے بیٹھی ساوتری سے

بولا "یہ مجھ سے زیادہ شرمائل ہے۔" اور ہنسنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ گھبراہٹ میں بولا۔

"بارش ہی بند نہیں ہوتی، دیر سے آیا بیٹھا ہوں۔"

"اسے ہر وقت اپنی بیوی سے ڈر لگتا رہتا ہے، جیسے وہ تھانیدار ہے۔ جتنی دیر یہ گھر سے باہر رہتا ہے اسے یہی غلط فہمی رہتی ہے کہ اس کی بیوی شدت سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ کبھی تو ذہن سے یہ بوجھ اتار کر نکلا کر گھر سے۔" آخری جملہ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"آپ سمجھتے ہیں گھر والی اپنے پتی کا انتظار نہیں کرتی، آپ کو کیا معلوم عورت کے دل کا۔"

میں ساوتری کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیران سا سرکھ کی طرف دیکھنے لگا۔ آج تک کسی عورت کے منہ سے میں نے اس کے لئے "آپ" نہیں سنا تھا "تم" اور "تُو" سے بات ہوتی۔

"یہ یہاں بیٹھا عیش کر رہا ہے اور اس کی بیوی ۔۔۔"

ساوتری نے سرکھ کو ٹوک کر کہا۔

"عورت کا دھیان اپنے پتی میں ہی رہتا ہے، مرد عورت کے دل کو نہیں سمجھ سکتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ باتیں سرکھ کو ٹھنڈک دے رہی تھیں۔ لیکن میں اس کے مادۂ برداشت پر حیران ہو رہا تھا۔ آپ۔ گھر۔ پتی۔ یہ لفظ سرکھ کے ماحول اور زندگی کے نہیں تھے۔

"آپ تو آدھی آدھی رات کو گھر آتے ہیں، میرا دل جانتا ہے۔"

ساوتری بالکل کسی نظر انداز کی ہوئی بیوی کی طرح شکایت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ان کی تو عادت ہے جسے دیکھتے ہیں، پکڑ کر بٹھا لیتے ہیں۔" بات کرتے کرتے اس کے سر سے آنچل ڈھلک گیا، جو اس نے خود درست کر لیا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"بہن جی پریشان ہو رہی ہوں گی، آپ جائیے گھر، یہ تو سارا دن بٹھا چھوڑیں گے۔"

ساوتری کی باتوں اور اندازِ گفتگو سے میں یہی اندازہ لگا سکا کہ وہ کافی عرصہ سے سرکھ کے ساتھ رہ رہی ہے۔

"اچھا بھئی، کبھی گھر آنا" سرکھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بہن جی کو بھی ساتھ لائیے گا" ساوتری نے بڑی معصومیت سے دعوت دی۔

سرکھ نے میری طرف دیکھا اور سر ہلانے لگا۔ میں اس کی نظروں کی زبان سمجھتا تھا۔ سرکھ کے ہاں کسی کے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی میرے گھر نہیں آتا تھا۔

join eBooks Telegram

ہمارے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اُسے اگر کبھی مجھ سے ملنا ہوتا تو نکڑ پر پان والے کے لڑکے کو بھیج دیتا۔ میں اسے وہیں جا ملتا۔ وہ کملا کا نام نہایت احترام سے لیتا تھا۔ راستے میں اگر وہ کہیں مل جاتا تو کترا کر نکل جاتا۔ کملا کو تو اس کی صورت سے ہی بیر تھا۔ وہ تو مجھے بھی اس سے ملنے سے منع کرتی رہتی تھی۔ جس روز اسے شک بھی ہو جاتا کہ میں سرکھُو سے ملنے گیا تھا، وہ روٹھ جاتی، کھانا پینا ترک کر دیتی، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ سرکھُو کے گھر لے جاتا کہ وہ اس کی داشتہ سے ملے۔ وہ شاید خودکشی کو اس پر ترجیح دیتی۔

ٹالنے کی غرض سے میں نے ساوتری سے جھوٹا وعدہ کر لیا۔ گو مجھے ڈر بھی تھا کہ کہیں سرکھُو بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ یہ بات کہ کملا ساوتری سے نہیں مل سکتی، اس بے چاری کے دل پر پتھر بن کر گرتی۔ اس سے جھوٹا وعدہ کر کے میری آتما کو کبھی شانتی نہیں ملی۔ ہمیشہ دکھ ہوتا رہا۔

ایک شام سرکھُو مجھے بازار میں مل گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساوتری میرے وعدہ کر کے نہ آنے پر سخت ناراض ہے اور شکایت کر چکی ہے۔۔ کہ وہ میری بیوی سے ملنے کی خواہش مند ہے۔

"تم تو جانتے ہی ہو" میں نے سر جھکا کر شرم سے ڈوبی آواز میں کہا۔

"ہاں، لیکن ساوتری کو کون سمجھا سکتا ہے، وہ عجیب عورت ہے، جانتی ہے کہ میرا دھندا کیا ہے، میں کس قسم کا آدمی ہوں، میرے گھر کیسے کیسے لوگ آتے ہیں، پھر بھی ضد کئے جاتی ہے۔ بیس بائیس سال کی ہے، لیکن باتیں بچوں جیسی کرتی ہے۔ کچھ کہتا ہوں تو رونے لگ جاتی ہے۔ تمہارے سوا میرے کسی دوست سے ملنا پسند نہیں کرتی ہے۔۔۔۔ مدی اور اجاگر سے تو اسے نفرت ہے۔ عجیب مصیبت ہے سالی"

میں سرکھُو کے ساتھ چلتا جا رہا تھا اور ساوتری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک میں نے اُس سے ایک سوال پوچھ لیا۔

"ساوتری سے شادی کی ہے؟"

سرکھُو نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اس زور کا قہقہہ لگایا کہ راہ چلتے لوگ رُک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ پھر مجھے بازوؤں سے پکڑ کر بولا۔

"یار، تو سرکھُو کو چغد سمجھتا ہے، مجھے بیوی اور ملائی کی برف ذرا پسند نہیں، دونوں ذرا چھونے سے پگھلنے لگتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے بس" پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا "لیکن کشوری، چمپا اور خورشید سے مختلف ہے۔۔۔۔ خیر تو چل کر اسے سمجھا دے کہ بھابی اس سے نہیں مل سکتی"

"میں! ۔ میں کیا کہوں گا بھلا، نہیں۔ میں" میں اس خیال سے ہی گھبرانے لگا۔ میں اس معصوم اور سادہ سی لڑکی کو کیا کہہ کر سمجھاتا بھلا۔

join eBooks Telegram

"تو پھر میں کیا کروں مجھے غصہ آگیا تو ـــ" وہ بھڑک اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اُداس سا ہوگیا اور سامنے دیوار پر چپاں پوسٹر پر نظریں مرکوز کر دیں۔

مجھے اس پل اُس پر بہت ترس آیا اور سوچا کہ کچھ بھی ہو ایک مرتبہ کملا کو اُس کے گھر لے جاؤں، لیکن یہ خیال ایک لمحہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکا، جذبات کی شدت کم ہوئی، تو یہ خیال اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

"کیا سوچنے لگا ـــ؟" سرکھ نے پوچھا۔

"مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

"تو چل کوئی بہانہ کر دیجیو ـــ وہ ڈھونڈتی ہوئی خود تیرے گھر پہنچ جائے گی۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ سرکھ کی عجیب عادت تھی۔ اس کے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا اور وہ اپنے یار دوستوں کے ساتھ دندناتا اندر چلا جاتا۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے، اپنی دُھن میں سیدھا اندر کھینچے لے گیا۔

آنگن میں ساوتری چار پائی پر بیٹھی ترکاری چھیل رہی تھی۔ میرے لئے یہ منظر بالکل عجیب تھا۔ اس وقت وہ شلوار قمیض پہنے بیٹھی تھی اور عام گھریلو عورتوں کی طرح دوپٹہ جلدی میں اندر باہر کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ ہمیں اس طرح اچانک سر پر دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور ہماری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی۔

"ہائے رام، آواز تو دے لیا کرو، گھر میں کوئی کس طرح بیٹھا ہوتا ہے۔ اچھا اب میرا دوپٹہ تو لا دو اندر سے، پلنگ پر پڑا ہوگا۔"

سرکھ نے کھلنڈرا سا قہقہہ فضا میں اُچھالا اور بولا۔ "اسے انہیں باتوں کا فکر رہتا ہے۔"

دونوں بازو کہنیوں سے کلائیوں تک جوڑ کر سینے پر رکھے لپک کر اندر چلی گئی۔ جب آئی تو دوپٹہ سینے پر پھیل کر سر کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ وہ دو کرسیاں بھی لیتی آئی۔ جب ہم براجمان ہو گئے تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"چائے بناؤں؟"

"میں تو اس وقت آگ پیتا ہوں۔" سرکھ نے ہنس کر کہا۔ "اس کے لئے بنا دے۔"

وہ ترکاری کا تھال لے کر رسوئی میں چلی گئی۔

میں یونہی آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ سب کچھ جیسے تبدیل ہو گیا تھا۔ فرش دُھلا ہوا تھا، کونے کھدرے تک صاف تھے پہلے جہاں شیشے کے گلاس اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں، انڈوں کے چھلکے اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہوتی تھیں، اب وہ جگہ کسی مندر کی طرح صاف اور پوتر نظر آ رہی تھی۔ دیواروں پر پتائی نے پیکوں کے نشان

join eBooks Telegram

مٹا دیئے تھے، درمیان میں تلسی کے پودے کا گملا رکھا تھا۔ ایک طرف دیوار پر چڑیوں وغیرہ کے لئے مٹی کے پیالے میں پانی بھر کر رکھا تھا۔

سرنکھ میری کیفیت بھانپ گیا اور ہنس کے بولا۔

"جب سے یہ آئی ہے گھر کا نقشہ بدل گیا ہے، آ ذرا اندر کمرہ دیکھ۔"

وہ مجھے اندر لے گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں سورگ کے کسی حصے میں آ گیا ہوں، دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں، ایک الماری میں چھوٹا سا مندر بنا یا گیا تھا، لکشمی نارائن کی تصویر کے سامنے اگربتی جل رہی تھی، پھول پڑے تھے اور ایک آرتی کی گھنٹی رکھی تھی۔ کانس پر ٹائم پیس رکھا تھا اور اس کے اوپر دیوار پر، جہاں پہلے ایک نہا کر نکلنے والی ننگی عورت کی تصویر تھی، اب سرنکھ کی تصویر تھی، جس پر سہرا لٹک رہا تھا میں نے غور سے اس تصویر کی طرف دیکھا۔

سرنکھ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور ہنسا، پھر بولا۔

"سات آٹھ مہینوں میں ہی ساوتری نے اپنا سکہ جما لیا ہے۔ یار یہ عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہیں، اس طرح ہولے ہولے چھائی چلی جاتی ہیں، حکومت کرنے لگتی ہیں کہ آدمی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کسی اور کی مرضی سے چل رہا ہے۔ عورت جانتی ہے، سمجھتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس کے ہاں یہ عمل شعوری ہوتا ہے، لیکن یہ سب کچھ اس طرح خاموشی سے ہوتا ہے کہ آدمی جب تک سنبھلے پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے، کیا خیال ہے تمہارا۔۔۔؟"

بھگوان جانے وہ اس سمے سنجیدہ تھا کہ مذاق کر رہا تھا، چہرے سے تو سنجیدہ ہی نظر آتا تھا۔ وہ جس بات کو عورت کی چالاکی کہہ رہا تھا، میں اسے اس کا ایثار، خلوص، محبت اور بے لوث خدمت کا جذبہ سمجھتا ہوں۔ وہ دھرتی کی طرح تھوڑے ملنے کر بہت دیتی ہے۔

ساوتری چائے لے آئی۔ سرنکھ نے کوٹ کی جیب سے ادھا نکالا اور گھٹنے پر ٹکا کر، ٹھوڑی کا رک پر رکھ دی اور ساوتری کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے پیالی میں چائے انڈیل رہی تھی۔ میرے لیے چائے بنا کر اس نے سرنکھ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"اس کمرے میں نہیں۔"

سرنکھ کا ردِعمل دیکھنے کے لئے، میں نے اس کی طرف دیکھا، میرا خیال تھا وہ ساوتری کو ڈانٹ دے گا، کیونکہ وہ اپنی عادت پر کسی کی حکومت یا دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا تھا، لیکن وہ مسکرا دیا اور مجھ سے بولا۔

join eBooks Telegram

"آ، یار برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔"

ہم برآمدے میں آگئے۔ ساوتری سرنکھ کے لئے گلاس اور پانی دے گئی اور خود رسوئی میں جا بیٹھی۔ میں چلئے پیتا رہا اور ساوتری کے بارے میں سوچتا رہا۔ رسوئی میں سے سٹوو کی آواز آ رہی تھی اور اس شوں شوں کے ساتھ کبھی چوڑیوں کی جھنکار بھی سنائی دے جاتی۔ اچانک سرنکھ نے ایک عجیب سا سوال کر دیا۔

"ساوتری کیسی لڑکی ہے ۔۔۔؟"

میں نے دراصل اس بات پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب بھی اسے دیکھتا یہی سوچتا کہ میری نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا کہ وہ دونوں کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ میں نے سرنکھ کی طرف دیکھا۔

وہ بوتل میز پر رکھ کر بولا۔

"میں بتاتا ہوں ابھی۔ یہ یار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ آج تک میں صرف عورت کے جسم سے ملتا رہا ہوں، لیکن ساوتری میں کچھ اور بھی ہے ۔۔۔ میرا مطلب ہے جسمانی لحاظ سے وہ کسی سے کم نہیں، لیکن اس کے ساتھ رہ کر مجھے کچھ عجیب سا لگنے لگا ہے، جیسے ہسپتال میں میرا علاج ہو رہا ہو ۔۔۔ یعنی، میرا مطلب ہے کہ ۔۔۔ بس یہی نہیں سمجھ آتا کہ یہ کیا ہے ۔۔۔ اور کبھی کبھی تو اس بات پر مجھے غصہ آنے لگتا ہے ۔۔۔ میرا خیال ہے ساوتری ابھی بچی ہے، ناپختہ اور ناتجربہ کار دھیرے دھیرے ۔۔۔" وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا ۔۔۔ "تجھے بھابی سے ڈر لگتا ہے نا ۔۔۔ میرا خیال ہے یہ ڈر نہیں ہوتا۔ ڈر سے ملتی جلتی کوئی اور چیز ہے ۔۔۔ مجھے جب رات کو دیر ہو جائے تو ساوتری کا خیال آنے لگتا ہے، اور میں کہتا ہوں ۔۔۔ سرنکھ سنگھ، تجھے ہو کیا رہا ہے، اس طرح تو بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری ناک میں نکیل ڈال دی گئی ہو ۔۔۔" وہ پھر خاموش ہو گیا اور رسوئی کے پردے کو دیکھنے لگا۔ پھر کہنے لگا ۔۔۔ "سمجھ میں نہیں آتا، اس کا انجام کیا ہوگا، کبھی کبھی تو مجھے ڈر آنے لگتا ہے۔"

"ڈر! کس سے، کل کا ۔۔۔؟" میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"یہی تو مجھے بھی سمجھ نہیں آتا۔ ورنہ جھگڑا کیا تھا، ایک منٹ میں فیصلہ کر دیتا۔ ادھر یا اُدھر۔"

ساوتری رسوئی سے نکلی۔ اسے دیکھ کر سرنکھ خاموش ہو گیا۔ ساوتری کے بائیں رخسار پر سٹوو کی سیاہی لگ رہی تھی، بالوں کی ایک لٹ پن سے آزاد ہو کر گال کو چھونے لگی تھی، آگ کے نزدیک بیٹھے رہنے سے چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ اور بھی زیادہ حسین و جمیل لگنے لگی تھی۔ نزدیک آ کر بولی۔

"اس وقت گو بھی آلو بنانے لگی ہوں، آپ کے لئے انڈوں کی بھُرجی بنا لوں گی ساتھ۔"

join eBooks Telegram

"جو جی میں آئے بنالو، میرا کیا پتہ کہاں بیٹھ جا کر کھالوں۔" سرنکھ کے لہجے میں ہلکی ہلکی بے زاری کی آمیزش تھی۔

"تو میں اتنا کھکھیڑ کیا اپنے لئے کروں گی" وہ جیسے ناراض بیٹھی ہی تو جاکر انڈے لائی تھی کہ" ایکدم اس کا چہرہ اتر گیا، آواز بھیگنے لگی۔

"کیا ضروری ہے کہ میں روز کھانا گھر ہی میں کھاؤں" سرنکھ نے بے دلی سے کہا۔

"اور گھر ہوتا کس لئے ہے، میری کیا ضرورت ہے!"

"میں تمہیں روٹیاں بنانے کے لئے تو نہیں لایا"

"پر عورت کو تو یہی کام اچھے لگتے ہیں"

"اوف ـــ تم بھاشن نہ دیا کرو"

"تو تم میرا گلا گھونٹ دو ـــ" ساوتری کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ چپ چاپ اندر جاکر بستر پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔

سرنکھ نے دو چار مرتبہ کرسی میں پہلو بدلا، جیسے اُسے کچھ چبھ رہا ہو، اِدھر اُدھر دیکھا پھر اندر بستر پر پڑی ساوتری کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے اندر اٹھنے والے کسی طوفان کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر ایک دم اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میں تنگ آگیا ہوں ـــ"

میں ایک انجانے خوف سے لرز گیا۔ مجھے ساوتری کا مستقبل ایک دم تاریک نظر آنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں سرنکھ کو سمجھانے کی کوشش کرنا، اسے ضدی بناتا ہے، میں خاموش بیٹھا پیالی میں پھڑپھڑاتی مکھی کو دیکھنے لگا

سرنکھ پھر کہنے لگا۔

"اب یہ بھوک ہڑتال کرے گی، میں گھر پہ کھانا نہ کھاؤں تو یہ بھی نہیں کھائے گی، یہ بھی کوئی ضد ہے بھلا۔ میں نوکر تو نہیں ہوں کسی کا، بِک تو نہیں گیا، رات کو دیر سے نہ آیا کروں، فلاں سے نہ ملا کروں، فلاں کو گھر نہ لایا کروں، فلاں کام نہ کروں، رات کو دروازہ بند رہے گا ـــ یہ کیا مصیبت ہے۔ یہ عورت کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ میں نے بیسیوں عورتیں دیکھی ہیں، وہ مالیر کوٹلہ والی خورشید تھی، وہ کشوری تھی، لیکن یہ تو سب سے الگ ہے، نہ جانے کیا سمجھتی ہے خود کو ـــ میں طرح دے جاتا ہوں، ترس آنے لگتا ہے نہیں تو ـــ" اس نے پھر ساوتری کی طرف دیکھا، جس کا جسم سہمے ہوئے ہل رہا تھا، جیسے وہ ہچکیاں لے رہی ہو ـــ وہ پھر کہنے لگا: "اسے

join eBooks Telegram

جھنگے چولہے سے ہی فرصت نہیں، میں نے کب اس سے رکھا پکانے کو کہا۔ جو میرے جی میں آئے گا کروں گا، جو اس کے جی میں آئے کرے ۔۔۔ میں روکتا ہوں کیا؟" آخری جملے اُس نے بلند آواز میں، ساوتری کو سنا کر کہے تھے۔

سرمکھ کے اس اُبال نے سرمکھ سے زیادہ مجھے ساوتری کو سمجھنے کا موقعہ دیا۔ میں اتنا تو ایک دم سمجھ گیا کہ وہ خود کو سرمکھ کی داشتہ نہیں بلکہ بیوی سمجھتی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ کوّا یہ نہیں سوچتا کہ کوئل کے انڈوں میں بچے ہوتے ہیں، اُسے ان کے لذیذ ذائقے کا خیال ہوتا ہے۔

ساوتری اندر سے آنسو پونچھتی آئی۔ اس کی آنکھوں کا کاجل بہہ کر گالوں پر آگیا تھا اور ہونٹوں تک آنسوؤں کی لکیریں سی کھنچ گئی تھیں، چائے کی خالی پیالی اٹھا کر بولی۔

"بھائی صاحب، یہ روز ہی بازار سے کھا آتے ہیں، بازار کی چیزیں کیا اچھی ہوتی ہیں، انہیں تو اپنے پیسوں سے مطلب ہوتا ہے، کھانا پیار سے کھایا کھلایا جائے تب ہی لگتا ہے جسم کو۔ ابھی پرسوں ساری رات پیٹ کے درد سے تڑپتے رہے ہیں، آدھی رات کو ڈاکٹر آیا ۔۔۔ بازار کے مرچ مسالے کھا کر پیٹ تو خراب ہوگا ہی۔ آپ انہیں سمجھائیں ذرا، میری تو ایک نہیں سنتے۔"

میں ڈر رہا تھا سرمکھ غصے میں کوئی نازیبا لفظ نہ کہہ دے، کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ لیکن وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے ساوتری کی طرف دیکھا۔ اسے کیسے سمجھاتا کہ سرمکھ ان مردوں میں سے نہیں ہے جو گھر بسا کر رہتے ہیں، وہ اسے اپنا گھر بنانے سنوارنے کے لئے نہیں لایا۔ اسے صرف عورت چاہئے ہے۔ عورت کا جسم، اس کی روح سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ باتیں ساوتری کو نہیں سمجھائی جا سکتی تھیں۔

سرمکھ نے گھور کر ساوتری کی طرف دیکھا اور سختی سے بولا۔

"تم اپنے کام سے مطلب نہیں رکھ سکتیں؟"

"آپ عورت ہوتے تو جانتے۔" ساوتری منہ پھیر کر رو دی۔ اور پیالی لئے دھیرے دھیرے رسوئی کی طرف چلی گئی۔

سرمکھ نے میری طرف دیکھا اور میز سے بوتل اٹھا کر اسے ہاتھوں میں الٹنے پلٹنے لگا۔ اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

اس میں سمجھنے سے زیادہ دونوں کی فطرت کو دخل تھا۔ میں نے دیوار پر پھیلی ہوئی گلو کی بیل کو دیکھا جس کے چوڑے چوڑے ہرے پتوں نے ساری دیوار کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔

"یہ چاہتی ہے میں گھر سے نکلوں بھی نہیں۔ اور اگر جاؤں تو جلدی لوٹ آیا کروں، اور میرا دھندا؟"

"بھائی صاحب اس میں کیا برائی ہے۔" ساوتری نے رسوئی میں سے جھانک کر کہا۔ "پہلے رات کو

join eBooks Telegram

میراجی ڈرتا ہے۔ یہ کہتے ہیں دیدا دہ کھلا رہنے دو، بھلا گھر گرہستی میں ایسا ہوتا ہے۔ مرد باہر ہو تو گھر والی کو نیند کیسے آسکتی ہے۔ کوئی ڈائن ہی سو سکتی ہے آرام سے، میرے تو کان دروازے پر لگے رہتے ہیں، منٹ منٹ بعد جا کر باہر جھانک آتی ہوں، آتے ہیں تو من کو شانتی ملتی ہے۔ آپ ہی بتائیے، بہن جی کیا آپ کا انتظار نہیں کرتیں — پھر جیسے اُسے کچھ یاد آگیا — بولی — "آپ بہن جی کو لائے نہیں — اس روز وعدہ کر گئے تھے، وہ نہ آنا چاہتی ہوں تو میں چلی چلتی ہوں —"

"وہ تم سے نہیں ملیں گی" سرمکھ نے ایک دم کہا۔

"کیوں —؟" ساوتری نے حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "مجھ میں کیا بُرائی ہے"، پھر جیسے اُسے کچھ سمجھ آگیا۔ اُس نے سر جھکا لیا — "ٹھیک ہے! میں ہوں ہی پاگل، بھائی ساب! میری بات کا بُرا نہیں مانیے گا، مجھے یاد نہیں رہتا، کب کسی سے کیا بات کرنی ہے —"!

اس نے سر اندر کر لیا۔ ایک پل کو چوڑیاں چھنکیں، پھر سٹوو کی آواز سب پر چھا گئی۔

سرمکھ نے خالی سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جھٹکے سے بوتل کی سیل توڑ کر کارک کھولا اور گلاس میں شراب انڈیل کر بولا —

"اب تم جاؤ —"

"مجھے اس کی بات بالکل بُری نہیں لگی۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ شرابی کے ساتھ بیٹھ کر چاۓ پینا ایسا ہی ہے جیسے کسی فاحشہ کو گھونگھٹ نکال کر چلنے کے لئے کہنا۔ وہ اس حالت میں نہایت مضحکہ خیز چیز لگتی ہے۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔

چند روز بعد، ایک صبح ساوتری مجھے اچانک ایک ڈاکٹر کے مطب میں مل گئی۔ بڑی پریشان اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ اپنی سُدھ بدھ بک نہیں تھی۔ بالوں میں ٹھیک سے کنگھی نہیں کی تھی، چہرہ اُترا اُترا سا تھا، آنکھیں تھکی تھکی سی جیسے کئی راتوں سے سوئی نہ ہو۔ لباس میلا اور شکن آلود، پیروں میں پرانے چپل۔ ہاتھ میں دوا کی خالی شیشی تھی۔ بنچ پر بیٹھی وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے سر پر آنچل درست کیا اور نمستے کہا۔ میرا خیال تھا وہ بیمار ہے اس لئے پوچھا۔ بھابی، کیا بات ہے یہاں بیٹھی ہو —"؟

"ان کی طبیعت تین چار روز سے خراب ہے ڈاکٹر گھر دیکھنے گیا تھا، کہتا تھا —" اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، جیسے کوئی اہم راز فاش کرنے جا رہی ہو — پھر سرگوشی کے سے انداز میں بولی — "کہتا تھا زیادہ شراب پینے کی وجہ سے جگر خراب ہو گیا ہے۔ میں منع کرتی ہوں تو لڑنے لگتے ہیں، کل کہتے لگے نکل جا میرے گھر سے،

join eBooks Telegram

ایسی حالت میں چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں ـــ" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"ٹھیک ہو جائیگا، ایسی گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں آ کر سمجھا دوں گا۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔ دراصل مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔

"آپ کیسے آئے یہاں؟" اس نے پوچھا۔

"بچے کو کھانسی آنے لگی ہے ـــ"

"کیسی، خشک کہ تر ـــ"

"خشک ہے ـــ"

"کتنا بڑا ہے؟"

"یہی کوئی سال ڈیڑھ سال کا ہوگا ـــ"

"تو آپ بہن جی سے کہئے گا کہ اُسے بادام روغن میں سوٹھوں کی چٹنی ملا کر چٹائیں، اور خود کھٹی یا تلی ہوئی چیز نہ کھائیں ـــ"

وہ اس طرح کہہ رہی تھی کہ جیسے چار پانچ بچوں کی ماں ہو۔ اندر سے آنے والے مریض نے نمبر گیارہ کو اندر جانے کے لئے کہا۔ وہ جلدی سے ساری درست کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ باہر آ کر اس نے دوائی اور نمستے کر کے چلی گئی۔

اسی روز شام کو میں سُرمکھ کی عیادت کو گیا۔ اس کی حالت زیادہ تشویشناک تو نہیں تھی، البتہ اس کا رنگ کچھ زرد پڑ گیا تھا۔ اُس سمے وہ بستر میں لیٹا جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ ساوتری پائنتی بیٹھی اس کے پیر دبا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھی، سر پر آنچل درست کیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"کیا ہوا بھئی ـــ؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"شراب اب مجھے پینے لگی ہے ـــ" اس نے مسکرا کر کہا اور دیوار پر آویزاں گورونانک کی تصویر دیکھنے لگا۔ پھر بولا "اچھا کیا تم آ گئے، میں ساوتری کے بارے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔ ذرا نزدیک آ جاؤ ـــ"

میں کرسی قریب لے گیا۔ اُس نے ناول تکیئے کے نیچے رکھ دی، دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا ـــ

"یہ تو تم نے بھی سوچا ہوگا کہ ساوتری جیسی نیک، شریف اور معصوم لڑکی میرے پاس کیسے پہنچ گئی۔ میرے دوسرے دوست بھی حیران ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں خود حیران ہوتا ہوں کہ اتنا عرصہ میں اس کے ساتھ کیسے رہ سکا ہوں ـــ" سرمکھ نے پھر دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "ساوتری بہت ہی سیدھی سادی ہے۔

join eBooks Telegram

کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ اسے کسی شریف آدمی کی بیوی ہونا چاہئے تھا۔ وہ بیوی بننے کے قابل ہے، داشتہ نہیں بن سکتی، یہ اس کے گھر کو سورگ بنا دیتی، وہ بگور وبہت کم ایسی لڑکیاں پیدا کرتا ہے ۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم جانتے ہو کہ میں عورت رکھتا ہوں گھر میں بیوی نہیں، ساوتری سے بھی میری شادی نہیں ہوئی، لیکن وہ مجھے اپنا خاوند سمجھتی ہے، مجھے اس بات سے چڑ ہے۔ وہ میری اس قدر سیوا کرتی ہے کہ مجھے کوفت ہونے لگتی ہے۔ حیران مت ہو، میں اس میں داشتہ ڈھونڈتا ہوں، وہ تلخی، وہ کاٹ جو روڈگی برانڈ شراب میں ہوتی ہے، اور وہ مجھے گنگا جل میں نہائی ہوئی بیوی، تھما دیتی ہے، اس میں اتنی مٹھاس ہے کہ جی اُوب جاتا ہے۔ میں ان باتوں کا عادی نہیں ہوں، کبھی کبھی تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا جاؤں ___ ایک مرتبہ چلا بھی گیا تھا۔ تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔ ٹکٹ لیکر بمبئی کی گاڑی میں سوار ہو گیا تھا، لیکن اگلے اسٹیشن سے لوٹ آیا ___ گاڑی میں بیٹھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی گھناؤنا جرم کیا ہے۔ جیسے میرے پاؤں میں زنجیریں ہیں، جنہیں کوئی اپنی طرف کھینچ رہا ہے ۔ اور میں آگیا ___ ساوتری رات بھر جاگتی رہی تھی۔ اور شاید روتی بھی رہی تھی، کیوں کہ اس کی آنکھیں سوُج رہی تھیں، گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے غصّہ آنے لگا تھا، نہ جانے کیوں، نہ جانے کس پر، جی چاہتا تھا کسی کو قتل کردوں، اگر ساوتری اس وقت کسی غیر مرد کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہوتی تو میری آتما کو شانتی مل جاتی، میرے دل سے بوجھ اٹھ جاتا اور میں چپ چاپ لوٹ جاتا، لیکن وہ تو رو رہی تھی، میں نے اس سے بات تک نہیں کی، جا کر بستر پر پڑ گیا۔ اس نے آکر میرے جوتے اُتارے، کپڑے کھونٹی پر ٹانگے، دودھ کا گلاس لے آئی، میں نے پینے سے انکار کر دیا تو وہ میرا سر دبانے لگی، زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اگر وہ اس سمے ایک لفظ بھی کہتی تو میں مار بیٹھتا ۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

دوسرے کمرے میں چوڑیاں چھنکیں اور دوسرے ہی پل ساوتری کمرے میں آگئی۔ میز سے دوا کی شیشی اٹھا کر اس نے پیالی میں ایک خوراک انڈیلی اور سرمکھ کو تھما دی ۔ جب وہ دوا پی چکا تو تعریفی لہجے میں بولی ۔

"اب دودھ لے آؤں ___؟"

"نہیں ___"

"پی لو، صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا ۔"

"سُنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے ___" سرمکھ نے ڈانٹ دیا ۔ "اُدھر جا کر بیٹھو ۔"

ساوتری سر جھکائے، بھاری بھاری قدم اٹھاتی چلی گئی۔ مجھے سرمکھ کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا، لیکن میں چپ رہا۔

join eBooks Telegram

"دیکھ لیا تم نے — سرمکھ بولا۔ یہ مجھ پر حکومت کرنا چاہتی ہے — اور میں یہ حکومت برداشت نہیں کر سکتا، وہ سرمکھ ابھی پیدا نہیں ہوا جو عورت کا غلام بن کر رہے، اسے سمجھاتا ہوں تو سر لٹکا کر سب کچھ سن لیتی ہے، پھر ویسی کی ویسی — میں تو تنگ آ گیا ہوں — صرف ایک خیال آتا ہے کہ نہ تو یہ چالاک ہے کہ اپنے آپ کو سنبھال سکے، نہ اس کا آگے پیچھے کوئی ہے، ورنہ کبھی کا نکال باہر کرتا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش رہ کر پھر کہنے لگا۔ "میں نے تمہیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ساوتری میرے پاس کیسے آئی۔ کشنے کو جانتے ہو۔؟ نہیں جانتے شاید — پہلے یہ کشنے کے پاس تھی۔ نہ جانے وہ اسے کہاں سے لے آیا تھا، تب یہ سولہ سترہ برس کی ہوگی چار پانچ سال یہ اس کے ساتھ رہی۔ میں اس کے گھر آتا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر کئی بار میرے دل میں کشنے کو قتل کرنے کا خیال آیا، ایسی خوبصورت، سادہ دل، انگ انگ جیسے چھلک رہا ہو۔ کشنا کہا کرتا تھا یہ اس کی بہت سیوا کرتی ہے۔ پھر اس کا دل گاؤں کی ایک گجری پر آ گیا۔ وہ اسے لے آیا اور ساوتری کو گھر سے نکال دیا۔ اس شام میں کشنے کے گھر ہی جا رہا تھا کہ ساوتری راستے میں مل گئی۔ اس نے جب بتایا کہ وہ نکال دی گئی ہے تو میں اسے اپنے ساتھ لے آیا تب میرے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا۔ مجھے اس معصوم پر ترس آ گیا تھا۔" سرمکھ نے زبان ہونٹوں پر پھیری، پھر کہنے لگا۔ "پہلے تو میں اسے الگ کمرے میں سلاتا رہا۔ ایک رات اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میں ساوتری کے لئے جاگا ہوں۔ اس رات بڑے زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر بادل گرجتے اور بجلی چمکتی۔ میں کچھ دیر بستر پر پڑا سوچتا رہا، پھر نہیں رہا گیا اور میں اٹھ کر ساوتری کے کمرے میں چلا گیا — ساوتری گھوک، سو رہی تھی۔ میں اس کے بستر پر جا بیٹھا۔ پہلے تو ہاتھ لگاتے جھجک سی ہوئی۔ پھر میں نے کہا۔ سرمکھ سنگھ، ڈرتا کیوں ہے، کشنے کے ساتھ رہ آئی ہے، اس وقت تیرے گھر میں ہے، سب سمجھتی ہوگی۔ عورت ہی تو ہے، چل کر بسم اللہ — اور میں واہگورو کہہ کر اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ ہڑبڑا کے جاگی اور اندھیرے میں مجھے گھورنے لگی۔ میں نے کہا۔

"میں ہوں —"

وہ سمٹ سی گئی۔

میرے اندر پٹاخے سے چل رہے تھے اور وہ چھوئی موئی ہوئی جا رہی تھی میں نے دل میں کہا — جتنا چک لے واہگورو کہہ کے۔ ہاسنی گلابس ورگی — اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ پہلے تو مچھلی کی طرح تڑپی پھر پلستر ہو گئی۔ میں نے اناپ شناپ باتیں شروع کر دیں۔ پھر جو میں نے ہاتھوں کو ذرا اور ڈھیل دی تو تڑپ کے بولی —

"آپ کہیں گے بدمعاش ہے —!"

میں تو اس وقت جیسے گرم تیل کے کڑاہے میں پڑا تھا۔ جھٹ سے بولا۔

"نہیں، میں کوئی گدھا ہوں۔"

"وہ مسکرا دی ___ پھر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، یوں بھل گئی جیسے کئی سالوں سے میرے ساتھ رہ رہی ہو ___ صبح جب میری آنکھ کھُلی تو وہ آسن بچھانے پوجا پاٹ کر رہی تھی۔ اور مجھے اپنے آپ سے گھِن آنے لگی میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا ___ دوسری رات میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اس کے پاس جانے کی، اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ وہ آ گئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور دیوار پر ٹنگی ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ کئی منٹ تک ہم دونوں خاموش رہے۔ میں بستر پر لیٹا رہا اور وہ کھڑی رہی۔ پھر میں نے پوچھا ___ "کیا بات ہے۔؟"

اس نے دکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے۔"

"نہیں تو ___" میں واقعی اس سے ناراض نہیں تھا۔

"تو پھر ___"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور کلائی تھام کر اُسے بستر میں گھسا لیا۔ ساری رات وہ روتی ہنستی رہی۔ اور میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہا۔ پھر ہم ایک ہی کمرے میں سونے لگے۔

سر مکھو خاموش ہو گیا اور میں ساوتری کے بارے میں سوچنے لگا ___ کیسی لڑکی ہے؟ چار سال ایک مرد کے ساتھ رہ کر اب دوسرے کے ساتھ رہ رہی ہے ___ یہ شرافت ہے؟ معصومیت ہے؟ بے تعلقی ہے؟ آخر وہ کیا سوچتی ہے اس زندگی کے بارے میں ___ لیکن اسے بدچلن، بدکار، آوارہ بھی نہیں کہا جا سکتا تو کیا شرافت اور جسمانی رشتہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کیا اُس عورت کو نیک کہا جا سکتا ہے جو بغیر شادی کئے مختلف مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم رکھ سکے ___

جب میں آنے لگا تو ساوتری ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے آئی۔ وہ دروازے پر رک کر بولی۔

"بھائی صاحب، یہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں، انہیں سمجھائیے۔"

میں اس کی آنسو بھری آنکھوں کو دیکھ کر خاموش کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی ___ "مجھ سے تو انہیں نفرت ہو گئی ہے، میری ایک نہیں سنتے۔ بیماری میں بھی شراب پیتے ہیں۔" آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ "میں منع کرتی ہوں تو کہتے ہیں نکل جا میرے گھر سے، میں کہتی ہوں کہ ٹھیک ہو لو، تو چلی جاؤں گی۔ آپ ہی کچھ کیجئے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

join eBooks Telegram

"بھابی ——!" میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا اور بھاری قدموں سے باہر نکل گیا۔

چند دنوں کے بعد، ایک شام ساوتری مجھے بازار میں مل گئی۔ وہ بہت کمزور اور بیمار سی نظر آرہی تھی۔ چہرہ زرد تھا، آنکھیں خشک اور کھوئی کھوئی سی۔ بال پریشان، قدموں میں لغزش تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر دو کانوں میں جھانکتی ہوئی چلی جارہی تھی۔

"بھابی ——!" میں نے سامنے آکر اسے آواز دی۔

وہ چونکی۔ میری طرف دیکھا، اور ایک دم رو دی۔

"کیا بات ہے بھابی ——؟"

میرے دل میں کئی وسوسے جنم لے رہے تھے۔ خوف کے سائے سے لہرانے لگے تھے اور میں اس کے منہ سے بری خبر سننے کے خیال سے ہی گھبرا رہا تھا۔

"وہ چلے گئے ——"

"نہیں تو، کیا ہوا ——"

"چار دن سے گھر نہیں آئے ——"

"کیا ہوا تھا ——"

"مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ بس ایک صبح چلے گئے تو پھر نہیں لوٹے ——"

میں نے محسوس کیا کہ ساوتری کو کھڑے ہونے میں تکلیف سی ہو رہی ہے۔ ہم ایک ریسٹوران میں جا بیٹھے۔ بہت اصرار پر اس نے ایک کپ چائے پی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ سریکھا اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ اور اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ اُسے تو گھر سے نہیں نکال سکا، خود چلا گیا۔ لیکن میں نے ساوتری پر اپنے اس خیال کو ظاہر نہیں کیا۔

اچانک ساوتری نے پیالی پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں اس سمے ساون کی گھٹا کی طرح ہو رہی تھیں۔ اب بس سی کہ اب بس سی —— وہ بولی۔

"بھائی صاحب! مجھ میں کیا برائی ہے —— یہ سب مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہیں۔ میں تو کسی سے کچھ نہیں مانگتی، کچھ نہیں کہتی، ان کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتی ہوں —— پھر بھی —— بھگوان نے میری تقدیر ہی ایسی بنائی ہے، اس میں کسی کا کیا دوش ہے" اس کی آنکھیں چھلک آئیں

میں چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ میرے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ اسے گھر پہنچا دوں

join eBooks Telegram

اور اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کروں کہ سرمکھ کچھ دنوں تک لوٹ آئے گا۔ میں نے وہی کیا۔

جب ہم سرمکھ کے ہاں پہنچے تو گھر کی حالت ابتر ہو رہی تھی، جیسے وہاں بھوت بستے ہوں۔ وہ گلو کی بیل خوب پھیلی ہوئی تھی، لیکن تلسی کا پودا مُرجھا گیا تھا۔ گملے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے دو پہر سے پانی نہ دیا گیا ہو۔ آنگن میں کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ رسوئی کو دیکھ کر ایسا خیال آتا تھا جیسے اِدھر کسی نے توجہ نہ دی ہو۔ میں نے ساوتری کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بھابی بھوک لگی ہے۔"

"گھر میں کچھ نہیں ہے۔"

"اچھا! میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر میں باہر آگیا۔ جس دکان سے سرمکھ سودا سلف منگاتا تھا، اُسے راشن وغیرہ بھیجنے کے لئے کہہ کر میں نے بازار سے سبزی خریدی اور واپس آگیا۔ جب اندر پہنچا تو آنگن میں اجاگر کو بیٹھے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے نمستے کی اور بولا۔

"اچھا کیا آپ آگئے، بھابی نے تو کھانا پینا چھوڑ دیا ہے، آپ ہی انہیں سمجھائیے۔"

میں حیرت سے چارپائی پر بیٹھی ساوتری کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اُجاگر کبھی پسند نہیں تھا، جب وہ سرمکھ کی موجودگی میں آتا تو وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ سرمکھ سے بھی وہ شکایت کر چکی تھی کہ ایسے دوستوں کو گھر نہ لایا کرے۔ مجھ سے بھی اس نے کہا تھا۔۔۔ بھائی صاب! اُجاگر کی تو آنکھوں میں نہ جانے کیا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔"

اور اس شام اجاگر آنگن میں کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے گھر کا مالک ہو۔ سرمکھ کے چلے جانے سے شاید اُسے کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ میں کھڑا بیل میں چھپائی چڑیوں کو دیکھنے لگا۔ اجاگر بڑے نرم اور پریشان سے لہجے میں ساوتری کے لئے غم و پریشانی کا اظہار کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلے بھی وہاں آچکا تھا۔

"میں آپ سے ملنا بھی چاہتا تھا۔ آپ ہی بھابی کو سمجھا سکتے ہیں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ اپنی صحت خراب کرنے سے فائدہ نہیں۔۔۔"

ایک پل کو وہ میری طرف دیکھتا رہا، پھر مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر کمرے میں لے گیا۔ اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"اب سرمکھ نہیں آئے گا۔"

join eBooks Telegram

گو میں یہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا پھر بھی پوچھ لیا۔

"کیوں ——؟"

اجاگر نے باہر برآمدے میں بیٹھی ساوتری کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"پچھلے دنوں بھاگل پور جیل سے چھوٹی تھی۔ اُسے افیون اور ناجائز شراب کے کیس میں سزا ہوئی تھی ہفتہ ہوا وہ سریکھ سے ملی تھی۔ وہ اُسی کو لے کر کہیں چلا گیا ہے ——"

"کہاں ——؟" میں نے پوچھا

"یہ تو نہیں بتا گیا، اتنا کہہ گیا ہے کہ ساوتری کا خیال رکھنا اور آپ سے ملنے کو بھی کہا تھا۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ ایک مشکل تو حل ہو گئی تھی۔ اب مجھے ساوتری کا فکر تھا۔ وہ کیا کرے گی، کہاں جائیگی —— وہ خود کو نہیں سنبھال سکتی تھی۔ اپنے لئے زندہ رہنا اسے نہیں آتا تھا۔

"یہ مکان سریکھ ساوتری کے نام کر گیا ہے۔ کاغذ ساوتری کے پاس ہی ہے ——"

مجھے یہ جان کر کسی حد تک اطمینان ہوا۔ اس روز میں ساوتری سے بغیر کچھ کہے لوٹ آیا۔ اجاگر بھی میرے ساتھ ہی آ گیا۔ راستے میں وہ ساوتری کا ذکر ہی کرتا رہا۔ اس کی تعریف، اس کی تنہائی اور صحت کا غم جیسے اُسے کھائے جا رہا تھا۔ وہ اس کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھا۔ مجھے اُجاگر کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ ان میں خلوص نہیں تھا، مطلب براری کی بو تھی۔ وہ شاید مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ایک موڑ پر آ کر ہم جُدا ہو گئے۔

دوسرے دن شام کو جب میں پہنچا تو ساوتری آنگن میں لیٹی ہوئی تھی۔ میں اُسے سریکھ کے بارے میں بتانے آیا تھا، لیکن اُسے دیکھ کر میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ میں کرسی لے کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور سر پر آنچل لے لیا —— میلی ساری، زرد چہرے، پھیکی پھیکی سی آنکھوں اور پریشان بالوں میں وہ بہت مضمحل سی نظر آ رہی تھی ——

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بھابی ——؟"

وہ پھر رونے لگی۔

"دیکھو بھابی، اس طرح روتے رہنے سے کیا ہوگا" میں نے کہا —— اچھا ایک بات بتاؤ، سریکھ نے تم سے کچھ کہا تھا ——؟"

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بولی۔

"آخری دو دن تو مجھ سے بات بھی نہیں کی تھی —— رات کو بھی گھر نہیں آتے تھے، پہلے وہ کبھی گھر سے

join eBooks Telegram

باہر نہیں رہے تھے۔ میرا خیال ہے انہیں کوئی دوسری مل گئی تھی۔"

"میں نے بھی یہی سُنا ہے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر راز فاش کر دیا۔ "وہ کسی کو ساتھ لے کر یہاں سے چلا گیا ہے۔ اور اب شاید کبھی نہیں آئے گا۔"

ساوتری نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

اُسی سمے اُجاگر بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں دو سوتی ساریاں، ایک سوٹ کا کپڑا، دوپٹہ اور بلاؤز کے ٹکڑے تھے۔ سب کچھ ساوتری کے قدموں میں رکھ کر وہ اندر سے اپنے لئے کرسی لے آیا اور میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"رگھو میرا یار تھا۔ میرے جیتے جی بھابی کو تکلیف نہیں ہو سکتی۔" اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آپ بھی آتے رہیے گا۔ بھابی آپ کی بہت عزت کرتی ہیں۔"

اُجاگر کے آنے کے بعد میں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکا۔ اور اُٹھ کر آگیا۔ میرا خیال تھا وہ بھی میرے ساتھ آجائے گا۔ لیکن وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنی جگہ پر بیٹھ کر مجھ سے بے خبر ہو گیا۔ میں ساوتری پر ایک نظر ڈال کر آگیا۔

انہیں دنوں میرا چھوٹا سالا اور اس کی بیوی آگئے۔ ہفتہ بھر وہ رہے اور میں کہیں آجا نہیں سکا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے ساوتری کا خیال آیا اور مجھے ندامت سی کا احساس ہوا۔ کم از کم ایک آدھ مرتبہ ضرور ہو آنا چاہیے تھا۔ نہ جانے بے چاری کس حال میں ہو۔ میں اُدھر ہی چل دیا۔ اس کے مکان کے نزدیک ہی مجھے اُجاگر مل گیا۔ میں ساوتری سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ لیکن اب چارہ ہی کیا تھا۔

"اتنے دنوں آپ نہیں آئے۔ ساوتری آپ کو یاد کر رہی تھی۔" اُجاگر بولا۔

اس کے منہ سے بھابی کی بجائے ساوتری سن کر مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے یونہی جواب کی غرض سے کہہ دیا۔

"میرے کچھ رشتہ دار آگئے تھے۔ انہیں کے ساتھ مصروف رہا۔ بھابی کا کیا حال ہے اب؟"

وہ مسکرایا اور مونچھوں پہ تاؤ دے کر بولا۔

"اب تو اچھی ہے۔ آپ تو بھول ہی گئے تھے اُسے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ بڑی مشکل سے بھابی ہے، ورنہ جیسے رنڈا پا کاٹ رہی تھی۔" فقرہ مکمل کر کے وہ ہنس دیا۔

مجھے اُجاگر کی یہ ہنسی بُری لگی۔ کسی کے غم کا مذاق اڑانا کوئی اچھی بات نہیں۔ اور پھر ساوتری سے تو مجھے بے حد ہمدردی تھی۔ اپنے پن کا سا احساس ہوتا تھا۔

join eBooks Telegram

" گھر چلتے ہیں۔ ساوتری سے بھی مل لینا "

اس نے یہ الفاظ کچھ اس طرح ادا کئے جیسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دے رہا ہو۔ اس کے لہجے میں مکمل خود اعتمادی اور فتح کا احساس تھا۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ راستے میں ساوتری کی اچھی بُری عادتوں اور معصومیت کا ذکر کرتا رہا۔ ہر بات پر وہ ہنس کر کہتا۔ ہے مگر بچہ ہی۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو ساوتری تلسی کے پودے کو پانی دے رہی تھی۔ اس کی صحت آگے سے کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ بال سنورے ہوئے تھے اور اس نے ہرے رنگ کی سوتی ساری پہن رکھی تھی، اسی رنگ کا بلاؤز تھا، پیروں میں نئے چپل تھے۔ جو اجاگر اس کے لئے لایا تھا مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ اجاگر مجھے بیٹھنے کے لئے کہہ کر اس طرح کمرے کی طرف چلا گیا، جیسے اپنے گھر میں گھوم رہا ہو۔ اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور کارنس پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں باہر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سب کچھ وہی تھا۔ اس گھر میں۔ اُس آنگن میں میں کئی مرتبہ آکر بیٹھا تھا۔ وہی ساوتری، وہی تلسی کا پودا، جو پھر سے ہرا ہو گیا تھا، وہی گلوکی بیل، جو تراش دی گئی تھی۔ وہی رسوئی، وہی دیواریں، وہی ساوتری —— لیکن پھر بھی مجھے اس فضا سے اجنبیت کی بو آنے لگی تھی۔ مجھے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے میں کسی غیر جگہ پر آگیا ہوں، ایسے آدمیوں سے مل رہا ہوں جن سے پہلے کبھی نہیں ملا۔

" میں نے کہا، خط کہاں ہے جو بھیج دیا تھا تمہیں " اندر سے اجاگر نے کہا۔

" تصویر کے پیچھے رکھا ہے " ساوتری نے جواب دیا۔

ان دونوں کے لہجے نے مجھے ساری بات تفصیل سے سمجھا دی۔ مجھے اجاگر سے زیادہ ساوتری پر غصہ آیا اور جی میں آیا کہ آنگن میں تھوک کر چل دوں —— میں ابھی سوچ رہا تھا کہ اجاگر باہر آگیا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا ــــ

" اب میں بھی یہیں رہنے لگا ہوں "

میں نے ساوتری کی طرف دیکھا۔

اس نے نظریں جھکا کر اس کی تصدیق کر دی۔

" چائے بناؤ بھئی " اجاگر نے ساوتری سے کہا۔

" میں چائے پی کر آیا ہوں "

" ایک پیالی اور پی لیں " ساوتری بولی۔

" نہیں —— "

join eBooks Telegram

ساوتری نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ رسوئی میں جا بیٹھی۔

اُسے اس طرح سر لٹکائے جاتے دیکھ کر مجھے اپنے لہجے کی تلخی اور درشتی کا احساس ہوا۔ میں نے خود کو لعن طعن کیا۔ مجھے کیا حق ہے اس سے اس طرح بات کرنے کا ۔۔۔ میں اس سے کیوں ناراض ہوں۔ کیا بُرا کیا ہے اس نے، پہلے وہ کشنے کے ساتھ رہتی تھی، پھر اسے سرکھُجے آیا۔ اب اُجاگر اس کی زندگی میں آگیا ہے۔ وہ اس قدر معصوم، سادہ لوح، اور کمزور ہے کہ خود کچھ نہیں کر سکتی۔ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا، اس کے بس کی بات نہیں ۔۔۔ وہ جوان ہے، خوبصورت ہے، اکیلی ہے ۔۔۔ اور میں اسے ہمدردی کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں؟ پھر مجھے ناراض ہونے کا کیا حق ہے۔

اجاگر چپ چاپ بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگے آپ ۔۔۔؟"

"کچھ نہیں، کالج کی ایک بات یاد آگئی تھی۔"

اجاگر نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میں نے سوچا اس طرح روز آنے جانے میں ساوتری کی بدنامی ہوگی، یہیں کیوں نہ رہ جاؤں۔ ساوتری کو بھی اکیلے ڈر آتا تھا۔ پھر یہ نہ کچھ کھاتی تھی نہ اپنا خیال رکھتی تھی۔"

"ہاں، اکیلے تو اسے بہت تکلیف ہوتی۔" میں نے طنزاً کہا۔

اجاگر میرے طنز کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے شہ پا کر کہا۔

"جی، جی، بس یہی میں نے بھی سوچا تھا۔"

میں گھڑی میں وقت دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے ایک جگہ پہنچنا ہے، اب چلتا ہوں۔"

"کبھی کبھی آتے رہیے گا۔" اجاگر نے کہا۔

میں راستے بھر سوچتا رہا کہ اجاگر کیوں مجھے اپنے نزدیک لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں سرکھُج کا دوست ضرور تھا، ساوتری بھی میری واقف ہوگئی تھی، سرکھُج کی وساطت سے اُجاگر سے بھی واقفیت تھی، لیکن میرے اس قدر نزدیک کبھی نہیں ہوا۔ شاید سرکھُج کا خیال ہو اسے۔ اور وہ مجھے اس گھر میں آنے جانے کی اجازت دے کر دوستی کا فرض ادا کر رہا ہو ۔۔۔ خیر میں نے وہاں آنا جانا کم کر دیا۔ میں مہینہ مہینہ بھر ادھر کا رُخ نہ کرتا۔ کبھی کبھی ساوتری سڑک پر اکیلی مل جاتی تو ہم دو چار منٹ ایک طرف کھڑے ہو کر باتیں کر لیتے۔ بس یونہی سی، بے مطلب باتیں، جن کا ہماری زندگی سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ میں محسوس کرتا کہ در اصل میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں اور مصلحت کے لئے باتیں کئے جا رہا ہوں۔ اس کی آنکھیں بھی ایسی ہی پہیلی کہانیاں جیسے وہ اپنے پر جبر کر کے خلاف

join eBooks Telegram

فطرت ایسی باتیں کئے جا رہی ہے، جن کا اس کے دل سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ کہتی نہ میں پوچھنے کی کوشش کرتا۔ نہ وہ مجھے گھر آنے کی دعوت دیتی اور نہ میں جانے کی کوشش کرتا۔

ایک صبح وہ مجھے ستیلا مندر میں نظر آ گئی۔ شاید نوراتروں کا تہوار تھا۔ میں اپنی بیوی کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ مندر گیا تھا۔ ساوتری کو دیکھتے ہی میں قدرے ڈر گیا۔ اگر اس نے میری بیوی سے ملنے کی دیرینہ خواہش کو آج عملی جامہ پہنا دیا تو میری حالت کیا ہوگی۔ میں کملا کو کیا کہہ کر سمجھاؤں گا۔ ساوتری میری بیوی اور بچے کو نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس کا ہر قدم اٹھنے پر دل کی دھڑکن کو تیز کر رہا تھا۔ میں اسے اشارے سے بھی منع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس سمے مندر میں بہت سی عورتیں اور مرد آ جا رہے تھے اور کملا لگاتار مجھے کسی رشتہ دار عورت کے بارے میں کچھ سنائے جا رہی تھی۔ ادھر سے ذرا سی بے توجہی بھی اسے شکوک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ ساوتری ہمارے نزدیک سے گزر گئی۔ میری جان میں جان آئی۔ آگے جا کر بھی شاید اس نے مڑ کر کملا کی طرف دیکھا تھا۔ کملا نے بھی چونک کر پیچھے دیکھا اور اپنی بات بھول کر بولی۔

"یہ لڑکی کون ہے ـــ؟"

"مجھے کیا پتہ، تمہاری کوئی سہیلی وغیرہ ہوگی۔"

"مجھے تو یاد نہیں آتا، شاید سکول کالج میں ساتھ پڑھی ہو۔" کملا نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے کہا اور پھر اس رشتہ دار عورت کا قصہ لے بیٹھی۔

ایک شام ساوتری مجھے بازار میں مل گئی۔ وہ ایک دکان سے سبزی خرید رہی تھی۔ میں بھی سبزی لینے ادھر گیا تھا۔ اس نے بینگن خریدے تو میں نے ہنس کر کہا۔

"بھابی، آپ تو بینگن کھاتی نہیں۔"

"انہیں پسند ہیں۔"

میں اس کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اچانک وہ بولی۔

"اس روز مندر میں آپ کے ساتھ بہن جی تھیں نا؟" وہ مسکرائی۔ "میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ سندر ہیں، اس کالے بارڈر کی پیلی ساری میں بہت پھب رہی تھیں۔ اور آپ کا لڑکا بڑا پیارا تھا۔ کس طرح آپ کی انگلی پکڑے چلا جا رہا تھا۔ آپ اسے شاید کچھ بتا رہے تھے۔"

"ہاں، وہ تالاب میں تیرتی مچھلیوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کیا ـــ؟"

"کہ، مچھلیاں ڈوبتی کیوں نہیں ـــ؟"

join eBooks Telegram

وہ ہنس دی۔

"گھر میں بہن جی کا دل لگا رکھتا ہوگا۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولی "آپ تو اس روز مجھے وہاں دیکھ کر ڈر گئے تھے، نظر بھی نہیں ملائی، آپ کا خیال ہوگا، میں آپ کو روک نہ لوں —" ہنس دی، ایک زخم خوردہ دل کی پھیکی سی ہنسی، جو میرے دل میں خنجر کی طرح اتر گئی "میں اب اتنی بھلی وقوت نہیں رہی۔"

شرم سے میرا سر جھک گیا، وہ بھولی بھالی، ان پڑھ لڑکی دل کی گہرائیوں سے سب کچھ کرید لائی تھی اور نہایت سادگی سے ایک بھرپور تھپڑ میرے منہ پر دے مارا تھا۔

"میں جانتی ہوں، وہ مجھ سے کیوں نہیں مل سکتیں۔ اسی روز سمجھ گئی تھی، جب انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہمارے گھر نہیں آسکتیں — میں بڑی جو ٹھہری۔" وہ ایک دم اداس ہو گئی "اچھا چھوڑیئے، ایک بات بتلایئے، اگر میں آپ کے لڑکے کے لئے سویٹر بنا دوں تو آپ لے جائیں گے —؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنی بیوی کے سوالات کا خیال آ رہا تھا۔

وہ شاید میری کیفیت بھانپ گئی۔ بولی۔

"بہن جی سے کوئی بہانہ کر دیجئے گا۔ آپ کے تو بہت سے دوست ہوں گے۔ کسی کا نام لے دیجئے گا — لال بناؤں گی، نیلی سلیکس پر بڑا اچھا لگے گا۔ بنا دوں گی۔ ہیں!"

میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ پھر ہم جدا ہو گئے۔

کئی دن گزر گئے۔ نہ ساوتری سے سڑک پر ملاقات ہوئی، نہ میں اس کے گھر گیا۔ ایک شام اجاگر مل گیا۔ وہ رکشا میں تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے رکشا رکوائی اور کود کر قریب آگیا۔

"کہاں رہے، کبھی ملنے ہی نہیں آئے، میں آپ کا دوست نہ سہی، ساوتری سے ہی ملنے آجاتے۔"

وہ ایک سانس میں کئی باتیں کہہ گیا "اس وقت کدھر جا رہے ہیں۔"

"گھر ہی جا رہا ہوں۔"

"تو آیئے، کہیں بیٹھتے ہیں چل کر۔"

وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ رکشا میں بٹھائے گیا۔ راستے میں دیسی ٹھیکے سے ایک بوتل لی۔ اور ہم ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ منیجر شاید اس کا واقف تھا۔ اجاگر کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور بیرے سے ہمیں اوپر کمرہ نمبر سات میں پہنچانے کو کہا۔ میں نے اس کی پشت پر دیوار سے آویزاں تختی کی عبارت پڑھی — ہوٹل میں بیٹھ کر شراب پینا سخت منع ہے — اور مسکراتا ہوا اجاگر کے ساتھ ہو لیا۔ ہر کمرے سے قہقہوں اور بوتل اور گلاس ٹکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ کسی کسی دروازے کے پیچھے کسی عورت کی دبی دبی

join eBooks Telegram

آواز بھی سنائی دے جاتی — کمرہ نمبر سات سے شاید کوئی ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا۔ کمرے میں چھوڑی ہوئی بوتلیں اور سگریٹ کے ٹکڑے پڑے تھے، اور فضا میں شراب اور سگریٹ کی بو رچی ہوئی تھی۔ بستر کے تکیے پر ایک گڑھا سا تھا، جیسے کوئی دیر تک اس پر سر رکھے لیٹا رہا ہو۔

میرے لئے کوکا کولا منگا کر، اجاگر نے اپنے لئے ایک بڑا پیگ بنایا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے، مونچھیں صاف کرتا ہوا بولا۔

"پروفیسر صاحب، آپ سرکھو کے دوست ہیں، اس لئے میرے بھی، وہ آپ کی عزت کرتا تھا، میں بھی کرتا ہوں، وہ اپنا یار تھا —" اس نے اپنے لئے دوسرا پیگ تیار کیا اور آدھا گلاس پی کر بولا "آپ نے آنا کیوں بند کر دیا ہے"

میں سمجھ رہا تھا کہ اب وہ نشے میں آ رہا ہے۔ اس لئے مسکرا کر بولا۔

"نہیں، نہیں — ایسی کوئی بات نہیں، ذرا گھر کے کاموں میں مصروف رہا"

وہ ہنسا — اور گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ پھر بولا۔

"ایک بات بتائیں گے؟"

"کیا —؟"

"ساوتری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ — میرا مطلب ہے — وہ کیسی لڑکی ہے؟"

میں نے اجاگر کی آنکھوں میں جھانکا، یہی سوال ایک دن سرکھو نے بھی کیا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"اچھی ہے —!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ چاہے کسی کی قسم دلوا لیجئے۔ میں سچ مچ یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بری نہیں ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ نہیں آتی — سرکھو نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔ کشنے نے اسے کیوں نکال دیا تھا — آپ کی سمجھ میں آتا ہے کچھ"

میں چپ رہا۔

اجاگر نے تیسرا پیگ بنایا اور گھونٹ بھر کر بولا۔

"وہ آپ کو کچھ عجیب نہیں لگتی — میرا مطلب ہے وہ بدمعاش بھی نہیں، پھر بھی ایک کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ رہنے لگتی ہے — لیکن ایک بات ہے — وہ جھوٹ نہیں بولتی — اس کا دل اور جسم — دونوں جھوٹ سے کوسوں دور ہیں — میری بات سمجھ گئے نا آپ — میں نشے میں بہک نہیں رہا — آدھی بوتل پی کر بھی مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ میں بہت دنوں سے آپ سے مل کر یہ

join eBooks Telegram

باتیں کرنا چاہتا تھا سربکھ کہتا تھا آپ سے زیادہ ساوتری کو کوئی نہیں سمجھتا۔ میری بات کا بُرا نہ مانیئے گا۔ کبھی آپ کو ساوتری کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی — مجھے تو وہ جیسے چٹکیاں بھرتی رہی ہے — جب وہ سربکھ کے ساتھ رہتی تھی۔ تب ہی سے میری نیت خراب تھی — لیکن سربکھ اپنا یار تھا۔ یار کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ اور میرا خیال ہے ساوتری بھی ایسی عورت نہیں۔ کوئی اسے لاکھ روپیہ بھی دے، تو بھی وہ مجھے دھوکہ نہیں دے گی۔ جب سربکھ چلا گیا تو مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اتنی بھولی بھالی لڑکی کی ایسی حالت ہو — دل کو دکھ ہوتا تھا، میں وہاں جانے لگا۔ اور ایک شام مجھے احساس ہوا کہ ترس ورس کچھ نہیں، مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔ اور میں اس کے لئے آتا ہوں۔ اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ بات میں نے اس سے صاف صاف کہہ دی۔ سن کر وہ چپ ہو رہی۔ اس دن میں بہت اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ رات کو دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر اس کے گھر چلا گیا۔ وہ اندر کمرے میں لیٹی رہی اور میں باہر آنگن میں بیٹھا آسمان کو دیکھتا رہا۔ آدھی رات گزر چکی تو میں اٹھ کر اس کے کمرے میں چلا گیا — وہ بے خبر سو رہی تھی — ہے نا عجیب بات۔ میں نے اُسے چھُوا تو وہ جاگ گئی۔ کچھ دیر میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا — وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ انکار کرے گی اور مجھے سختی سے کام لینا پڑے گا لیکن وہ رونے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ مجھے بدمعاش یا بُری تو نہیں سمجھتے؟"

"کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ یہی سوال اس نے سربکھ سے بھی کیا تھا۔

اجاگر نے میری طرف دیکھا۔ تیسرا پیگ بھی ختم کیا اور کہنے لگا۔

"میں حیران رہ گیا۔ ایسے موقعہ پر تو بدمعاش سے بدمعاش عورت سے بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی تو بات ہی اور ہے۔ اس کا خیال تھا میں اسے آوارہ اور بدچلن سمجھ کر یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔ واہگورو کی قسم میں نے اسے کبھی ایسی ویسی نہیں سمجھا۔ میں نے قسمیں کھا کھا کر اُسے یقین دلایا تو آنسو پونچھ لئے۔"

اجاگر خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"سربکھ کیوں اسے چھوڑ گیا۔ بس یہی سمجھ نہیں آتا!"

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ چپ بیٹھا رہا۔ پھر ہم لوگ آ گئے۔

مجھے بچوں کی نفسیات پر ریسرچ کرنے کے لئے وظیفہ مل گیا اور میں چھ مہینے کے لئے باہر چلا گیا۔ اس تمام عرصہ میں میری بیوی اپنے مائکے میں رہی۔ میں کبھی کبھی وہاں ہو آتا۔ جب میں کام مکمل کر کے لوٹا تو

join eBooks Telegram

اتفاقاً اسٹیشن پر اجاگر سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی باہر سے آرہا تھا۔ اس نے ساوتری کا ذکر اس طرح کیا جیسے زندگی میں کسی غیر ضروری بھولی بسری چیز کا ذکر کر رہا ہو۔

دوسرے دن میں بیوی کے نام خط پوسٹ کرنے جارہا تھا کہ ساوتری راستے میں مل گئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ کچھ پریشان سی تھی۔ میں نے اسے روک لیا۔

"کیا بات ہے بھابی یہ پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

"چوٹ لگ گئی ہے۔"

"کیسے؟"

اس نے جواب میں میری طرف گہری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"گر پڑی تھی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"بھابی جھوٹ بھی بولنا شروع کر دیا۔"

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر اس نے بتایا کہ ایک روز اجاگر نے نشے میں اسے مارا تھا اور وہ دیوار سے جاٹکرائی تھی، جس سے ماتھے پر چوٹ آگئی۔ سرکھُو نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اجاگر نے یہ ذلالت بھی کی۔

وہ چلی گئی۔

دوسرے دن میں اس کے گھر گیا، میں دل سے مجبور ہوگیا تھا، بار بار یہ خیال آتا کہ ساوتری خوش نہیں اور اجاگر کا سلوک بدل گیا ہے، میں اجاگر سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ ساوتری رسوئی میں روٹی پکا رہی تھی۔

اجاگر ہنس کر ملا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ جب میں نے بات کرنا چاہی تو وہ مجھے باہر لے آیا۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح بات شروع کروں۔ ویسے تو مجھے ان کے ذاتی جھگڑے میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں تھا لیکن مجھ سے ساوتری کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا تھا۔

"آج کل ساوتری مجھ سے ناراض ہے" وہ خود ہی بولا۔

"کیوں ---!"

"کہتی ہے بچے کیوں نہیں ہوتے۔"

اجاگر نے یہ بات اس طرح کہہ دی جیسے عورت کی نہیں گائے بھینس کی بات کر رہا ہو۔ مجھے اس میں

join eBooks Telegram

بڑا کھُردرا پن محسوس ہوا۔

وہ بولا۔

عجیب عورت ہے، وہ چاہتی ہے اس کے بچے ہوں، میں سوچتا ہوں اُنہیں پالے گا کون۔
میں کہہ جی میں آیا کہوں۔ تم۔ لیکن اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔ وہاں انکار
لکھا نظر آیا۔

• پھر آپ جانتے ہیں کہ بچے ہو جانے پر عورت میں وہ بات نہیں رہتی۔
مجھے جیسے دھکا سا لگا۔ جیسے میں آدمی سے نہیں بھیڑیئے سے باتیں کر رہا ہوں۔ عورت سے اُس کا
فطری حق چھیننا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اور یہ ظلم بھی مرد کے حق میں ہے۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ عورت
اس مرد سے بے پناہ محبت کرنے لگتی ہے، جس کے بچے کو وہ اپنی چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہو۔ لیکن میں
چپ رہا۔ میرا تو گلا جیسے گھُٹ رہا تھا۔

اُجاگر ہنس کر بولا۔

• میں اس مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتا۔
اس کے ان الفاظ سے اس کا سارا کردار جھانک رہا تھا۔ ساوتری کا تاریک مستقبل نظر آر ہا تھا۔
وہ اُسے چھوڑ جائے گا۔ وہ اسے اب اور زیادہ دیر اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔ اس کا دل اس سے بھر
گیا ہے۔ میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کر دیا۔

• تم شاید اب ساوتری کو چھوڑ دینا چاہتے ہو۔
• نہیں، ایسی بات نہیں۔ میں۔ میں سوچتا ہوں۔
اس نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی آواز میں خود اعتمادی اور یقین کی پختگی نہیں تھی۔ اُسے اپنا مطلب
ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

• اُجاگر سنگھ، ساوتری تباہ ہو جائے گی۔
• آپ تو مجھے قصور وار ٹھہرانے لگے۔ میں تو اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔
• تم اس سے شادی کر لو۔
• وہ تو میں تا دم نا بھی نہیں کر سکتا۔
• کیوں ۔۔۔؟
• میری بیوی گاؤں میں ہے۔

join eBooks Telegram

"تمہاری بیوی ۔۔۔!"

"طلاق نہیں ہوتا۔ نہ ہماری آپس میں بنتی ہے۔"

"تو ساوتری کا کیا ہوگا۔؟"

اُجاگر سڑک سے گزرتی ایک عورت کو دیکھنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی خاموشی میں مجھے ساوتری کا تاریک مستقبل نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم جدا ہو گئے۔

پھر میں نے اُجاگر کو ایک ایسی عورت کے ساتھ گھومتے دیکھا جو بہ آسانی پیشہ ور کہی جا سکتی تھی اور ناچ گانے، کے پردے میں جس نے شہر کے ایک غیر آباد علاقے میں چکلہ کھول رکھا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اُجاگر سے اشارتاً کہا بھی کہ وہ ساوتری جیسی نیک اور معصوم لڑکی کو دھوکا دے رہا ہے تو اس نے ہنس کر کہا۔۔!"

"وہ بہت بور کرنے لگی ہے۔ بہت ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں کرنے لگی ہے۔ ہر وقت بچوں کا رونا لے بیٹھتی ہے۔ اور پھر میں کب منع کرتا ہوں، عیش کرے۔ اس میں دھوکے کی کیا بات ہے۔ میں آپ سے ہاتھ ملاتا ہوں، آگے جا کر کسی اور سے ملا لیتا ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اسی شام میں ساوتری سے ملنے گیا۔ میں اسے اُجاگر کے ارادوں سے خبردار کر دینا چاہتا تھا۔ وہ آنگن میں ہی مل گئی۔ اسے دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ نہایت بھڑکیلے اور باریک کپڑے پہنے بیٹھی تھی، جن میں سے اس کا جسم نظر آرہا تھا۔ اس نے خوب زوردار میک اپ کر رکھا تھا اور بالوں کی چوٹیاں بنائی ہوئی تھیں، جس سے وہ اور بھی بھدی لگنے لگی تھی۔ مجھ سے پوچھے بنا نہ رہا گیا۔

"بھابی یہ کیا سوانگ بھرا ہے؟"

وہ اداس ہو گئی۔ پھر بولی۔

"بھائی ساب! ان ناچنے گانے والیوں میں کیا خاص بات ہوتی ہے جو مجھ میں نہیں۔ کیا کمی ہے مجھ میں۔ کیا میں خوبصورت نہیں جوان نہیں۔؟"

ساوتری کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے شرم آنے لگی۔

"بھابی۔۔!"

"ہاں بھائی ساب! مردوں کو یہی باتیں پسند ہیں۔ میں نے سوچا ایسی ہی بن جاؤں۔ لیکن لیکن ۔۔ وہ پھپھک کر رو دی۔ اور آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولی ۔۔ پھر بھی وہ مجھ سے خوش نہیں اس کنجری کے پاس جاتے ہیں۔ میں کیا کروں۔۔ کیا کروں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا

join eBooks Telegram

میں چپ چاپ لوٹ آیا۔ اسے پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔ ساوتری کا خطرناک انجام رہ رہ کر دل میں کانٹے چبھو رہا تھا۔ اور ایک رات میں نے یہ انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

میں کملا کو لینے اسٹیشن گیا تھا۔ گاڑی آنے میں کچھ دیر تھی میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا اچانک میری نظر ایک بینچ پر بیٹھی ساوتری پر پڑی۔ وہ تنہا تھی۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور نظریں جھکا لیں۔

"بھابی ۔۔۔!"

اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"یہاں بیٹھی ہو ۔ جا رہی ہو کہیں ۔۔۔؟"

"ہاں ۔"

"کہاں ۔ اجاگر ہے ساتھ ۔"

"نہیں ۔"

"اکیلی ہو ؟"

"نہیں ۔"

"کون ہے ساتھ ؟"

وہ چپ رہی۔

"کہاں جا رہی ہو ؟"

"پتہ نہیں، وہ ٹکٹ لینے گئے ہیں ۔"

اس جواب سے میں نے سمجھ لیا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

دوسرے ہی لمحے ایک شخص ہمارے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ وہ شکل سے کوئی عادی مجرم لگتا تھا۔ اس نے سختی سے ساوتری سے کہا۔

"چلو ۔۔۔"

ساوتری چپ چاپ اٹھی اور اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی۔

---

join eBooks Telegram

"گرداب"

تاریک سیّارہ

اور

آبجو

کے بعد

یادیں

جس میں اخترالایمان کے پہلے تین مجموعوں کی تمام نظمیں اور ان مجموعوں کی اشاعت کے بعد کہی ہوئی کئی ایک نئی نظمیں بھی شامل ہیں ۔ اخترالایمان اس دور کے واحد شاعر ہیں جو مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں ۔ ان کی شاعری جدید اردو شاعری کی لاج رکھتی ہے ۔

سفید کاغذ ۔ مجلّد ۸/۱ ڈمی سائز قیمت چھ روپے

مکتبۂ سوغات ۲۷ کلائن روڈ بنگلور ۵

پاکستان میں طاہر پبلشرز نکل روڈ ۔ کراچی

join eBooks Telegram

البیر کامتو

ترجمہ
محمد عمر میمن

نظرِ ثانی
محمود ایاز

join eBooks Telegram

اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو موسیو، کیا میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے آپ اس معزز گوریلے کو، جو اس کاروبار کی قسمت کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، اپنی بات سمجھا نہیں پائیں گے۔ درحقیقت اسے ذبح کے سوا اور کوئی بولی نہیں آتی۔ آپ اگر مجھے اپنی ترجمانی کی اجازت نہیں دیں گے تو وہ ہرگز یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ آپ کو جِن درکار ہے۔

میں نے کہا تھا نا، دیکھئے وہ میری بات سمجھ گیا۔ اب وہ آگے آ رہا ہے، بلکہ ایک شعوری احتیاط کے ساتھ عجلت بھی کر رہا ہے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ وہ بڑبڑایا نہیں۔ جب اُسے کسی کی فرمائش کی تعمیل سے انکار کرنا ہوتا ہے تو وہ صرف بڑبڑاتا ہے۔ اپنے مزاج کا آپ مالک ہونا دراصل گرانڈیل جانوروں کی خصوصیت ہے۔ اب میں چلتا ہوں موسیو۔ مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کام آ سکا بشکریہ، میں ضرور آپ کی میز پر آ جاتا لیکن شاید آپ کی لطف اندوزی میں خلل پڑے۔ آپ کی نوازش ہے۔ چلئے یوں ہی سہی میں اپنا گلاس لے آتا ہوں۔

آپ نے ٹھیک کہا۔ اس گوریلے کی مستقل خموشی اور گونگاپن آدمی کو بہرہ بنا دیتے ہیں۔ اس کا سکوت پرانے زمانے کے گھنے جنگلات کی اس خاموشی کی مانند ہے جس کے اندر ہزاروں خطرات پنہاں ہوں۔ اظہار کے مہذب ذرائع ـــــ الفاظ اور زبان ـــــ سے وہ جس ضد اور التزام کے ساتھ بے اعتنائی برتتا ہے۔ اس پر کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے۔ امسٹرڈیم کے اس شراب خانے میں مختلف قومیت کے ملاحوں کی تفریح طبع کا انتظام کرنا اس کا کاروبار ہے (خدا جانے اس شراب خانے کا نام "میکسیکو سٹی" کیوں رکھا گیا ہے!) اس کاروبار کی نوعیت اور فرائض کے مدِنظر اس کی یہ جہالت کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ کرومیگنن عہد کے اس انسان کا تصور کیجئے جسے منارہ بابل میں قید کر دیا گیا ہو۔ لازماً وہ اپنے آپ کو ماہیٔ بے آب محسوس کرے گا، اپنے عناصر سے الگ! تاہم یہ شخص اپنی جلاوطنی سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ تو بس اپنے من موجی طریقے پر چلا جا رہا ہے، کسی بات کو محسوس کئے یا کوئی اثر لئے بغیر۔ اس کی زبان سے جو دو چار نایاب جملے کبھی کبھی نکل پڑتے ہیں ان میں سے ایک جملہ یہ ہے۔ "آپ کی مرضی۔ چاہے لے لیں، چاہے

چھوڑ دیں۔ اب آپ ہی بتایئے آخر انسان کیلئے سکتاہے اور کیا چھوڑ سکتاہے؟ بلاشبہ، اگر چھوڑنا ہی ہو تو اسے ہی کیوں نہ چھوڑ دیں؟ ہاں مجھے اعتراف ہے، میں عموماً ایسے لوگوں کی طرف رغبت محسوس کرتا ہوں جن کی طبیعت کا خمیر کسی ایک عنصر سے اٹھا ہو۔ جس کسی نے بھی بطور پیشہ یا بطور شوق انسان کی ہنسی پر غور و خوض کیا ہو اس کے لئے اعلیٰ درجہ کے حیوانات سے ایک تعلق خاطر محسوس کرنا ناگزیر ہے۔ کم از کم ان کے ہاں انسانوں کی طرح درپردہ اغراض نہیں ہوتیں۔

سچ پوچھئے تو "میکسیکو سٹی" کے ہمارے اس میزبان کی کچھ نہ کچھ درپردہ اغراض ضرور ہیں جنہیں وہ بڑی کوشش سے اپنی ذات کی گہرائی میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ چونکہ اس کی موجودگی میں ہونے والی کوئی بات سمجھ نہیں پاتا، اس لئے اس کے کردار میں بے اعتمادی آگئی ہے۔ اور اس کے چہرے کا مجروح وقار اس بات کی غمازی کرتاہے کہ اس کے نزدیک انسانوں میں ضرور کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ چنانچہ اس قسم کا مزاج رکھنے والے آدمی سے کوئی ایسی بات کرنا، جو اس کے کاروبار سے متعلق نہ ہو، مشکل ہوتاہے۔ مثال کے طور پر ذرا پشت کی دیوار پر، ٹھیک اس کی نشست کے اوپر جو خالی چوکھٹا ہے اُسے دیکھئے۔ چوکھٹے کا نشان بتا رہاہے یہاں کبھی کوئی تصویر ہوا کرتی تھی۔ اور وہاں واقعی ایک شاہکار اور بہت دلچسپ تصویر ٹنگی ہوتی تھی۔ تصویر کی خریداری اور اس کی فروخت دونوں موقعوں پر میں موجود تھا۔ دونوں موقعوں پر اس نے ہفتوں کے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا تھا اور دونوں بار اسی بے اعتمادی کے ساتھ۔ اس ضمن میں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس کی فطرت کی بے باک سادگی کو ختم کرنے میں معاشرے کا کافی ہاتھ ہے۔

اس کا خیال رکھیئے، میں کوئی فیصلہ نہیں صادر کررہا ہوں بلکہ میں تو اس کی بے اعتمادی کو حق بجانب سمجھتا ہوں اور اگر میری ملنسار طبیعت، جس کا آپ کو اندازہ ہو رہا ہوگا، میرے آڑے نہ آتی تو میں خود بھی یہی رویہ اختیار کرتا۔ میں باتونی آدمی ہوں اور بدقسمتی سے جلد دوست بنالیتا ہوں۔ گو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ خود کو دوسروں سے ایک مقررہ فاصلے پر کس طرح رکھنا چاہیئے۔ تاہم میں میل ملاپ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جس وقت میں فرانس میں تھا ان دنوں جہاں کہیں کوئی ذہین آدمی نظر آتا میں فوراً اس کے تقرب کی صورت پیدا کرلیتا۔ اب اگر یہ بیوقوفی کی بات ہے۔۔۔ اچھا، آپ اس بات پر مسکرا رہے ہیں۔ ہاں مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ایسا موڈ اور اچھی گفتگو میری کمزوری ہیں۔ اور یقین جانیئے یہ ایسی کمزوری ہے جس کے لئے میں اکثر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ریشمیں زیر جامہ پہننے کی عادت کا یہ لازمی مطلب نہیں کہ پہننے والے کے پیر گندے ہیں۔ تاہم ریشم کی طرح، بیشتر اوقات اسلوب بیان بھی خارش کی پردہ پوشی کرلیتاہے۔ تسلی کے طور پر میں اپنے آپ سے کہہ لیتا ہوں کہ جو لوگ زبان کا قتل کرتے ہیں وہ بھی بہرحال پاک یا

join eBooks Telegram

خالص نہیں ہوتے۔ہاں، ہاں، کیوں نہیں، ایک ادرجن ہوجائے۔

کیا آپ امسٹرڈیم میں زیادہ دن رہیں گے؟ بہت خوبصورت شہر ہے! دلکش! یہ لفظ میں نے کافی عرصے سے نہیں سُنا تھا۔ پیرس چھوڑنے کے بعد، جسے اب کئی سال ہوتے ہیں، میرے کان اس لفظ سے آشنا نہیں ہوئے تھے لیکن دل کا اپنا حافظہ ہوتا ہے۔ میں نے نہ اپنے خوبصورت دارالخلافے کی کوئی چیز بھلائی ہے نہ اس کے تبدیلگاہ میرے ذہن سے محو ہوتے ہیں۔ پیرس سچ مچ کا تماشا خانہ ہے۔ کٹھ پتلیوں کے لئے بنایا ہوا ایک عظیم الشان اسٹیج جو چالیس لاکھ نیم دھندلی شکلوں اور سایوں سے آباد ہے۔ گلدستہ مردم شماری میں یہ تعداد پچاس لاکھ کو پہنچ گئی تھی! بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ لیکن مجھے حیرت نہیں ہے کیونکہ مجھے ہمیشہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے شہریوں کو صرف دو شوق ہیں —— خیال پرستی اور زناکاری۔ اور دونوں بس یونہی، بلا وجہ، خواہ مخواہ۔ بہر حال ہمیں انھیں مردود نہیں قرار دینا چاہئے کیونکہ اس معاملے میں یہ اکیلے نہیں ہیں۔ پورا یورپ اسی کشتی میں سوار ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں مستقبل کا مورخ ہمارے بارے میں کیا لکھے گا! جدید انسان کے لئے بس ایک جملہ کافی ہوگا۔ "اس نے زناکاری کی اور اخبار پڑھے۔"! اس جاندار تعریف کے بعد میرے خیال میں، جدید انسان کے بارے میں کچھ مزید کہنے کی گنجائش نہیں باقی رہے گی۔

ارے نہیں، میرا اشارہ ڈچ قوم کی طرف نہیں ہے۔ یہ لوگ ابھی اتنے زیادہ جدید نہیں ہیں۔ ان کے پاس ابھی وقت کی فراوانی ہے۔ ذرا ان کی طرف دیکھئے۔ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ —؟ جی، یہ حضرات کچھ بھی نہیں کرتے۔ یہ تو ان خواتین کی کمائی پر جیتے ہیں جو وہاں، اس طرف ہیں۔ علاوہ ازیں یہ سب کے سب، کیا مرد، کیا عورت، متوسط طبقے کی مثالی مخلوق ہیں جو حسب معمول حکایات و اساطیر کے جنون میں یا پھر محض حماقت کی وجہ سے یہاں چلے آتے ہیں۔ یوں سمجھئے ضرورت سے زیادہ تخیل یا تخیل کا مکمل فقدان انہیں یہاں کھینچ لاتا ہے۔ کبھی کبھار ان لوگوں میں چاقو بھی چلتے ہیں، تھوڑی بہت پستول بازی بھی ہو جاتی ہے لیکن اس سے یہ مت سمجھئے کہ یہ لوگ اس کے شائق ہیں۔ یہ سب دراصل ان کے رول کا تقاضا ہوتا ہے جسے وہ پورا کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ پستول کسی اور پر چلاتے ہیں لیکن دہشت کے مارے خود اپنی جان نکلی جاتی ہے۔ بایں ہمہ میں ان لوگوں کو مقابلتاً زیادہ نیک سمجھتا ہوں۔ کم از کم ان لوگوں کے مقابلے میں جو خاندان کے سینے کا گھن بن کر جان لیتے ہیں۔ کیا آپ نے محسوس نہیں کیا ہے کہ ہمارا معاشرہ اس قسم کے خاتمے کے لئے تشکیل دیا جاتا ہے؟ آپ نے برازیل کے دریاؤں کی ان چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی بابت ضرور سُنا ہوگا جو ایک بے خبر پیراک پر ہزاروں کی تعداد میں ہلہ بول دیتی ہیں اور دم کی دم میں انسان کی جگہ ہڈیوں کا پاک صاف پنجر چھوڑ جاتی ہیں۔ کیا آپ نے محسوس نہیں کیا ہے کہ ہمارے معاشرے کی تشکیل بھی انہیں خطوط پر ہوئی ہے؟ آپ ایک صاف ستھری زندگی گذارنا چاہتے ہیں؟ ہر ایک آدمی کی طرح! آپ کہتے ہیں "ہاں" ظاہر ہے

join eBooks Telegram

کوئی "نہیں" کہہ بھی کیسے سکتا ہے۔

تو پھر یہ لیجئے "صاف ستھری" زندگی شروع ہوتی ہے۔ یہ رہی آپ کے لئے ایک نوکری، یہ رہے آپ کے لئے بیوی بچے اور باقاعدہ ترتیب دیئے ہوئے فرصت کے اوقات۔ بس اب ننھی ننھی مچھلیوں کے دانت آپ کے جسم میں گڑنے لگیں گے اور ہڈیوں تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن شاید میں ناانصافی کر رہا ہوں اسے دوسروں کی تنظیم کہنا غلط ہوگا کیونکہ یہ ہماری ہی تو ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ کون کسے پہلے ختم کرتا ہے۔

لیجئے اور جِن آ گئی۔ آپ کی خوشحالی کا جام! دیکھا آپ نے؟ گوریلے نے مجھے "ڈاکٹر" پکارنے کے لئے ہونٹ کھولے تھے۔ ان ملکوں میں ہر کوئی ڈاکٹر ہے یا پھر پروفیسر۔ یہ لوگ عزت اور احترام کرنے کے شائق ہیں۔ کچھ اخلاقاً اور کچھ انکسار اً۔ کم از کم ان لوگوں کے ہاں تحقیر کا جذبہ قومی مزاج کا جزو نہیں سمجھا جاتا۔ ویسے میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ آپ جاننا چاہتے ہیں تو عرض کرتا ہوں۔ یہاں آنے سے قبل میں وکیل تھا لیکن اب "تائب منصف" (JUDGE-PENITENT) ہوں۔ لیکن پہلے مجھے اپنا پورا تعارف کرانے دیجئے۔ آپ کا خادم ژاں بپتیست کلیمنس۔ جناب سے مل کر بےحد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً تاجر پیشہ ہوں گے! ایک طرح سے؟ بہت عمدہ جواب دیا آپ نے، بڑا دانشمندانہ جواب ہے۔ کیونکہ ہم لوگ ہر معاملے میں "ایک طرح سے" ہی ہوتے ہیں۔ اب مجھے تھوڑی دیر سراغ رساں بننے کی اجازت دیجئے: "ایک طرح سے" آپ میرے ہم عمر ہیں۔ آپ کی آنکھیں ایک ایسے چالیس سالہ آدمی کی جہاندیدہ آنکھیں ہیں جس نے "ایک طرح سے" بہت کچھ دیکھا ہے۔ "ایک طرح سے" آپ خوش لباس بھی ہیں یعنی جس طرح کہ بالعموم ہمارے ملک کے لوگ خوش لباس ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ نرم ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بورژوا ہیں، "ایک طرح سے"، لیکن ایک مہذب بورژوا۔ آپ مسکرا رہے ہیں! اس سے آپ کے مہذب ہونے کا دوہرا ثبوت ملتا ہے۔ یعنی ایک تو آپ بات کی دھار کو محسوس کر لیتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو اس کی زد سے بالاتر محسوس کر کے مسکرا دیتے ہیں۔ اب آپ کے بارے میں میرا آخری اندازہ یہ ہے کہ میری باتیں آپ کو دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور اگر اسے آپ خودستائی نہ سمجھیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ وسیع النظر ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ آپ ایک طرح . . . . چلئے چھوڑیئے کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے پیشوں میں مذہبی فرقوں سے بھی کم دلچسپی ہے۔ ایک اور سوال پوچھنے کی اجازت دیجئے لیکن اگر آپ نامناسب سمجھیں تو جواب نہ دیجئے۔ کیا آپ کے پاس مال دولت ہے؟ تھوڑی بہت؟ ٹھیک ہے۔ کیا آپ نے کبھی اپنی اس دولت میں غریبوں کو بھی حصہ دار بنایا ہے؟ نہیں؟ تو گویا آپ سدوسی[1] ہیں۔ نہیں سمجھے؟ اگر آپ مقدس کتابوں سے ناواقف ہیں تو پھر سمجھانا مشکل ہے۔

---

[1] SADDUCEE :- قدیم یہودی فرقے کا ایک فرد جو آخرت کا منکر تھا۔

join eBooks Telegram

لیکن آپ سمجھ رہے ہیں ؟ اس کا مطلب ہوا کہ آپ مقدس کتب سے آشنا ہیں ؟ یقیناً آپ دلچسپ آدمی ہیں۔
اب رہا میرے بارے میں . . . خود اندازہ لگائیے۔ قد و قامت، شانوں کی ساخت، چہرہ، جسے لوگ عام طور پر شرمیلا کہتے ہیں، ان سب سے میں شاید فٹ بال کا کھلاڑی نظر آتا ہوں لیکن کوئی میری گفتگو سے اندازہ لگانا چاہے تو مجھے کافی ذہین و فہیم آدمی سمجھے گا جس اونٹ نے میرے اوور کوٹ کا رواں فراہم کیا ہے ممکن ہے وہ خارشی رہا ہو، لیکن اس سے قطع نظر، میرے ناخن نفاست سے کٹے ہوئے ہیں۔ میں بھی کافی چالاک اور محتاط آدمی ہوں لیکن اس کے باوجود آپ کو بلا خطر اپنا رازدار بنا رہا ہوں تو اس کی واحد وجہ آپ کا چہرہ ہے۔ اختتاماً اپنے بارے میں یہ بھی کہہ دوں کہ اپنی ساری تہذیب اور شائستہ گفتگو کے باوجود زی جگ[1]، ملاحوں کے شراب خانوں میں بھی میرا کافی آنا جانا رہتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے آپ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔ چھوڑیئے، آپ اندازہ نہیں لگا سکیں گے۔ میرا پیشہ دُہرا ہے، ہر اس جانور کی طرح جسے انسان کہتے ہیں۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں شرمسار منصف (JUDGE-PENITENT) ہوں۔ میرے متعلق صرف ایک بات صاف اور واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ میری کوئی جائداد نہیں۔ ہاں، کبھی دولت مند تھا۔ نہیں، میں نے اس میں کبھی غریبوں کو حصہ دار نہیں بنایا۔ جی ہاں اس سے ثابت ہوا کہ میں بھی سدوسی تھا۔ ارے ہاں، کیا آپ بندرگاہ پر کہر کا الارم سن رہے ہیں۔ ! آج شب زوئیڈرزی پر بڑے زور کا پالا پڑے گا۔

آپ ابھی سے جا رہے ہیں ؟ اگر میں نے آپ کو دیر تک روک رکھا ہو تو مجھے معاف کیجئے۔ نہیں جناب، میں آپ کو بل ادا کرنے نہیں دوں گا۔ یہ موقع مجھے دیجئے "میکسیکو سٹی" اپنے سکون کی وجہ سے ایک طرح سے میرا گھر ہے اور خاص طور پر آپ کا میزبان بننے میں مجھے بڑی مسرت محسوس ہوئی۔ جی ہاں، میں کل شام ضرور آؤں گا۔ ویسے یہ میرا معمول ہے۔ آپ کی دعوت قبول کر کے مجھے مسرت ہوگی۔ آپ کو واپسی کا راستہ نہیں معلوم ؟ . . تو پھر . . . اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو سب سے آسان صورت یہ ہوگی کہ میں بندرگاہ تک آپ کے ساتھ چلوں۔ وہاں سے آپ یہودیوں کے محلے سے ہوتے ہوئے، ان خوبصورت سڑکوں پر نکلیں گے جن پر پھولوں سے لدی ہوئی، شور مچاتی، گھڑگھڑاتی ٹرامیں تیزی سے آتی جاتی ہیں۔ آپ کا ہوٹل ڈمراک انہیں سڑکوں میں سے ایک پر ہے۔ تو پھر چلئے — جی نہیں، پہلے آپ، میں، یہودیوں کے محلے میں رہتا ہوں۔ ہمارے ہٹلری بھائیوں کی آمد سے پہلے تک اس محلے کا یہی نام تھا۔ انہوں نے اسے ذرا کھلا اور کشادہ بنا دیا ! کیا صفایا ہوا ہے ! پچھتر ہزار یہودی قتل اور ملک بدر ہوئے۔ اس کا نام ہوا جناب ویکیوم کلیننگ (VACCUM CLEANING) ! میں تو اس مستعد

---

[1] ایک گودی۔

join eBooks Telegram

کارکردگی اور باضابطہ صبر کا قائل ہوں۔ جب آدمی کے پاس کردار نہیں ہوتا تو پھر اُسے ایک طریقۂ کار اور تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس چیز نے یہاں کمال کر دیا اور اب میں اس جگہ سکونت پذیر ہوں جو تاریخ کے ایک عظیم ترین جرم کے ارتکاب کا محلِ وقوع تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میں گورے اور اس کی بے اعتمادی کو سمجھ سکا ہوں اور اپنی طبیعت کے اس میلان کی مزاحمت کر سکتا ہوں جو ہر اس چیز کی طرف لپکتی ہے جو اُسے پسند آ جائے۔ جب بھی میں کوئی نیا چہرہ دیکھتا ہوں تو کوئی شے میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجاتی ہے: "آہستہ، سنبھل کے، آگے خطرہ ہے!"۔ اگر کسی کی جاذبیت اور دلکشی ناقابلِ مزاحمت ہو، تب بھی میں حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

آپ کو معلوم ہے میرے چھوٹے سے گاؤں میں، انتقامی کارروائیوں کے دوران، ایک جرمن افسر نے ایک بڑھیا سے بکمال نرمی دریافت کیا کہ وہ اپنے دو بیٹوں میں سے کس کا بطورِ یرغمال مارا جانا پسند کرے گی! پسند! کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں؟ وہ؟ نہیں! یہ؟ اور ایک گولی کی آواز، ایک چیخ اور معاملہ ختم۔ جانے دیجئے، اب ہم اس موضوع پر بات نہیں کرینگے لیکن موسیو، یقین جانیئے ہر طرح کی حیرت اور تعجب اس دنیا میں ممکن ہے۔ میں ایک ایسے صاف دل آدمی سے واقف ہوں جسے بے اعتمادی چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ وہ طبعاً امن پسند، صلح جو اور آزادی کا پرستار تھا۔ نوعِ انسانی اور جانور، دونوں سے اس کی محبت یکساں تھی۔ فرشتہ خصلت آدمی تھا، یورپ کی گذشتہ مذہبی جنگوں کے دوران اس نے اپنے قصبے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے گھر کی دہلیز پر اس نے یہ الفاظ کندہ کرا دیئے تھے: "آپ کہیں سے بھی آ رہے ہوں، اندر تشریف لایئے، خوش آمدید" اور اس فیاضانہ دعوت کو کس نے قبول کیا کچھ خبر ہے؟ فوج والوں نے!! اس کے گھر میں داخل ہوئے، آرام کیا اور اس کی آنتیں باہر نکال دیں — !!

معاف کیجئے، مادام! کوئی بات نہیں اور ویسے وہ ہماری بات چیت کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ پائی یہ تمام لوگ؟ اتنی رات گئے اور پھر اس بارش میں جو کئی دنوں سے مسلسل جاری ہے۔ خوش قسمتی سے جن موجود ہے اس اندھیارے میں روشنی کی واحد کرن۔ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ جن آپ کے وجود میں سنہری، تانبے کی طرح دمکتی ہوئی روشنی جلا دیتی ہے؟ رگ و پے میں جن کی حرارت لئے ہوئے شام کے جھٹ پٹے میں شہر میں گھومنا مجھے بہت پسند ہے۔ میں کئی کئی راتیں مسلسل گھومتا پھرتا ہوں اور گھومتے گھومتے یا خواب دیکھتا ہوں یا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ ہاں: بالکل آج شام کی مانند — اللہ مجھے ڈر ہے میں نے شاید آپ کا سر چکرا دیا ہے۔ اچھا، ایسی بات نہیں ہے، یہ آپ کا حسنِ اخلاق ہے۔ لیکن میں کچھ زیادہ ہی رو میں بہہ جاتا ہوں۔ منہ کھولتے ہی الفاظ اور جملے میری زبان سے بہے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ملک میری طبیعت کو اکسا دیتا ہے۔

مکانوں اور نہروں کے درمیان تنگ گندگا ہوں پر کہر میں ملفوف انسانوں کے یہ اُمڈتے ہوئے ٹھٹھ کے ٹھٹھ، یخ بستہ دھرتی اور جھاگ مارتا ہوا سمندر — میں اس ملک کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ یہ بیک وقت یہاں بھی ہے اور کہیں اور بھی۔

ہاں یہ امر واقعہ ہے کہ گیلی شاہراہوں پر ان کے قدموں کی چاپ سنکر، سنہری ہیرنگ مچھلیوں اور خزاں کے پتوں کے رنگ کے جواہرات سے بھری ہوئی دکانوں میں انھیں گھستے نکلتے دیکھ کر آپ شاید سمجھتے ہیں کہ آج شام یہ لوگ یہاں موجود ہیں؟ آپ بھی دوسروں کی طرح ہیں۔ آپ بھی ان نیک لوگوں کو نبیوں اور تاجروں کا وہ قبیلہ سمجھتے ہیں جو طلائی سکوں کے ساتھ ساتھ ایک ابدی زندگی کے امکانات بھی جمع کرتا ہے اور جن کی زندگیوں کی واحد رنگینی یا شعریت صرف یہ ہے کہ اپنی چوڑی چکلی ٹوپیوں کو اتارے بغیر علم البدن کے کچھ اسباق سیکھ لیں؟ آپ کا خیال درست نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ذرا دیکھئے ان کے سر کہاں ہیں؟ وہاں، اوپر دکانوں کے سرخ و سبز نشانات سے آتی ہوئی پیپرمنٹ کی خوشبو اور نیون روشنیوں میں گھلی ہوئی ملگجی دھندمیں۔ موسیو! ہالینڈ ایک خواب ہے۔ سونے اور دھوئیں میں لپٹا ہوا ایک خواب۔ دن میں زیادہ سے زیادہ دھوئیں دار اور راتوں میں نہایت چمکتا ہوا۔ اور شب و روز یہ خواب ان دلنشینیوں سے معمور رہتا ہے جو نہایت خوابناک انداز میں اپنی سیاہ سائیکلوں پر اونچے ہینڈل بار تھامے چلے جاتے ہیں۔ سوگوار رقاصیں پورے ملک میں، نہروں اور سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے سر تلے نبے کی رنگت والے قرمزی بادلوں میں اٹکائے ہوئے، خواب دیکھتے ہیں، دائرہ دار سائیکلوں کی سواری کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی عود و عنبر کے دھوئیں جیسی کہر میں عالم خواب میں چلتے ہوئے دعا کرتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں نہیں ہیں، اپنی دنیا سے ہزاروں میل دور، دور افتادہ جزیرے، جاوا، کی طرف نکل چکے ہیں ان منہ چڑاتے انڈونیشی دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں جن کے بتوں سے انہوں نے اپنی دکانوں کی نمائشی کھڑکیوں کو آراستہ کر رکھا ہے اور جو اس وقت دیوہیکل بندروں کی طرح دکانوں کے بام و سقف پر اترنے سے پہلے ہمارے سروں پر فضا میں بغیر کسی سمت یا جہت کے تیر رہے ہیں تاکہ ان غریب الوطن نوآبادکاروں کو یاد دلائیں کہ ہالینڈ تاجروں کا یورپ ہی نہیں بلکہ سمندر بھی ہے۔ وہ سمندر جو سپانگو کی طرف اور ان جزیروں کی طرف جاتا ہے جہاں لوگ بہجت اور مسرت میں دیوانے اور مدہوش ہو کر مرتے ہیں۔

لیکن میں بے قابو ہو رہا ہوں! میں ایک مقدمے کی وکالت کرنے لگا ہوں! معاف کیجئے گا، موسیو، عادت کی پیشے کی بات ہے اور اس کے علاوہ یہ خواہش بھی ہے کہ آپ اس شہر کو پوری طرح سمجھ سکیں، اشیا کے قلب میں اتر سکیں۔ کیونکہ ہم یہاں اشیاء کے قلب میں ہیں۔ کیا آپ نے غور کیا ہے کہ ایمسٹرڈیم

کی مدّ مدّ نہریں جہنم کے حلقوں سے مشابہہ ہیں؟ متوسط طبقے کا جہنم، جس میں یقیناً صرف بھیانک خواب آباد ہیں۔ جب کوئی باہر سے آتاہے اور تدریجاً ان دائروں سے گذرتاہے تو زندگی۔ اور لہٰذا اس کے جرائم۔ شدید اور تاریک تر ہو جاتے ہیں۔ یہاں اب ہم آخری دائرے میں ہیں۔ یہ دائرہ ۔۔۔۔ اچھا آپ جانتے ہیں کونسا دائرہ ہے؟ خدا کی قسم آپ کو سمجھنا مشکل تر ہوتا جارہاہے۔ لیکن آپ سمجھ گئے ہوں گے میں نے یہ کیوں کہا کہ ہم یہاں زندگی کے ٹھیک قلب میں ہیں۔ حالانکہ جغرافیائی اعتبار سے ہم برّاعظم کے سرے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک حساس آدمی ایسے تضادات اور عجائب کو محسوس کرلیتاہے۔ بہرحال اخبار پڑھنے اور زنا کرنے والے "جدید آدمیوں" کی پہنچ اس سے آگے ہو بھی نہیں سکتی۔ یہ لوگ یوروپ کے ۔۔۔ چاروں طرف سے آتے ہیں اور سمندر کی طرف منہ کرکے مٹیالے ساحل پر رک جاتے ہیں۔ کہر کے خطرے کا الارم سنتے ہیں۔ اور کہر میں دُور افتادہ کشتیوں کے مبہم متحرک پیکروں کو پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہروں سے مڑکر بارش میں اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ ٹھٹھرتی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ۔ میکسیکو سٹی "اگر دنیا بھر کی زبانوں میں جن کی فرمائش کرتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں میں ان کا انتظار کرتا ہوں۔

اچھا موسیو، میرے عزیز ہم وطن، کل تک کے لئے خدا حافظ۔ اب آپ آسانی سے راستہ تلاش کرلیں گے۔ میں آپ کو پل کے قریب چھوڑتا ہوں۔ میں رات کو کبھی پُل پار نہیں کرتا۔ میں نے قسم کھا رکھی ہے۔ ذرا سوچئے اگر کوئی پانی میں چھلانگ لگا دے تو؟ یا تو آپ بھی اُسے بچانے کے لئے اس کڑاکے کی سردی میں چھلانگ لگائیں گے جو خطرے کی بات ہے یا پھر اُسے موت کے منہ میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے اور کسی کو ڈوبتے دیکھ کر دریا میں چھلانگ لگانے کی خواہش کو دبانا بعض اوقات آدمی کو ایک عجیب کرب میں مبتلا کر دیتاہے۔ لہٰذا شب بخیر۔ کیا کہا؟ وہ عورتیں جو کھڑکی کے پیچھے نظر آرہی ہیں؟ وہ خواب ہیں موسیو، سستا خواب۔ جزائر الہند کا سفر۔ وہ لوگ اپنے جسم مصالحوں سے معطر کرلیتے ہیں۔ آپ جیسے ہی اندر داخل ہونگے وہ پردہ کھینچ دیں گی اور کشتی رانی شروع ہو جائے گی۔ عریاں جسموں پر دیوتاؤں کا نزول ہوگا۔ جزیرے متحرک ہونے لگیں گے اور تند ہواؤں میں گم شدہ روحوں کی، کھجور کے پتوں کے مکٹ سے رسم تاجپوشی ادا ہوگی۔ آزما کے دیکھئے۔

---

join eBooks Telegram

شرمسار منصف (JUDGE PENITENT) کیا ہوتا ہے؟ اچھا تو میں نے آپ کو اس چھوٹے سے مسئلے میں الجھا دیا۔ لیکن یقین مانئے اس سے میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا اور آپ چاہیں تو میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ بلکہ یوں کہیئے یہ وضاحت میرے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ لیکن اس سے پہلے مجھے آپ کے سامنے چند حقائق پیش کرنے چاہئیں جن سے آپ کو میری داستان سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

میں چند سال قبل پیرس میں وکیل تھا، اور در حقیقت کافی معروف وکیل تھا۔ یقیناً میں نے ابھی آپ کو اپنا اصلی نام نہیں بتایا ہے۔ شریفانہ مقدمات کی پیروی میرا خاص میدان تھا، یعنی بیواؤں اور یتیموں کے مقدمات۔ اس مخصوص نوعیت کے مقدمات سے میری دلچسپی کی وجہ شاید مجھے بھی نہیں معلوم تھی کیونکہ اس دنیا میں ایسی بیوائیں بھی ہیں جو بڑی دھوکہ باز ہیں اور ایسے یتیموں کی بھی کمی نہیں جو وحشی صفت ہوں۔ بایں ہمہ میرے لئے اتنا کافی تھا کہ مجھے اپنے موکل میں مظلومیت کی ہلکی سی جھلک ہی نظر آ جائے، اور بس، اس کے بعد میں میدان میں اتر آتا تھا، آندھی یا طوفان کی طرح۔ میری جذباتیت کا یہ عالم تھا کہ میں ہمیشہ دل جیب میں لئے پھرتا تھا۔ ان دنوں اگر آپ مجھے دیکھتے تو فوراً یقین کر لیتے کہ انصاف کی دیوی ہر رات میرے ساتھ شب باش ہوتی ہے۔ اگر آپ عدالت میں میری تقریریں سنتے تو یقیناً میرے لہجے کی قطعیت، جذبات کا موزوں استعمال اور ضبط و تحمل کے ساتھ غم و غصہ کا اظہار آپ سے خراجِ تحسین وصول کرتا۔ جسمانی اعتبار سے بھی فطرت نے میرے ساتھ کافی فیاضی سے کام لیا تھا اور بغیر کسی شعوری کوشش کے میری شخصیت سے بلند و اعلیٰ جذبات کا اظہار ہو جاتا تھا۔ مزید برآں دو پُرخلوص جذبے ہمیشہ میری ہمت بڑھاتے تھے۔ ایک تو اس بات کا اطمینان کہ عدالت میں میری جگہ حق کی طرف تھی، دوسرا، عام طور پر مجھ میں تمام ججوں کے لئے تنفر اور تحقیر کا ایک جبلی احساس پایا جاتا تھا۔ تنفر اور تحقیر کا احساس، بہر طور، شاید اتنا جبلی نہیں تھا، اور اب معلوم ہوتا ہے، کہ اس کی کچھ وجوہات بھی تھیں۔ لیکن بادی النظر میں یہ تنفر اور تحقیر ایک شدید جذبہ معلوم ہوتے تھے۔ اس بات سے، کم از کم، سردست انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمیں ججوں کی ضرورت تو ہے ہی لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کوئی کس طرح ایسے حیرت انگیز کام کی ادائیگی کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر سکتا تھا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی اور چونکہ نظروں کے سامنے تھی اس لئے مجھے اسے قبول کرنا ہی تھا بالکل اسی طرح، جس طرح میں ٹڈیوں کے وجود کو قبول کرتا ہوں۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ٹڈیوں کے دل سے مجھے کبھی ایک دھیلے

کی آمدنی نہ ہوئی اور اس کے برخلاف جن کے لئے میرے دل میں نفرت اور حقارت کا جذبہ تھا ان سے بحث و گفتگو میرا ذریعۂ معاش رہی۔

لیکن بہرکیف میں تو حق کی جانب ہی تھا اور میرے ضمیر کے اطمینان کے لئے یہ بات کافی تھی۔ قانون کا احساس، راستی پر ہونے کی طمانیت، اپنی نظروں میں معزز ہونے کی خوشی، یہ سب چیزیں، عزیز من! آدمی کو ایماندار اور حوصلہ مند رکھنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اگر آپ انسان کو ان چیزوں سے محروم کر دیں تو وہ غیظ و غضب سے کف در دہن کتے بن جائیں گے۔ کتنے ہی جرائم کا ارتکاب صرف اس لئے ہوا ہے کہ ان کے مرتکب اپنے غلطی پر ہونے کے احساس کا تحمل نہیں کر سکے۔ کسی زمانے میں میری ایک تاجر سے واقفیت تھی جس کی بیوی ایک مکمل عورت تھی۔ سب اس کی خوبیوں کے مداح تھے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی کی۔ اس کے بعد گناہ کا احساس اور یہ خیال اس کے لئے اذیت دہ بن گیا کہ اب وہ کسی سے نیک چلنی کا صداقت نامہ نہ لے سکتا تھا اور نہ خود اپنے آپ کو دے سکتا تھا۔ بیوی جتنا اپنی بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرتی اتنا ہی شوہر کی کوفت میں اضافہ ہوتا۔ بالآخر اپنے غلطی پر ہونے کا احساسِ کمتری اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ آپ سوچ سکتے ہیں اس نے کیا کیا ہو گا! جی نہیں، اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی ترک نہیں کی بلکہ اس کا قتل کر دیا— جی ہاں اور اسی سلسلے میں میری اس سے جان پہچان ہوئی تھی۔

میرا معاملہ تو خیر بہت بہتر تھا۔ میرے لئے مجرموں کی صف میں شامل ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا (بالخصوص بیوی کے قتل کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا کیونکہ میں غیر شادی شدہ تھا) اور نہ صرف یہی بلکہ میں ان کی مدافعت کے لئے بھی اس وقت تک تیار نہ ہوتا تھا جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہو جاتا کہ مجرم شریف النفس قاتل ہے، بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے لوگ شریف النفس وحشی ہوتے ہیں۔ اور پھر ان کی مدافعت میں جس انداز اور طریقے سے کرتا تھا وہ بذاتِ خود میرے لئے بہت بڑا اطمینان تھا۔ میری پیشہ ورانہ زندگی صحیح معنوں میں ہر قسم کے الزام سے بالا تھی۔ میں نے کبھی رشوت لی اور نہ کبھی کوئی مشتبہ حرکت کی۔ میں نے کبھی اخبار والوں کو چاپلوسی سے اپنی طرف لینے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی ایسے سرکاری افسر کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کی جس کی دوستی میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی اور یہ باتیں تو ایسی ہیں جن سے اجتناب شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ میری خوش قسمتی نے مجھے ایسے مواقع بھی فراہم کئے کہ دو تین بار مجھے تمغۂ اعزاز پیش کیا جائے اور میں نہایت ہوشیاری سے باوقار طور پر اسے مسترد کرنے کی مسرت حاصل کر سکوں اور یہی مسرت میرا اصل اعزاز تھی۔ آخری بات یہ کہ میں نے کبھی غریبوں سے اپنا حقِ محنت طلب نہیں کیا اور کبھی اس پر ناز بھی نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لئے بھی، موسیو، یہ مت سمجھئے میں بڑ بولا پن کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی ان باتوں کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا۔ مجھے ہمیشہ اس حرص و ہوس پر ہنسی آئی ہے جو ہمارے

join eBooks Telegram

معاشرے میں حوصلہ مندی کا مترادف بن گئے ہیں۔ میرا مطمحِ نظر ان سب چیزوں سے کافی بلند تھا۔ آپ دیکھیں گے میرے معاملے میں یہ بات کتنی صحیح نکلتی ہے۔ لیکن آپ کو اب تک میرے اطمینان کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ میں نے اپنی فطرت سے جی بھر کر آسودگی حاصل کی اور ہم سب جانتے ہیں کہ مسرت اسی میں پوشیدہ ہے۔ گو، ایک دوسرے کی باہمی تشفی کی خاطر ہم لوگ کبھی کبھی ایسی خوشیوں کو خود غرضی کا نام دینے کی ریاکاری بھی برتتے ہیں۔ میں نے اپنی طبیعت کے اس پہلو سے پورا لطف اٹھایا جو بیواؤں اور یتیموں کے حقوق کی مدافعت کا قائل تھا اور مستقل استعمال کی وجہ سے یہ پہلو میرے ساری زندگی پر غالب آ گیا۔ مثلاً اندھے لوگوں کو سڑک پار کرانا مجھے بہت عزیز تھا۔ اپنی حدِ نظر تک جہاں کہیں بھی مجھے کوئی راستہ ٹٹولتی اور جھجکتی ہوئی چھڑی نظر آتی میں پوری تیزی سے اس کی طرف لپکتا اور کبھی کبھی کسی دوسرے رحمدل آدمی کا مدد کے لئے بڑھتا ہوا ہاتھ اندھے تک پہنچنے سے ایک دو ثانیہ پیشتر ہی میں اندھے آدمی کو اپنی نگرانی میں لے کر نرمی اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے سڑک کے کنارے لے آتا اور ٹریفک کے جوکھم سے نکال کر سڑک کے دوسرے محفوظ حصے پر پہنچا دیتا اور وہاں سے ہم دونوں ایک مشترک جذبے کے ساتھ جدا ہو جاتے۔ کسی کو راستہ بتانا، ماچس دینا، کسی کے بوجھ کو ہاتھ لگانا، کسی رکی ہوئی کار کو دھکیلنے میں مدد دینا، شانتی سنیا کی رضا کار لڑکی سے اخبار یا پھیری والی بڑھیا سے پھول خریدنا ـــ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ پھول مونت پارنس کے قبرستان سے چرا کر لاتی ہے ـــ ان سب کاموں میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ مجھے خیرات دینا بھی پسند تھا۔ حالانکہ یہ کہنا زیادہ مشکل ہے۔ میرے ایک کٹر مسیحی دوست کا کہنا تھا کہ کسی فقیر کو گھر میں آتا ہوا دیکھ کر آدمی کے دل میں جو پہلا تاثر پیدا ہوتا ہے وہ ناخوشگواری کا ہے۔ میرے ساتھ معاملہ اس سے بدتر تھا۔ میں تو خوشی سے کھل اٹھتا تھا۔ لیکن اب اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔

اس کی بجائے میری خوش خلقی کی بات ہو جائے۔ میری خوش خلقی شک وشبہ سے بالا اور مسلّمہ امر تھی۔ در حقیقت خوش اخلاقی کے مظاہرے سے مجھے بے حد خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میرے لئے وہ دن یومِ سعید ہوتا تھا جس دن مجھے خوش قسمتی سے ایسے مواقع مل جاتے کہ میں بس میں یا زمین دوز ریل میں اپنی نشست کسی کھڑے ہوئے مستحق آدمی کو پیش کر دوں، یا کسی بڑھیا کے ہاتھوں سے گری ہوئی کوئی چیز اٹھاؤں اور ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس سے میں بخوبی آشنا تھا اُسے لوٹا دوں، یا کسی ایسے شخص کو، جو نسبتاً زیادہ عجلت میں ہو، اپنے لئے روکی ہوئی ٹیکسی لے جانے دوں۔

مجھے اعتراف ہے ان دنوں میری مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی تھی جب خوش قسمتی سے شہر میں ہڑتال ہو جاتی، خصوصاً جب بسیں اور ٹرامیں بند ہو جاتیں، اور میں بس اسٹاپ پر اپنی کار روک کر چند ایک بدقسمت شہریوں کو ان کی رہائش گاہوں تک پہنچا آتا۔ کسی جوڑے کو ساتھ بیٹھنے کا موقعہ دینے کے لئے تھیٹر

میں اپنی نشست چھوڑ دینا، ٹرین میں کسی دوشیزہ کے سوٹ کیس کو ریک پر رکھنے میں مدد دینا ــــ یہ خدمتیں ایسی تھیں جو میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ انجام دیتا تھا کیونکہ میں ایسے مواقع کی تلاش میں زیادہ رہتا اور ان سے حاصل کردہ مسرت سے محظوظ ہونے کے لئے زیادہ تیار ہوتا۔

ان باتوں کی بنا پر مجھے فیاض طبع سمجھا جاتا تھا اور میں تھا بھی۔ میں نے کھلے چھپے بہت کچھ داد و دہش کی۔ لیکن اپنی کوئی چیز یا روپیہ پیسہ الگ کرتے ہوئے مجھے دکھ یا تکلیف نہیں ہوتی تھی بلکہ ہمیشہ ایسی باتوں سے مجھے خوشی اور راحت حاصل ہوتی تھی۔ میری اس مدد اور حسنِ سلوک کے رائیگاں ہونے اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں کی ناشکری کا احساس ایک عجیب طرح کی افسردگی پیدا کر دیتا تھا اور یہ افسردگی بھی میرے لئے راحت اور اطمینان کا باعث تھی۔ روپے پیسے کے معاملے میں حساب کتاب کا بنیا پن میرے لئے بڑی کوفت کا باعث ہوتا تھا اور میں نے یہ فرض ہمیشہ بڑی ناخوشگواری سے ادا کیا۔ میرے لئے اپنی آزادیوں کا آپ مالک ہونا بہت ضروری تھا۔

یہ چھوٹی موٹی جھلکیاں ہیں لیکن ان سے آپ کو میری اُن لامتناہی مسرتوں کا اندازہ ہو سکے گا جن سے میں اپنی زندگی، بالخصوص اپنے پیشے میں، ہمکنار رہا۔ عدالت کے برآمدے میں کسی مؤکل کی بیوی آپ کو روکتی ہے، جس کے مقدمے کی پیروی آپ نے رحم یا انصاف کے جذبے کے تحت کی تھی ــــ میرا مطلب ہے، جس کی آپ نے فیس نہ لی ہو ــــ اور وہ عورت آپ سے دبی آواز میں کہتی ہے کہ آپ نے اس کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ وہ کسی طرح، جی ہاں، کسی بھی طرح، کبھی چکا نہیں سکتی۔" آپ کہتے ہیں: "یہ تو بڑی معمولی سی بات تھی۔ کوئی بھی میری جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔" اور پھر بُرے دنوں میں گذارے کے لئے کچھ رقم اس کے ہاتھوں میں تھما کر، امنڈتے ہوئے جذباتی کلمات کو روکتے ہوئے اور کانوں میں ان کی مناسب گونج برقرار رکھتے ہوئے جھک کر اس عورت کے ہاتھ کا بوسہ لیں اور الگ ہو کر چل پڑیں۔!! یقین مانئے برادرم، یہ وہ چیز ہے جس کا حصول عام حوصلہ مند نستم کے آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہاں آدمی اس بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نیکی اور خیر اپنا معاوضہ آپ ہو جاتے ہیں۔

بلندیوں کی بات چھڑ گئی ہے تو چلئے کچھ دیر یہاں رُکتے چلیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے اپنے مطمح نظر کے بلند ہونے کا جو ذکر کیا تھا اس سے میرا مطلب کیا تھا۔ میرا اشارہ انہیں بلند مقامات کی طرف تھا۔ میں صرف انہیں مقامات پر صحیح معنوں میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ زندگی کی جزئی باتوں میں بھی عام سطح سے اونچا رہنا میرے لئے ضروری تھا۔ میں نے ہمیشہ زمین دوز ریلوں کے مقابلے میں بس کو ترجیح دی، ٹیکسیوں کے مقابلے میں کھلی گاڑیاں پسند کیں، بند کمروں کے بجائے کھلی چھتوں کا انتخاب کیا۔ میں ایسے جہازوں میں شوقیہ

join eBooks Telegram

پائلٹ رہا ہوں جن میں ہواباز کا سر جہاز سے باہر کھلی فضا میں ہوتا ہے۔ سمندری سفر میں میرا بیشتر وقت بالائی عرشے پر ٹہلتے ہوئے گذرتا۔ پہاڑوں پر میں نے ہمیشہ تنگ وادیوں اور مرتفع علاقوں سے بھاگ کر وادیوں میں بسیرا کیا۔ کم سے کم اتنا تو ضروری ہے کہ میں میدانی علاقوں کا آدمی نہیں تھا۔ اگر قسمت مجھے مزدور پیشہ بناتی تو کوئی بات نہیں میں مشینوں پر کام کرنے کے بجائے چھتوں پر کام کرنے والا مزدور بننا پسند کرتا اور اونچائی پر پہنچ کر جو چکر سا محسوس ہوتا ہے اپنے آپ کو اس کا عادی بناتا۔ کوئلے کے گودام، جہازوں کے تہہ خانے، زیریں راستے، کچھاؤں اور کھائیوں سے میں نے ہمیشہ کراہت محسوس کی۔

ایک ایسی قدرتی بالکنی جو سمندر سے پندرہ سو فیٹ کی اونچائی پر ہو اور جہاں سے دھوپ میں نہایا ہوا سمندر نظر آتا ہو، میرے لئے ایسی جگہ تھی جہاں میں آزادی سے سانس لے سکتا تھا، خصوصاً جب تنہائی میسر ہو اور میں انسانی چیونٹیوں کے ہجوم سے اوپر ہوں۔ یہاں سے میں یہ بات واضح طور پر سمجھ سکتا تھا کہ فیصلہ کن دعوتیں، پیغمبرانہ خطبے اور آتشیں معجزے کیوں ہمیشہ ایک مخصوص بلندی پر سے دئے اور دکھائے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں کسی نے کبھی قید خانوں اور بند کوٹھریوں میں غور و فکر نہیں کیا تاوقتیکہ یہ کمرہ کسی ایسے بلند قلعے یا مینار میں نہ واقع ہو۔ جہاں سے ایک وسیع منظر آنکھوں کے سامنے رہے، ورنہ نیچے بھلے آدمی کو ایسے مقامات پر پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ میں اس آدمی کی حرکت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں جس نے رہبانیت اختیار کرنے کے بعد اس مذہبی ادارے کو صرف اس لئے خیرباد کہہ دیا کہ اس کے کمرے کی کھڑکیاں کوئی وسیع اور کشادہ منظر پیش کرنے کی بجائے عبادت گاہ کی دیوار کی طرف کھلتی تھیں۔ اس کا اطمینان رکھئے مجھے کبھی پھپھوندی نہیں لگ سکی۔ ہر دن اور ہر لحظہ میں اپنی ذات کے اندر اور باہر تنہائی میں اور دوسرے لوگوں کی معیت میں، ہمیشہ بلندیوں کی طرف لپکتا رہا اور ایسی آگ فروزاں کرتا رہا جس سے بہجت و آفریں کی صدائیں میری طرف بڑھتی رہیں۔ اس طرح میں زندگی سے اور اپنی فضیلت کے احساس سے مسرت اخذ کرتا رہا۔

بلندیوں کے اس شوق کو میرا پیشہ کمال خوبی مطمئن کرتا رہا۔ اس پیشے نے مجھے کبھی اپنے ہمسائے کے خلاف کوئی تلخی محسوس نہیں ہونے دی اور کبھی اس کا زیر بار ہوئے بغیر میں نے ہمیشہ اُسے اپنے حسنِ سلوک سے ممنون رکھا۔ میرے اس شوق نے مجھے ایک طرف اس منصف کے احتساب سے بالاکر دیا جس کا میں اپنی باری میں احتساب کرتا تھا اور دوسری طرف مجھے اس موکل سے بھی بے نیاز کر دیا جسے میرا رویہ ممنون و شکرگزار ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ عزیز من! ذرا اس پر غور کیجئے! میری زندگی ہر بادافراش سے بری تھی! میں ہر عدالتی فیصلے سے بے تعلق تھا۔ میرا وجود کمرۂ عدالت کے فرش پر نہیں بلکہ وہ کہیں ان دیوتاؤں کی معیت میں تھا، جنہیں عمل کی صورت گری اور معنی آفرینی کے لئے وقتاً فوقتاً نیچے، زمین کی طرف، کھینچ لایا جاتا ہے۔ آخر، آج بھی، بلندیوں پر متمکن ہونا ہی تو وہ واحد ذریعہ ہے جس سے آدمی پر لوگوں کی نظریں اٹھتی ہیں۔ تحسین و توصیف کا حل ہوتا ہے اور لوگوں کی اکثریت اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔

join eBooks Telegram

اس کے علاوہ، میرے چند ایک اچھے مجرموں نے اسی احساس کے زیرِ اثر قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ اور اس کے بعد افسوسناک حالات میں، اخبارات میں اپنی داستان پڑھنا ان لوگوں کے لئے یقیناً تسلی بخش تھا، گو یہ تسلی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی زیادہ دنوں تک گمنامی کا بار برداشت نہ کر سکے اور ان کی بے صبری انہیں افسوسناک انتہاؤں تک کھینچ لے گئی۔ بدنامی کی شہرت ہی اگر مقصود ہو تو پھر اپنے دربان یا خدمتگار کو قتل کر دینا بھی اس مقصد کے حصول کے لئے کافی ہے لیکن بدقسمتی سے ایسی "شہرت" عموماً وقتی ہوتی ہے ایسے نوکروں کی کوئی کمی نہیں جو اتفاقاً قتل کئے جانے کے مستحق ہیں اور قتل کئے بھی جاتے ہیں۔ اخباری سرخیوں میں جرائم کا ذکر مستقلاً ہوتا ہے لیکن ان میں مجرم کو صرف ایک دن کی جگہ ملتی ہے۔ اور پھر دوسرے ہی دن کوئی اور اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسی عارضی کامیابیاں بہت زیادہ مہنگی پڑتی ہیں۔ یہ لوگ جہاں عارضی شہرت حاصل کر کے پھنس جاتے تھے وہاں میں ان بدنصیبوں کے مقدمات کی پیروی کر کے صحیح معنوں میں مشہور و معروف ہو رہا تھا اور علاوہ ازیں مجھے اس کی کوئی قیمت بھی نہیں دینی پڑتی تھی۔ میرا قرض بڑی حد تک یہ لوگ ادا کر رہے تھے۔ ان کے مقدمات پر میری جو صلاحیت، جذبہ اور غم و غصہ صرف ہوتا تھا اس سے میں ان کے اس احسان کی پوری تلافی کر دیتا تھا۔ جج صاحبان سزا دیتے، ملزم اپنے جرائم کا کفارہ ادا کرتا اور میں ہر فرض سے آزاد، ہر فیصلے اور سزا سے محفوظ، جنتِ عدن کی روشنی میں مگن رہتا۔

اور عزیز من کیا وہ واقعی جنتِ عدن نہیں تھی! میرے اور زندگی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا اور یہ جنت میری تھی۔ مجھے کبھی یہ سیکھنا نہیں پڑا کہ زندگی کیسے گذاری جائے۔ اس سلسلے کی ہر بات سے میں پیدائش سے واقف تھا۔ کچھ لوگوں کو یہ مصیبت درپیش ہوتی ہے کہ وہ خود کی دوسروں سے حفاظت کریں یا پھر ان سے سمجھوتہ کر لیں۔ میرے معاملے میں یہ سمجھوتہ پہلے سے قائم شدہ تھا۔ جہاں مناسب سمجھتا وہاں آشنائی برت لیتا، جہاں ضروری سمجھتا وہاں خاموشی اختیار کر لیتا۔ بے تکلفانہ طور پر گھل مل جانا بھی میرے لئے اتنا ہی آسان تھا جتنا پُروقار اور پُرتمکنت ہو جانا۔ لہٰذا میرے لئے میل اور ہم آہنگی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ اسی لئے سوسائٹی میں میری ہردلعزیزی بے پایاں اور میری فتوحات بے شمار تھیں۔ شکل و صورت کے اعتبار سے میں قابلِ قبول تھا۔ میں اپنے آپ کو بیک وقت تھکے بغیر گھنٹوں ناچنے والا بھی ظاہر کرتا اور چھپا ہوا عالم بھی۔ میں بیک وقت عورت اور انصاف دونوں سے محبت کر سکتا تھا! اور ظاہر ہے یہ آسان بات نہیں۔ کھیلوں اور فنونِ لطیفہ سے بھی میری دلچسپی تھی، لیکن نہیں، اب میں بس کرتا ہوں ورنہ مجھے خدشہ ہے آپ سمجھیں گے میں اپنے منہ میاں مٹھو بن رہا ہوں۔ مگر میری آپ سے بس اتنی استدعا ہے کہ ایک لمحے کے لئے ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے جو اپنی قوتوں کے عروج پر ہے، صحتمند ہے، بڑی فیاضی سے مختلف صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے، جسمانی ورزش کے ساتھ ذہن کی ورزش میں بھی طاق ہے،

join eBooks Telegram

نہ دولت مند ہے اور نہ غریب، اطمینان کی نیند سوتا ہے اور بنیادی طور پر اپنے آپ سے خوش ہے لیکن یہ خوشی سوائے ایک خوشگوار ملنساری کے اور کوئی ذریعۂ اظہار نہیں تلاش کرتی۔ اگر آپ یہ تصور کرسکیں تو پھر موسیو، آپ کو یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ میں ایک کامیاب زندگی کے بارے میں کسی شرم و جھجک کے بغیر کیسے بات کرسکتا ہوں۔

جی ہاں! بہت کم لوگ فطرت سے اتنے قریب ہوتے ہیں جتنا میں تھا۔ زندگی سے میری ہم آہنگی ہر طرح سے مکمل تھی۔ میں نے زندگی کو، اس کی ستم ظریفیوں کو مسترد کئے بغیر، اس کی ساری بلندیوں اور پستیوں کے ساتھ، قبول کیا تھا۔ خصوصاً زندگی کا مادّی اور جسمانی تصوّر، جو کئی ایک محبّت زدہ لوگوں اور خلوت گزینوں کے لئے پریشان کن اور حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے، اُسے میں نے اس کا ظاہر نہ بغیر اس طرح قبول کرلیا تھا کہ اس کی ساری مسرتیں برابر میرے حصّے میں آتی رہیں۔ جسم میری افتاد میں شامل تھا اور یہیں سے مجھے وہ ہم آہنگی اور بے تکان قدرت ملی تھی جسے لوگ محسوس کرتے تھے اور بعض اوقات مجھ سے کہتے تھے کہ یہ چیز زندگی میں اُن کے لئے کارآمد ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے لوگ میری صحبت کے متلاشی رہتے تھے۔ اکثر نئے ملنے والے مجھ سے مل کر یوں محسوس کرتے جیسے وہ پہلے بھی مجھ سے مل چکے ہوں۔ زندگی، اس کی مخلوق اور اس کی نعمتیں میرے آگے بڑھ کر پیش ہوتیں۔ اور میں اس خراج کو ایک مشفقانہ فخر کے ساتھ قبول کرلیتا۔ سچ پوچھئے تو دراصل اس طرح مکمل طور پر انسانِ محض ہونے کی وجہ سے ہی میں اپنے آپ کو فوق الانسان سمجھنے لگا تھا۔

میری پیدائش ایک شریف لیکن چھوٹے موٹے گھرانے میں ہوئی تھی (میرا باپ ایک افسر تھا) لیکن اس کے باوجود میں آپ کو پورے انکسار سے بتاتا ہوں کہ بعض صبحیں ایسی بھی ہوتی تھیں جب میں اپنے آپ کو ایک بادشاہ کا بیٹا محسوس کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے اوروں کے مقابلے میں اپنی ذہانت کی برتری کا یقین تھا۔ اور پھر ایسا یقین کسی اہمیت کا حامل بھی نہیں ہوتا کیونکہ کئی ایک احمق بھی اپنے بارے میں یہی یقین رکھتے ہیں۔ نہیں، میرے احساسِ برتری کی وجہ الگ تھی۔ اس کی وجہ، گو مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے، وہ نعمتیں تھیں جن سے میں فیاضانہ طور پر نوازا گیا تھا اور جو مجھے مختص اور ممتاز کرتی تھیں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ایک طویل المیعاد اور مسلسل کامیابی نے مجھے سارے لوگوں کے مقابلے میں، شخصی طور پر، منتخب کیا تھا۔ یہ احساس، بہرحال، میرے انکسار پر مبنی تھا۔ میں نے اپنی کامیابی کو اپنی صلاحیتوں پر محمول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا اور میں کبھی یہ تسلیم نہ کرسکا کہ کسی ایک شخص میں اتنی گوناگوں اور درجۂ کمال کی خوبیاں محض اتفاق سے مجتمع ہوگئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنی پُرمسرت زندگی میں کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ مسرّت کسی بالاتر قوت کی طرف سے عطا کی گئی ہے۔ اس احساس کا انوکھا پن اور بھی واضح ہوجائے گا اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میرا مذہب پر عقیدہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ احساس

انوکھا تھا یا معمولی، اس سے قطع نظر، اتنا ضرور تھا کہ اس نے مجھے عام روز مرّہ کی زندگی کی سطح سے کچھ دیر کے لئے اوپر اُٹھا دیا اور میں صحیح معنوں میں کئی برس تک فضا میں پرواز کرتا رہا۔ اور سچّی بات تو یہ ہے کہ آج بھی میرا دل اس اڑان کے لئے ترستا ہے۔ یہ پرواز اس شام تک جاری رہی۔۔۔۔ لیکن نہیں، وہ الگ معاملہ ہے اور اسے بھلا دینا چاہیئے۔ میں شاید مبالغہ برت رہا ہوں۔ بے شک میں ہر چیز سے ہم آہنگ تھا لیکن مطمئن کسی چیز سے بھی نہ تھا۔ ہر مسرّت مجھے کسی دوسری مسرت کی تلاش میں لے نکلتی تھی۔ میں ایک جشن سے دوسرے جشن کی طرف لپکتا رہا۔ بعض اوقات میں رات رات گئے تک ناچتا اور لوگوں اور زندگی کا دیوانہ بن جاتا تھا۔ بعض اوقات ان راتوں کے آخری لمحات میں جب ناچ، ہلکا سا سرور، میرا جوش و خروش اور اوروں کے لوگوں کی بے لگام ہوتی ہوئی سرمستی مجھے ایک تھکن اور ہوش و حواس پر طاری ہوتی ہوئی بے خودی کا شکار بنا دیتے تو ایسے لمحات میں مجھے یوں محسوس ہوتا ـــ اضمحلال کے آخری سرے پر اور محض ایک ثانیہ کے لئے ـــ کہ میں بالآخر کائنات اور اس کی مخلوق کے سربستہ راز کو جان چکا ہوں۔ لیکن میرا اضمحلال دوسری صبح زائل ہو جاتا اور اس کے ساتھ یہ راز بھی۔ اور میں از سرِ نو زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتا۔ میں اسی طرح دوڑتا رہا۔ نعمتوں کا ڈھیر میرے آگے لگا ہوا تھا اور میں کبھی ان سے سیر نہ ہوا۔ اور یہ جانے بغیر کہ مجھے کہاں رکنا ہے، میں آگے، اور آگے، بڑھتا گیا حتیٰ کہ ایک دن ـــ ایک شام ـــ دفعتاً موسیقی رک گئی اور روشنیاں بجھ گئیں اور وہ ہنستی ہوئی محفل جس میں میں اتنا خوش و خرم تھا۔۔۔۔۔ مگر ـــ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے دوست اسقف کو اس اعتراف کے موقعہ پر بلا لوں۔ سر کی جنبش سے اس کا شکریہ ادا کیجئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے ساتھ پیتے رہیئے۔ مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔

میری یہ درخواست آپ کو حیران کر رہی ہے؟ کیا آپ کو کبھی، اچانک، ہمدردی، مدد یا دوستی کی ضرورت نہیں پیش آئی؟ ہاں، یقیناً۔ میں نے ہمدردی سے مطمئن ہو جانا سیکھ لیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ہمدردی بڑی آسانی سے مل جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ آدمی پر کوئی پابندی نہیں عائد کرتی۔ "میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری ہمدردانہ توجہ کا یقین رکھیں"۔ یہ جملہ، داخلی گفتگو میں عموماً اس جملے کے فوراً بعد آتا ہے: "اب ہمیں دوسرے امور کی جانب توجہ مبذول کرنی چاہیئے"۔ ایسا جذبہ، موسیو، بوڑھے چیرمین کا جذبہ ہے۔ سانحات کے بعد اس کا استعمال بہت سستا پڑتا ہے۔ دوستی نسبتاً سادہ سی چیز ہے۔ اس کا حصول مشکل اور دیر طلب ضرور ہے لیکن ایک بار حاصل ہو جائے تو پھر اس سے چھٹکارا نہیں۔ انسان کو بس نباہنا پڑتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ آپ کے دوست ہر شام محض یہ جاننے کے لئے آپ کو فون کریں گے کہ کہیں یہ وہی شام تو نہیں جس میں آپ خودکشی کا ارادہ کر رہے ہیں! یا، آج آپ کو رفاقت کی ضرورت تو نہیں ہے؟ آپ کہیں باہر جانے کے موڈ میں تو نہیں؟ گھبرایئے نہیں۔ وہ ضرور فون کریں گے مگر اس شب جب آپ تنہا نہ ہوں گے، اور جب زندگی خوبصورت ہوگی۔ جہاں تک خودکشی کا تعلق ہے، یقین رکھیئے آپ کے

دوست آپ کو اس ارادہ کی تکمیل میں مدد دیں گے کیونکہ ان کی دانست میں آپ اسی انجام کے مستحق ہوں گے۔ بزرگو! خدا ہمیں اپنے دوستوں کے ہاتھوں کسی اونچے طاق پر متمکن ہونے سے بچائے۔ وہ لوگ جن کا فرض ہم سے محبت کرنا ہے ــ میرا اشارہ عزیز و اقارب کی طرف ہے (عزیز و اقارب! کیا الفاظ ہیں!!) ــ ان کا معاملہ اور ہے۔ وہ ہمیشہ صحیح لفظ کا انتخاب کریں گے اور وہ لفظ ٹھیک تیر بہدف ثابت ہوگا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یوں گھنٹی بجائیں گے جیسے بندوق چھوڑ رہے ہوں اور انھیں معلوم ہوتا ہے کہ نشانہ کیسے لینا چاہیئے۔!!

کیا؟ کونسی شام! میں اسی طرف آرہا ہوں۔ میرے ساتھ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ ایک طرح سے میں دوستوں اور رشتہ داروں کے متعلق بات کرتے ہوئے اپنے موضوع پر ہی بات کر رہا ہوں۔ میں نے ایک آدمی کے متعلق سنا تھا، جس کا دوست جیل بھیج دیا گیا تھا اور جو ہر رات محض اس لئے پلنگ کے بجائے فرش پر سوتا تھا کہ اس کا دوست جس آرام سے محروم تھا اس سے اسے بھی اجتناب برتنا چاہیئے۔ بتلایئے تو ذرا موسیو! ہمارے لئے کون فرش پر سونے کو تیار ہوگا؟ کیا میں خود اس کا اہل ہوں؟ میں اس کا اہل بننا چاہتا ہوں اور ایک دن بنوں گا۔ ہاں، ایک دن ہم سب اس کام کے اہل ہو جائیں گے اور وہی یومِ نجات ہوگا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں، کیونکہ دوستی غائب دماغ یا کم از کم لاحاصل ہوتی ہے۔ دوستی اس بات کی نااہل ہے کہ جس بات کو وہ چاہے اسے حاصل بھی کر سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوستی کو کسی شے کی طلب اتنی نہ ہوتی ہو جتنی اس شے کو حاصل کرنے کے لئے ہونی چاہیئے؟ ممکن ہے ہمیں زندگی سے اتنی محبت نہ ہو جتنی کہ ہونی چاہیئے؟ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ صرف موت ہمارے احساسات کو بیدار کرتی ہے؟ ہم ان دوستوں سے کتنا پیار کرتے ہیں جو ابھی ابھی ہم سے جدا ہوئے ہوں؟ ہم اپنے ان اساتذہ کی کتنی مدح سرائی کرتے ہیں جن کی زبانیں گنگ ہو چکی ہیں اور جن کے دہن اب خاک سے پُر ہیں۔! سب کچھ ہو چکنے کے بعد ہمارا جذبۂ تحسین اُبھرتا ہے وہ تحسین جس کے لئے وہ لوگ شاید عمر بھر متوقع اور ترستے رہے۔ کیا آپ جانتے ہیں ہم مُردوں کے معاملے میں کیوں زیادہ انصاف پسند اور فیاض واقع ہوئے ہیں؟ وجہ بالکل سادہ ہے۔ مُردوں کے معاملے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی۔ وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور ہم بہ اطمینانِ خاطر، جب جی چاہے، کاک ٹیل پارٹی اور ایک حسین، کم سن داشتہ کے درمیان، فرصت کے اوقات میں، انہیں اسناد تقسیم کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ ہمیں کسی چیز کے لئے مجبور کر سکتے تو انھیں یاد رکھنے پر مجبور کرتے اور یہ ممکن نہ ہوتا کیونکہ ہمارا حافظہ کمزور ہے۔ نہیں، ہم اپنے دوستوں میں صرف ان سے محبت کرتے ہیں جو تازہ تازہ داغ دے گئے ہوں۔ ہم ان کی دردناک موت سے، اپنے جذبات سے، اور چونکہ یہ جذبات ہمارے ہوتے ہیں، اس لئے خود اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔!!

مثال کے طور پر میرا ایک دوست تھا جس سے میں بالعموم کترایا کرتا تھا۔ وہ مجھے بور کرتا تھا۔ علاوہ بریں وہ کچھ ناصح مشفق قسم کا آدمی تھا۔ لیکن جب وہ اپنی آخری سانس لے رہا تھا، میں اس کے بسترِ مرگ کے قریب تھا۔ گھبرایئے

join eBooks Telegram

تھیں، میں نے کوئی دن ناغہ نہیں کیا۔ مرتے وقت وہ میرے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور مجھ سے مطمئن تھا۔ ایک عورت جو بے کار میرے تعاقب میں اپنا وقت برباد کر رہی تھی، بالآخر اتنی عقلمند نکلی کہ جوان سال مر گئی، اس کے مرتے ہی میرے دل میں اس کے لئے کتنی جگہ نکل آئی! خصوصاً جبکہ جواں مرگی کے ساتھ خودکشی بھی ہو!! خداوند، کتنا خوش آمیز اضطراب تھا! اُدھر فون کی گھنٹی بجی اور ادھر دل رقت سے بھر آیا۔ ارادی طور پر مختصر لیکن معنی خیز جملے، جن میں ضبط کیا ہوا کرب اور، جی ہاں، کسی حد تک، اپنے آپ کو قصوروار گردانتے کی کیفیت بھی شامل ہوتی، زبان سے نکلنے لگتے۔

عزیز من! انسان ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ سے محبت کے بغیر کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ آپ جس عمارت میں رہتے ہیں وہاں اگر کوئی مر جائے تو اپنے پڑوسیوں کو غور سے دیکھئے۔ مثال کے طور پر، معمول کے مطابق سب محو خواب تھے کہ اچانک چوکیدار چل بسا۔ فوراً بیدار ہوئے۔ اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بستروں سے نکالا۔ تفصیلات معلوم کیں۔ دکھ اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ ایک تازہ تازہ مرا ہوا آدمی اور بالآخر تماشہ شروع ہوا۔ ان سب کو حزنیہ کی ضرورت ہوتی ہے یہ ان کی چھوٹی موٹی "مادرائیت" ہے یا چاہیں تو اسے عرض اشتہا انگیز کہہ لیجئے۔ میں نے مثال کے طور پر چوکیدار کا ذکر یونہی اتفاقاً نہیں کر دیا ہے۔ میرا اپنا ایک چوکیدار تھا۔ نہایت بدتمیز، کینہ توز، بغض و عناد کا مجسمہ اور بدصورتی کا عفریت۔ جس کی شکل دیکھ کر ایک فرانسسکن راہب بھی اپنا منہ موڑ لے۔ میں نے اس سے بات کرنا تک چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن وہ مر گیا اور میں اس کے جنازے میں شرکت کے لئے گیا۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کیوں؟

بہرحال آخری رسومات سے پہلے کے دو دن بہت دلچسپ تھے۔ چوکیدار کی بیوی بیمار تھی اور ایک نفری کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ پاس ہی مرنے والے کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ کرایہ داروں کو خطوط کمروں تک پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر ایک کو اپنے خطوط خود ہی جاکر وصول کرنے پڑ رہے تھے آپ کو کواڑ کھولنا پڑتا۔ آپ "صبح بخیر مادام" کہتے۔ وہ تابوت کی طرف اشارہ کرکے مرحوم کی خوبیاں بیان کرتی جو آپ رک کر سنتے اور اپنے خطوط لے کر واپس آجاتے۔ اس میں کوئی خاص دلچسپی کی بات نہیں۔ لیکن اس کے باوجود عمارت کے تمام رہنے والے اسی کمرے سے ہوکر گذرتے جو کاربولک کی بُو سے پھٹا پڑتا تھا۔ کرایہ دار نوکروں کو نہ بھیجتے بلکہ خود آتے تاکہ اس غیر متوقع تماشے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ نوکر بھی آیا کرتے لیکن چوری چھپے۔ تدفین کے دن پتہ چلا کہ تابوت کمرے کے کواڑ سے بڑا تھا۔ "ہائے اللہ" بیوی نے بستر ہی سے استعجاب بھرے لہجے میں چیخ ماری، جس میں خوشی اور غم دونوں شامل تھے "وہ کتنا بڑا تھا!" "فکر نہ کریں مادام" تابوت ساز نے جواب دیا "ہم تابوت کو ترچھا کھڑا کرکے نکالیں گے۔" چنانچہ اُسے کھڑا کرکے نکالا گیا اور پھر لٹا دیا گیا۔ اور

میں واحد شخص تھا جو قبرستان تک گیا (میرے ساتھ گیبرے کا ایک سابق دربان بھی تھا جس نے مجھے بتایا کہ وہ مرحوم کے ساتھ ہر شام "پرزن کے خم لنڈھاتا تھا) اور اس کے تابوت پر پھول چڑھائے۔ تابوت کی بیش قیمتی میرے لئے ششدر کن تھی۔ پھر میں نے چوکیدار کی بیوی کے ہاں شکریہ وصول کرنے کے لئے حاضری دی جو اس نے ایک عظیم حزنیہ اداکارہ کی سی مہارت اور فنکاری سے ادا کیا۔ کیا آپ اس پورے ناٹک کا کوئی سبب بتا سکتے ہیں؟ سوائے "اشتہا کشائی" کے اور کچھ نہیں!!

اسی طرح میں نے بار ایسوسی ایشن کے ایک پرانے رفیق کو دفنایا۔ یہ بے چارہ ایک کلرک تھا جسے کوئی درخورِ اعتنا نہ سمجھتا تھا۔ لیکن میں ہمیشہ اس سے ہاتھ ملاتا تھا۔ ویسے میں جہاں کام کرتا تھا وہاں ہر ایک سے ہاتھ ملاتا تھا بلکہ بعض سے تو دو دو بار ملاتا تھا۔ اس میں اپنی گرہ سے تو کچھ دینا نہ پڑتا تھا ہاں یہ فائدہ ضرور تھا کہ اس سے مجھے وہ ہر دلعزیزی حاصل ہوتی تھی جو میری طمانیت کے لئے ضروری تھی۔ بار کے صدر نے ہمارے کلرک کے جنازے میں شرکت کی ضرورت نہیں سمجھی لیکن میں نے شرکت کی اور وہ بھی ایسے موقع پر جب میں سفر پہ تیار ہو کر نکلنے والا تھا۔ میں نے سفر ملتوی کر کے شرکت کی اور یہ بات کافی واضح بھی کر دی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری موجودگی کا نوٹس لیا جائے گا۔ اور میرے بارے میں اچھا تاثر قائم ہوگا۔ لہٰذا ژالہ باری بھی مجھے جنازے میں شرکت سے باز نہ رکھ سکی۔

کیا! گھبرایئے نہیں میں اسی موضوع کی طرف آ رہا ہوں بلکہ میں اس سے ہٹا ہی نہیں ہوں۔ پہلے مجھے اپنے مرحوم چوکیدار کی بیوی کے بارے میں بتانے دیجئے۔ جس نے پہلے اپنے شوہر کے لئے صلیب، تابوت کے لئے شاہ بلوط کی لکڑی اور چاندی کے ہتّے تیار کرانے کے مصارف برداشت کئے تاکہ اپنے جذبات کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھا سکے اور پھر شوہر کی موت کے ایک ماہ کے اندر اندر ایک سُریلی آواز والے بانکے چھبیلے کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا۔ وہ اسے بڑی طرح زدوکوب کرتا۔ خوفناک چیخیں سنائی دیتیں اور اس کے فوراً بعد وہ کھڑکی کھول کر اپنا محبوب گیت اونچے سروں میں گاتا "عورتو، تم کتنی حسین ہو!" "تاہم" ہمسائے کہتے۔ "تاہم کیا؟" میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ اچھی بات! مان لیا کہ بظاہر چیزیں اس مغنّی اور چوکیدار کی بیوی کے بھی خلاف جاتی تھیں۔ لیکن یہ تو کسی طرح ثابت نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے تھے اور نہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اور پھر جب ایک دن وہ بانکا گانے اور مار پیٹ کرنے سے تھک کر کہیں بھاگ گیا تو وفادار بیوی نے از سرِ نو مرحوم شوہر کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دیں!! آخر میں کئی ایسے لوگوں کو بھی تو جانتا ہوں جن کا ظاہر ان کی چغلی نہیں کھاتا لیکن وہ بباطن چوکیدار کی بیوی سے زیادہ مخلص یا وفادار نہیں ہوتے۔ میں ایک شخص سے واقف تھا جس نے اپنی عمر کے بیس سال ایک بے فکری عورت کی نذر کر دیئے۔ اس پر اپنی ہر چیز، دوست، کام، عزت سب کچھ قربان کر ڈالا اور ایک شام اس پر انکشاف ہوا کہ اس نے کبھی اس عورت سے محبت نہیں کی تھی۔!!

join eBooks Telegram

اس کا پرابلم صرف یہ تھا کہ وہ اکتاہٹ کا شکار تھا جیسا کہ بیشتر لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنی پوری زندگی کو پیچیدگیوں اور ڈرامہ کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا۔ کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے ــ بیشتر انسانی ابتلاؤں کے پیچھے یہی چیز کارفرما ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ چاہے وہ محبت سے عاری غلامی ہو یا جنگ، یا موت، کچھ بھی ہو۔ تو لگایئے نعرہ موسیو، جنازے زندہ باد!

لیکن کم از کم مجھے کبھی یہ عذر لاحق نہیں ہوا۔ مجھے کبھی اکتاہٹ نہیں ہوئی کیونکہ میں تو چڑھتی ہوئی موج پر سوار تھا۔ میں جس شام کا ذکر کر رہا ہوں اس شام تو مجھ میں اکتاہٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور پھر بھی۔۔۔ اچھا موسیو اب سنئے۔ وہ موسمِ خزاں کی ایک خوشگوار شام تھی۔ شہر میں ابھی گرمی باقی تھی لیکن دریائے سین پر دھند پڑ چکی تھی۔ آسمان جو ابھی مغرب میں روشن تھا آہستہ آہستہ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ راستے کی روشنیاں دھیمی ضو میں جھلملا رہی تھیں۔ میں 'بائیں کنارے' کے پشتوں پر ٹہلتے ہوئے 'فنون کا پل' کی طرف جا رہا تھا۔ پرانی کتابوں کی دوکانوں کے درمیان ندی چمک رہی تھی۔ پشتوں پر بہت کم لوگ تھے۔ پیرس کے لوگ ڈنر میں مصروف بھی ہو چکے تھے۔ میرے پیر زرد، گرد آلود خزاں کے پتوں پر پڑ رہے تھے جن سے ابھی موسمِ گرما کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ آسمان بتدریج ستاروں سے پُر ہوتا جا رہا تھا جو ایک لیمپ پوسٹ سے گذر کر دوسرے لیمپ پوسٹ کی طرف بڑھتے وقت لمحہ بھر کے لئے دکھائی دیتے تھے۔ میں خوش اور مطمئن تھا۔ آج کا دن بھی اچھا کٹا تھا۔ ایک نابینا کی مدد، حسبِ توقع ایک مقدمے میں سزا کی تخفیف مؤکل سے پُرتپاک مصافحہ، کچھ سخاوت کے کام اور دوپہر میں گنی ایک دوست احباب کی محفل میں حکمران طبقے کی سنگدلی اور ہمارے لیڈروں کی ریاکاری پر ایک دھواں دھار برجستہ تقریر!

میں 'فنون کا پل' پر پہنچ چکا تھا جو اس وقت ویران پڑا تھا۔ خیال تھا کہ ندی کا نظارہ کروں جو رات بڑھ جانے کی وجہ سے بمشکل دکھائی دے رہی تھی۔ ورگالاں کے مجسمہ کی طرف رُخ کر کے نظر اٹھائی تو پورا جزیرہ میرے تسلط میں تھا۔ قوت اور اقتدار کا ایک عجیب اور بھرپور احساس مجھے اپنے اندر پھیلتا، بڑھتا ہوا محسوس ہوا ــ میں نہیں جانتا کس طرح اس کا اظہار کروں ــ ایک تکمیل کا احساس تھا جو میرے دل کو بشاش بنا رہا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر سگریٹ ــ طمانیت کا سگریٹ ــ جلانے والا تھا کہ عین اسی لمحے میرے عقب سے ایک قہقہہ پھوٹ پڑا۔ متحیر ہو کر میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ میں جنگلے کی طرف بڑھا۔ نیچے کوئی کشتی یا بجرا نہیں تھا۔ میں جزیرے کی جانب واپس پلٹا تو دوبارہ پشت پر قہقہہ کی آواز سنائی دی۔ لیکن اس بار آواز ذرا فاصلے سے آ رہی تھی جیسے نیچے پانی میں اتری جا رہی ہو۔ میں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی لیکن میں اپنے پیچھے اسے اب بھی صاف سن سکتا تھا۔ یہ قطعی تھا آواز پانی کے سوا اور کہیں سے نہیں آ رہی تھی۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ براہ کرم مجھے غلط مت سمجھئے۔ قہقہے میں کوئی پُراسراریت نہ تھی۔ وہ ایک بے ضرر، مخلصانہ بلکہ بڑی

حدتک دوستانہ قہقہہ تھا جس کی آواز ہر چیز کو اس کی ٹھیک مناسب جگہ دیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھاگئی۔ میں پشتوں پر لوٹ آیا اور شارع دافین تک گیا۔ بلاضرورت سگریٹ خریدے۔ میں چکرا رہا تھا اور جلد جلد سانس لے رہا تھا۔ اس شام میں نے ایک دوست کو فون کیا جو گھر پر نہ تھا۔ میں باہر نکلنے سے ہچکچا رہا تھا کہ اچانک میرے کمرے کی کھڑکیوں کے نیچے سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکیاں کھول دیں نیچے راستے پر چند نوجوان پُر شور آواز میں شب بخیر کہہ رہے تھے۔ کھڑکیاں بند کرتے ہوئے میں نے کندھے جھٹکائے۔ مجھے ایک مقدمے کی تیاری کرنی تھی۔ میں پانی پینے کے لئے غسل خانے کے اندر گیا۔ آئینہ میں میرا عکس مسکرا رہا تھا لیکن مجھے ایسے لگا جیسے میری مسکراہٹ دو رخی تھی۔۔۔۔

کیا فرمایا! معاف کیجئے، میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ممکن ہوا تو آپ سے پھر کل ملاقات ہو گی۔ ہاں کل، بالکل ٹھیک ہے۔ نہیں، نہیں اب میں رک نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بھورا ریچھ جسے آپ وہاں دیکھ رہے ہیں، مجھے صلاح مشورے کے لئے بلا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اچھا آدمی ہے، لیکن پولیس بڑی کمینگی سے اور محض اپنی کجروی کی بناء پر اس کے درپئے آزار ہے۔ آپ کہتے ہیں وہ قاتل نظر آتا ہے؟ اطمینان رکھیئے اس کے افعال بھی اس کی شکل سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ چوری چکاری بھی کر لیتا ہے۔ اور آپ کو یہ جان کر تعجب ہو گا کہ یہ غاروں کا باشندہ بھی اس "فنکارانہ تجارت" میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔ ہالینڈ میں ہر شخص مصوری اور گل لالہ کا ماہر خصوصی ہے۔ یہ صاحب اپنی منکسر نگاہی کے باوجود ایک تصویر کی مشہور چوری کے مصنف ہیں۔ کونسی تصویر؟ میں کسی اور دن آپ کو بتاؤں گا۔ میری معلومات پر حیران مت ہوئیے۔ گو میں ایک شرمسار منصف (JUDGE-PENITENT) ہوں لیکن یہاں میرا ایک فیلی دھندہ بھی چلتا ہے۔ میں ان سب نیک انسانوں کا قانونی مشیر ہوں۔ میں نے ملک کے قانون کا مطالعہ کیا اور اس علاقے میں، جہاں ڈگریوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مؤکلوں کا ایک حلقہ بنا لیا ہے۔ یہ آسان کام نہ تھا لیکن میں جلد لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے! اچھی، بھرپور ہنسی ہنس سکتا ہوں، گرمجوشی سے مصافحہ کر لیتا ہوں اور یہی تو ترپ کے پتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ابتدا ہی چند ایک مشکل مقدمات کا تصفیہ کرایا۔ پہلے تو ذاتی اغراض کے تحت اور بعد میں اصول کی بناء پر۔ عزیز من! اگر تمام بھڑوں اور چوروں کو ہمیشہ سزا ملتی رہے تو تمام نیک لوگ سوچنے لگیں گے کہ وہ خود دوامًا معصوم ہیں اور میری رائے میں اس چیز کو — اچھا بھئی، اچھا میں آرہا ہوں — جی ہاں اس چیز کو ہر قیمت پر روکنا چاہیئے۔ ورنہ ہر چیز مذاق بن کر رہ جائے گی۔

میرے عزیز ہم وطن! میں واقعی اس تجسس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میری کہانی میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ چونکہ آپ دلچسپی لے رہے ہیں اس لئے بتا دوں کہ کچھ عرصہ تک میں نے اس قہقہے کے بارے میں تھوڑا بہت غور کیا، چند ایک دن، پھر اس کے بعد بھول گیا۔ طویل وقفوں کے درمیان، ایک آدھ بار، وہ قہقہہ مجھے اپنے اندر سنائی دیتا ہوا معلوم ہوتا۔ لیکن زیادہ تر اوقات میں کسی کوشش کے بغیر دوسری باتوں پر غور و فکر میں لگ جاتا۔

اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں نے پیرس کے ان پشتوں پر ٹہلنا ترک کر دیا۔ جب کبھی میں ادھر سے بس یا کار میں گذرتا تو مجھ پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو جاتا۔ میرا خیال ہے میں شاید منتظر ہوتا۔ لیکن میں سیتن پار کر جاتا اور کوئی چیز وقوع پذیر نہ ہوتی۔ میں اطمینان کا سانس لیتا۔ ان دنوں میری صحت بھی گری گری رہنے لگی تھی۔ کوئی خاص شکایت نہیں، بس ایک طرح کا اضمحلال سا طاری رہتا اور مجھے اپنی طبیعت کی سابقہ جولانی برقرار رکھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، انہوں نے مفرح اور مقوی ادویات دیں۔ میں ایک دن چاق و چوبند رہتا تو دوسرے دن مضمحل ہو جاتا۔ زندگی میرے لئے اب نسبتاً کم آسان ہو گئی تھی۔ جسم ٹھیک نہ رہے تو دل بھی پژمردہ ہو جاتا ہے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ علم جو میں نے کسی سے سیکھا نہ تھا اور جس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ کیسے جینا چاہیئے ——— اس کا آدھے سے زیادہ حصہ میں بھولتا جا رہا ہوں۔ ہاں، غالباً اسی وقت سے ابتدا ہوئی تھی۔

لیکن آج شام بھی میں خاطر خواہ بشاشت نہیں محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے اظہار میں بھی دقت محسوس ہو رہی ہے۔ میں اتنی اچھی طرح باتیں نہیں کر رہا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے میرے الفاظ میں تیقن کی کمی ہے۔ شاید موسم کی وجہ سے ہو۔ سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ ہوا اتنی بوجھل ہے کہ سینے پر گھٹن سی جاتی ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو باہر نکلیں اور شہر میں تھوڑی بہت چہل قدمی کر لیں؟ شکریہ۔

آج شام نہریں کتنی خوبصورت ہیں ——! مجھے ٹھہرے ہوئے پانی کی لپیٹ، بھیگی ہوئی مُردہ پتیوں کی خوشبو اور گل پوش بجروں سے اٹھتی ہوئی جنازوں کی سی مہک بے حد پسند ہے۔ نہیں، نہیں، یقین رکھیئے میرے اس ذوق میں کسی قسم کی مریضانہ ذہنیت کا دخل نہیں ہے بلکہ میں نے شعوری اور اختیاری

طور پر اس ذوق کی پرورش کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان نہروں کی تعریف پر خود کو مجبور کرتا ہوں دنیا میں سب سے زیادہ مجھے سسلی پسند ہے۔ خاص طور پر جب ایٹنا کی چوٹی سے سورج کی روشنی میں دیکھا جائے اور پورے سمندر اور جزیرے پر میرے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔ جاوا بھی مجھے پسند ہے لیکن خط استوائے حرارت کی طرف چلتی ہوئی ہواؤں کے موسم میں۔ ہاں میں اپنی جوانی کے دنوں میں وہاں گیا تھا۔ عام طور پر مجھے سبھی جزیرے پسند آتے ہیں۔ ان پر تسلط حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔

خاصا دلکش مکان ہے نا؟ اوپر جو آپ کو دو سر نظر آرہے ہیں وہ حبشی غلاموں کے سر ہیں۔ یہ دکان کا تجارتی نشان ہے۔ یہ مکان ایک بردہ فروش کی ملکیت تھا۔ ارے نہیں، اُس زمانے میں لوگ اتنے زیادہ نازک طبع نہیں تھے! ان میں خود اطمینانی ہوتی تھی۔ وہ بالاعلان کہتے تھے۔ "میں بڑا آدمی ہوں۔ میں غلاموں کی تجارت کرتا ہوں۔ میرا سیاہ فاموں کا کاروبار ہے۔" کیا آپ آج کسی ایسے آدمی کا تصور کر سکتے ہیں جو برسرِ عام یہ اظہار کر سکے کہ اس کا کاروبار اس نوعیت کا ہے؟ کیسا اسکینڈل رہے گا! میں یہیں سے اپنے پیرس کے رفقاء کی آواز سن سکتا ہوں وہ لوگ اس معاملے میں بڑے کٹر ہیں۔ وہ فوراً دو، تین بلکہ اس سے بھی زیادہ منشور، ایسی انسان سوز حرکت کے خلاف شائع کرانے میں دریغ نہیں کریں گے! اور غور و فکر کے بعد میں بھی ان کے ساتھ اپنے دستخط کا اضافہ کر دوں گا۔! غلامی! یقیناً نہیں، ہم اس کے خلاف ہیں۔! اب اگر ہم اپنے گھروں اور کارخانوں میں اسے برقرار رکھے ہوئے ہیں تو یہ ایک الگ ــــ فطری ــــ بات ہے۔ لیکن اس پر گھمنڈ کرنا، یہ تو حد ہے!

میں جانتا ہوں آدمی کا حاکم بننا یا کسی سے خدمت لئے بغیر گذارا بھی نہیں۔ ہر آدمی کو تازہ ہوا کی طرح غلاموں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حکم چلانا سانس لینے کے برابر ہے ــــ آپ مجھ سے متفق ہیں؟ اور اس معنی میں اپاہج سے اپاہج بھی سانس لیتے ہیں۔ سماج کے نچلے سے نچلے طبقے کے آدمی کے پاس اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک بیوی یا بچہ تو ضرور ہوتا ہے جس پر وہ حکم چلا سکے۔ اگر کنوارا ہے تو پھر کتا تو کہیں گیا نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آدمی کسی ایسے پر غصہ کر سکے جو پلٹ کر جواب دینے کا حق نہ رکھتا ہو: "اپنے باپ کو پٹ کر جواب نہیں دینا چاہیے۔" آپ نے یہ مقولہ تو سنا ہوگا؟ ایک طرح سے یہ بات عجیب لگتی ہے۔ اگر ہم انہیں کو جواب نہ دیں جنہیں ہم چاہتے ہیں تو پھر دنیا میں آخر کس کو جواب دیں؟ دوسرے پہلو سے دیکھئے تو بات معقول بھی معلوم ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی کو تو ہر جا حرفِ آخر کہنے کا اختیار رہنا چاہیے۔ ورنہ ہر دلیل کے مقابل دوسری دلیل آتی رہے گی اور یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس، اقتدار ہر معاملہ کا فوراً تصفیہ کر دیتا ہے۔ ہمیں اس بات کو سمجھنے میں وقت ضرور لگا لیکن بالآخر ہم اس کے قائل ہو گئے۔ مثلاً آپ نے محسوس کیا ہوگا، ہمارا پرانا یورپ اب آخرکار صحیح طرح سے حکمت آرائی کر رہا ہے۔ اب ہم پچھلے سیدھے سادے دنوں کی طرح یہ نہیں کہتے۔ "میرا خیال یہ ہے۔ آپ کے اعتراضات کیا ہیں؟"

join eBooks Telegram

اب ہم زیادہ صاف اور دانح ہو گئے ہیں۔ ہم نے اب مکالے کی جگہ "اعلامیہ" کو دے دی ہے۔ "سچائی یہ ہے" ہم کہتے ہیں۔ "تم جتنا چاہو اس پر بحث کرو اس سے ہمیں دلچسپی نہیں۔ لیکن چند برسوں میں پولیس خود تمہیں بتا دے گی کہ ہم صحیح تھے۔"

ارے، یہ اپنا پرانا ستیارہ! اب سب کچھ عیاں ہے۔ ہم اب خود آگاہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہم کس کام کے اہل ہیں۔ موضوع نہیں، صرف مثالیں اگر بدلنی ہوں تو بھی کو لیجئے۔ میں ہمیشہ چاہتا تھا کہ میری خدمت ایک مسکراہٹ کے ساتھ انجام دی جائے۔ اگر ملازمہ اداس نظر آتی تو میرا سارا دن مٹی میں مل جاتا۔ یقیناً اُسے بشاش نہ رہنے کا پیدائشی حق حاصل ہے لیکن میں خود سے کہتا۔ اگر وہ آنسوؤں کی بجائے ہنسی کے ساتھ اپنی خدمات بجالاتی تو اس کے لئے کتنا اچھا ہوتا اور، درحقیقت خود میرے لئے بھی کتنا بہتر ہوتا۔ شیخی کے شائبے کے بغیر میں کہتا ہوں میرا یہ استدلال بالکل احمقانہ نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ چینی ریستورانوں میں کھانے سے احتراز کیا۔ صرف اس لئے کہ وہ لوگ منہ میں گھنگھنیاں بھرے رہتے ہیں اور سفید فام لوگوں کی موجودگی میں مشرقی اکثر تحقیر و تنفر سے پیش آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فطری طور پر، آپ کی خدمت بجالاتے وقت بھی ان کے چہرے پر یہی جذبات ہوتے ہیں ظاہر ہے اس کے بعد مرغن چوزے کا کیا خاک لطف آئے گا؟ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آپ ان کی طرف دیکھنے کے بعد کس طرح اپنے آپ کو راستی پر سمجھیں گے؟

چلئے، صرف ہمارے آپ کے درمیان — بہتر ہوگا ایک تبسم کے ساتھ — یہ طے رہا کہ غلامی ایک ناگزیر شے ہے لیکن ہمیں اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہیئے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ جو شخص غلاموں کے بغیر گذارا نہ کر سکتا ہو وہ غلاموں کو آزاد انسان کہنے لگے؟ اس کی ایک وجہ تو اصولی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ اس طرح ہم غلاموں کو رنج اور مایوسی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اتنی سی تلافی تو بہر حال ہمارا فرض ہے۔ اس طرح ان کی مسکراہٹ بھی برقرار رہے گی اور ہمارے ضمیر کا اطمینان بھی۔ ورنہ پھر ہمیں اپنے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ اور یہ اذیت ہمیں پاگل بنا دے گی یا ممکن ہے ہم منکسر المزاج بن جائیں۔ کوئی بھی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا حاصلِ کلام یہ کہ یہ تجارتی نشان نہیں ہونے چاہئیں اور یہ تجارتی نشان جو اس دکان پر لگا ہوا ہے لرزہ خیز ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہر شخص سب کو اپنا اصل پیشہ اور شخصیت بتانے لگ جائے تو ہمیں پناہ لینے کے لئے جگہ نہ مل سکے گی۔ ذرا تصور کیجئے اگر اس طرح کے ملاقاتی کارڈ چھپنے لگیں تو کیا ہوگا۔ "دوپان صاحب، اعصاب زدہ فلسفی" یا عیسائی زمیندار" یا "زناکار انسان پرست" — واقعی انتخاب کے لئے بڑی وسعت ہے — لیکن اس طرح تو زندگی جہنم بن جائے گی!! ہاں جہنم ایسا ہی ہوگا۔ راستے سائن بورڈوں سے بھرے ہوئے اور اپنی وضاحت پیش کرنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ ہر ایک پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی اصلیت کی مہر لگ جاتی۔

join eBooks Telegram

مثال کے طور پر میرے عزیز ہم وطن، ذرا توقف کیجئے اور سوچئے اگر ایسا ہو تو آپ اپنے لئے کیا نشان منتخب کریں گے؟ آپ خاموش ہیں؟ ٹھیک ہے آپ مجھے بعد میں بتلائیں گے، بہرحال مجھے معلوم ہے میرا نشان کیا ہوگا۔ ایک دو رخی چہرہ، ایک دلکش جانوس اور اس کے اوپر دو کان کے بارے میں یہ الفاظ تحریر ہوں گے: "یہاں کے مال پر بھروسہ مت کرو"۔ میرے ملاقاتی کارڈوں پر یہ لکھا ہوگا: "ژاں باپتیست کلیمینس۔ ڈرامے کا اداکار"۔ اس دن میں آپ سے جس شام کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ میں جب بھی کسی نابینا آدمی کو سڑک کے کنارے جا کر چھوڑتا تو جدا ہونے سے پہلے آداب بجالانے کے لئے سر کو تھوڑا سا خم دے کر اپنی ہیٹ کو چھوتا تھا۔ ظاہر ہے یہ ہیٹ کو چھونے کا عمل نابینا کے لئے تو نہیں تھا کیونکہ وہ بیچارہ دیکھنے سے معذور تھا۔ پھر یہ عمل کس کے لئے تھا؟ لوگوں کے لئے۔ اسٹیج پر اپنا پارٹ ادا کرنے کے بعد جھک کر کورنش بجالانا۔ بری بات تو نہیں! انہیں ایام میں ایک اور دن ایک موٹر والے نے مدد کے لئے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور میں نے جواباً کہا کہ اس کی اتنی مدد کوئی اور نہیں کرتا۔ یقیناً یہ ایک چوک تھی میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ کوئی بھی اس کی اتنی مدد کر دیتا۔ لیکن یہ افسوسناک غلطی میرے لئے ایک بوجھ بن گئی عجز و انکساری کے معاملے میں میرا ثانی نہیں تھا۔

مجھے پورے عجز کے ساتھ اعتراف ہے کہ میری ذات انا کے دباؤ سے پھٹی پڑتی تھی۔ میں، میں، میں میری پوری زندگی کا کورس ہے اور میری ہر بات میں اُسے سُنا جا سکتا ہے۔ خودستائی کے بغیر میں بات نہیں کر سکتا تھا، خصوصاً جب اس مؤثر ترین احتیاط کے ساتھ بات کرتا جس کا میں بادشاہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں زندگی میں ہمیشہ آزاد اور با اختیار رہا ہوں۔ دوسروں سے تعلقات میرے لئے ہمیشہ اطمینان دہ اور اپنے اظہار کا ذریعہ ثابت ہوتے تھے اور اس کی سب سے اعلیٰ وجہ یہ تھی کہ میں کسی کو اپنا مقابل ہی نہیں سمجھتا تھا۔ میں ہمیشہ خود کو دوسروں کے مقابلے میں ــــ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں ــــ نہ صرف زیادہ ذہین بلکہ زیادہ ذکی الحس اور زیادہ با صلاحیت بھی تصوّر کرتا تھا۔ مشاق نشانہ باز، بے مثال ڈرائیور۔ بہتر عاشق جن شعبوں میں اپنی کمتری یا کمزوری کو میں بآسانی دیکھ سکتا تھا، جیسے ٹینس جس میں میں زیادہ سے زیادہ ایک گوارا پارٹنر کہلا سکتا تھا۔ ان کے بارے میں بھی میرے لئے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ تھوڑی سی مشق اور وقت کے ساتھ میں بہترین کھلاڑیوں کو مات دے سکتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ میں صرف فضیلتیں ہی فضیلتیں نظر آتی تھیں۔ اور یہی احساس لوگوں کے ساتھ میری خوش خلقی اور مطمئن سلوک کا باعث تھا۔ لوگوں کے ساتھ میرا تعلق

لے ایک رومن دیوتا جس کے دو سر تھے اور جو بیک وقت دو طرف دیکھ سکتا تھا۔ (مترجم)

join eBooks Telegram

مشفقانہ اور ہر طرح کی لاگ لپیٹ سے آزاد ہوتا تھا۔ اور ان تعلقات کا سارا اعزاز مجھے ملتا۔ اپنی نظروں میں میری عزت اور سوا ہو جاتی۔

اس شام کے واقعہ کے بعد چند ایک اور صداقتوں کے ساتھ ان حقیقتوں کا بھی رفتہ رفتہ مجھ پر انکشاف ہونے لگا۔ یہ انکشاف فوری طور پر ہوا اور نہ پوری طرح واضح تھا۔ پہلے تو مجھے اپنی یادداشت حاصل کرنی پڑی۔ بتدریج چیزیں صاف دکھائی دینے لگیں اور میں جو کچھ جانتا تھا اس کا تھوڑا بہت شعور ہونے لگا۔ اس سے پہلے زود فراموشی کی عادت میری زبردست معاون رہی تھی۔ میں اپنے ارادوں اور فیصلوں سے لے کر ہر چیز تک بھول جانے کا عادی تھا۔ بنیادی طور پر کوئی چیز اہم نہیں تھی۔ جنگ، خودکشی، محبت، افلاس ان سب مسائل کی طرف میں حالات کے حسب ضرورت متوجہ ضرور ہوتا تھا لیکن یہ توجہ محض رسماً اور اخلاقاً ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں کسی ایسے آدرش کی خاطر جذباتی بن جانے کا سوانگ رچاتا جس کا میری روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن بنیادی طور پر میں ایسی کسی تحریک میں کبھی شامل نہیں ہوا تاوقتیکہ میری آزادی خطرہ کی زد میں نہ ہو۔ میں پوری طرح واضح نہیں کر پا رہا ہوں بس یوں سمجھیے ہر چیز مجھے چھوئے بغیر گذر جاتی تھی، جیسے پانی چکنے گھڑے پر سے پھسل جاتا ہے۔

لیکن مجھے اپنے آپ سے انصاف بھی کرنا چاہیے۔ بعض اوقات میری زود فراموشی قابلِ تعریف ہوتی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا مذہب ہر خطا کو معاف کر دینا ہوتا ہے اور جو واقعی ہر خطا کو معاف کر دیتے ہیں لیکن اُسے بھولتے ہرگز نہیں! میں خطاؤں کو معاف کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں تھا لیکن بالآخر ہمیشہ انھیں بھلا دیتا تھا اور وہ شخص جو یہ سمجھتا کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں، جب یہ دیکھتا کہ میں اُسے مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتا ہوں تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور وہ اپنی فطرت کے مطابق، یا تو میرے کردار کی بلندی کا قائل ہو جاتا یا پھر میری بے حیائی پر نفرین بھیجتا لیکن دونوں صورتوں میں میرے رویّہ کی یہ معمولی سی وجہ اس کی نظروں سے اوجھل رہتی کہ میں اس کا نام تک بھول چکا ہوں۔ میری یہی کمزوری جس کی بنا پر میں کبھی بے پروا یا احسان فراموش معلوم ہوتا تھا، ایسے مواقع پر مجھے عالی ظرف اور فیاض بنا دیتی تھی۔

نتیجتہً میری زندگی کا تسلسل صرف اسی میں، ہیں، کے دائرے میں رہا۔ نہ آنے والی کل اور اس کی عورتوں کی فکر، نہ آنے والی کل کی نیکی یا بدی کا خیال، ان سے بے نیاز میں ہر دن صرف اس دن کی خاطر زندہ رہا شاید کتوں کی طرح لیکن ہر دن اپنے مقام اور منصب پر محفوظ!! اس طرح میں زندگی کی صرف سطح پر آگے بڑھتا گیا۔ میری زندگی صرف لفظوں کی دنیا میں تھی۔ حقیقت کی زمین پر اس کا وجود نہیں تھا۔ وہ ساری کتابیں جو شاید ہی پڑھی گئیں، وہ سارے دوست جن سے شاید ہی محبّت کی جا سکی، وہ سارے شہر جن کا شاید ہی سفر کیا گیا، وہ ساری عورتیں جو شاید ہی قبضہ میں آ سکیں۔!! میں اپنی اکتاہٹ یا غائب دماغی کی وجہ سے صرف اشاروں پر

join eBooks Telegram

اکتفا کرتا رہا۔ اس کے بعد انسانوں کی باری آئی۔ وہ مجھ سے وابستہ ہونا چاہتے تھے۔ لیکن وابستگی کے لئے کوئی چیز نہیں تھی اور یہ بدقسمتی کی بات تھی، ان کے لئے، میرا کیا تھا، میں تو بھول جاتا تھا۔ مجھے کبھی اپنے سوا اور کوئی یاد نہیں رہا۔

رفتہ رفتہ کسی طرح، میری یادداشت واپس آتی گئی، یا، میں اس کی طرف پلٹا اور یہاں، اس نہاں خلنے میں مجھے ایک یاد اپنی منتظر ملی۔ لیکن اسکی بابت کچھ بتانے سے پہلے مجھے چند اور واقعات بیان کرنے دیجئے (اور یہ یقیناً آپ کے لئے کارآمد ثابت ہوں گے) جن کا مجھے اپنی تفتیش کے دوران علم ہوا۔

ایک دن میں کار چلا رہا تھا۔ چوراہے پر سبز روشنی آگے بڑھنے کا سگنل دے رہی تھی اور مجھے کار آگے لینے میں ذرا دیر ہو گئی اور میرے پیچھے کاروں کی قطار سے ہمارے صبر پیشہ ہم شہریوں نے غضبناک ہو کر ہارن بجانے شروع کر دیئے۔ اس وقت مجھے اچانک ایک واقعہ یاد آ گیا جو اسی قسم کی صورت حال میں پیش آیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل جس پر چشمہ لگائے نکر پہنے ہوئے ایک مختصر سا آدمی بیٹھا ہوا تھا، میرے بازو سے نکل کر میری کار کے سامنے سرخ روشنی کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ وہ آدمی انجن کو دوبارہ چلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ سامنے بتی کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ میں نے حسبِ عادت نہایت اخلاق سے اس سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل راستے سے ہٹالے تاکہ میں آگے بڑھ سکوں۔ وہ شخص اپنے خرخراتے ہوئے انجن پر کھڑا ابھنا رہا تھا لہٰذا اس نے پیرس والوں کے اخلاقی اصولوں سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "جی چاہے تو کسی درخت پر چڑھ جاؤ"۔ میں نے دوبارہ اسی نرمی سے لیکن آواز میں قدرے بے صبری کا عنصر لئے اصرار کیا۔ اس نے فوراً صاف اور غیر مبہم الفاظ میں جواب دیا "میری بلا سے، جہنم میں جاؤ"۔ اس دوران بہت سے ہارن میرے پیچھے چیخ رہے تھے۔ میں نے ایک اور بار اس سے درخواست کی کہ وہ شائستگی سے کام لے اور ٹریفک کی آمد و رفت میں خلل نہ ڈالے اس چڑچڑے آدمی نے جو شاید اپنی انجن کی خرابی پر برانگیختہ ہو رہا تھا مجھے اطلاع دی کہ اگر میں چاہوں تو وہ بڑی خوشی سے میری ہڈی پسلی درست کر سکتا ہے۔ اس بدمزاجی کے مظاہرے نے مجھے بجا طور پر مشتعل کیا اور میں اس گندہ دہن آدمی کی مزاج پرسی کے ارادے سے کار سے اترا۔ میں اپنے آپ کو بزدل نہیں خیال کرتا (لیکن آدمی کیا کیا نہیں خیال کرتا!) میرا قد اس آدمی سے ایک مٹھی اونچا تھا اور میرے بازوؤں کی مچھلیاں ہمیشہ مضبوط رہی ہیں۔ اور مجھے اب بھی یقین ہے لڑائی اگر ہوتی تو ٹھکائی میری بجائے اسی کی ہوتی۔ لیکن میں نے بمشکل کار سے نکل کر سڑک پر قدم رکھا تھا کہ ارد گرد بڑھتے ہوئے ہجوم سے ایک شخص باہر آیا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اور مجھے ایک ذلیل گالی دیتے ہوئے اطلاع دی کہ وہ مجھے ایک ایسے آدمی پر ہاتھ ڈالنے نہیں دے گا جو اپنی ٹانگوں میں پھنسی ہوئی موٹر سائیکل کی وجہ سے لڑنے کے قابل نہیں ہے۔ میں اس سورما کی طرف مڑا لیکن درحقیقت میں

join eBooks Telegram

اسے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کیونکہ عین اس لمحہ موٹر سائیکل دوبارہ پھٹ پھٹ کرنے لگی - اور میری کنپٹی پر زور کی ضرب لگی - اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکوں موٹر سائیکل یہ جا وہ جا، نکل گئی - میں چکرا گیا اور خاموش ایک مشین کی طرح آگے بڑھا اور اسی لمحہ روشنی سُرخ سے سبز ہو گئی اور موٹروں کی طویل قطار سے ہارن کے بے صبر شور کا سیلاب امنڈ آیا - میں سراسیمہ سا ہو کر، اس احمق کی گوشمالی کرنے کی بجائے جس نے دخل اندازی کی تھی، فرمانبرداری کے ساتھ اپنی کار کی طرف پلٹ آیا - کار اسٹارٹ کر کے میں آگے بڑھ رہا تھا تو اس احمق نے بآواز بلند مجھے "بیوقوف گدھا" کہا جو مجھے اب بھی یاد ہے۔

آپ کے خیال میں یہ بحید معمولی سا واقعہ ہے؟ ممکن ہے - تاہم مجھے اسے بھلانے میں ایک عرصہ لگا اور یہی اہم بات ہے - لیکن پھر بھی میرے پاس اپنی تسلی کے لئے کافی عذر موجود تھے - میں نے جواب تک دیئے بغیر مار کھالی تھی - لیکن بزدلی کا الزام میرے لئے ناقابلِ قبول تھا - حملہ اچانک ہوا، بیک وقت دو دو طرف سے مجھے مخاطب کیا جا رہا تھا، میں نے پریشانی میں ہر چیز گڈمڈ کر دی تھی - اور اس پر مستزاد موٹر ہارنوں کی آواز جس نے گویا میری گھبراہٹ کو انتہا پر پہنچا دیا - بایں ہمہ مجھے اس واقعہ کا غم تھا جیسے میں نے کوئی شرافت کا اصول توڑ دیا ہو - سارا منظر میری نگاہوں میں تھا - میں خود کو بغیر کسی ردِعمل کے کار کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ سکتا تھا - ہجوم کی استہزائی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میری ذلت پر انھیں خاص طور پر اس لئے خوشی ہو رہی تھی کہ، مجھے یاد ہے، میں ایک نہایت نفیس نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا - "بیوقوف گدھا" یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے اور تمام باتوں کے باوجود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس لقب کا غیر مستحق نہیں تھا - قصہ مختصر سر بازار میری شکست ہوئی تھی - اس میں شک نہیں اس میں حالات کا بڑا دخل تھا - لیکن حالات تو ہمیشہ ہی ہوتے ہیں - بعد میں میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا - دخل در معقولات کرنے والے کی ٹھوڑی میں ایک زبردست مکا رسید کر کے اپنی کار کی طرف پلٹتا ہوں اور اس بندر کا تعاقب کرتا ہوں جس نے مجھے گھونسا لگایا تھا اور اسے موٹر سائیکل فٹ پاتھ سے لگانے پر مجبور کرتا ہوں اور اس کے بعد اتر کر اُسے ایک طرف کھینچ کر وہ ٹھکائی کرتا ہوں جس کا وہ مستحق تھا — یہ مختصر سی فلم میں نے تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ کوئی سو بار اپنے تخیل کے پردے پر چلائی لیکن یہ سب کچھ بعد از وقت تھا - اور کئی دنوں تک طیش اور افسوس کا تلخ احساس مجھے گھن کی طرح کھاتا رہا -

لیجئے پھر بارش شروع ہو گئی - چلئے کچھ دیر پورٹیکو میں رک جائیں - ہاں، میں کیا کہہ رہا تھا؟ جی ہاں، عزت! خیر، جب میں اس واقعہ کی یاد سے جانبر ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے معنی کیا تھے - آخر میرا خواب حقیقتوں کا حریف نہ ہو سکا - اب واضح طور پر عیاں تھا کہ میرا اپنے آپ کو ایسا مکمل انسان سمجھنا جو نہ صرف شخصی طور پر بلکہ اپنی

join eBooks Telegram

پیشہ ورانہ حیثیت میں بھی قابلِ عزت ہے، محض ایک خواب تھا۔ مختصر یہ کہ میں نے ہر معاملے میں غالب رہنے کی کوشش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سوانگ رچائے، روپ بھرے، اپنی فکری صلاحیتوں کی بجائے جسمانی ہنر کے مظاہرے کا خاص خیال رکھا۔ لیکن ایک بار برسرِ عام مار کھانے اور کچھ نہ کر پانے کے بعد اپنی شخصیت کا وہی دل خوش کن تصوّر برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ اگر مجھے صداقت اور ذہانت سے اتنا ہی تعلق ہوتا جتنا مجھے دعویٰ تھا تو پھر اس واقعہ کی میرے لئے کیا اہمیت ہوتی؟ وہ لوگ تو یہ واقعہ بھول بھی چکے تھے جنہوں نے یہ تماشا دیکھا تھا۔ میں اپنے آپ کو صرف بلاوجہ طیش میں آجانے کا قصوروار ٹھہرا سکتا تھا اور پھر طیش میں آنے کے بعد اس کے نتائج کا صحیح طور پر سامنا اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ میں حاضر دماغی سے کام نہیں لے سکا، یہ میری دوسری غلطی تھی۔ اس واقعہ کا صحیح ردِ عمل تو یہی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کی بجائے میں صرف انتقام لینے، ماسف اور غلبہ پانے کا خواہش مند تھا۔ گویا میری اصلی خواہش دنیا کا ذہین ترین اور فیاض ترین آدمی بننے کی نہیں تھی بلکہ مجھے اس کے بجائے جسے چاہوں اُسے مار سکنے کی، دوسرے سے زیادہ طاقتور ثابت ہونے کی، اور وہ بھی بعید عامیانہ معنوں میں ـــ تمنا تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر ذہین آدمی غنڈہ بننے اور سوسائٹی پر صرف جبر و تشدد کے ذریعہ حکمرانی کی خواہش رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اتنا آسان نہیں، جتنا کہ جاسوسی ناول ہمیں باور کراتے ہیں، اس لئے آدمی بالعموم سیاست کا سہارا لیتا ہے اور ظالم ترین سیاسی جماعت میں شرکت کے لئے دوڑتا ہے۔ اور پھر اگر مفکر ذہن کی ذلت قبول کرنے کے بعد ہر ایک کو زیرنگیں کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ایسا کیا مضائقہ ہے؟ مجھ پر اپنی ذات میں جبر و استبداد کی لذیذ خواہشوں کا انکشاف ہوا۔

مجھے کم از کم اس بات کا علم ہو گیا کہ میں مجرموں اور ملزموں کا طرفدار صرف اس حد تک ہوں جہاں تک ان کے جرائم مجھے نقصان نہیں پہنچاتے۔ ان کے جرائم کے بارے میں میں زوردار تقریریں کر سکتا تھا کیونکہ میں ان جرائم کی زد سے باہر تھا۔ لیکن جب میں خطرہ میں ہوتا تو نہ صرف فوراً منصف بن جاتا بلکہ انصاف کی حدود سے بھی آگے بڑھ کر ایک ایسا جھلایا ہوا حاکم بن جاتا جو تمام قوانین بالائے طاق رکھ کر مجرم پر پل پڑتا ہے اور اسے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد، میرے ہم وطن عزیز، اس بات پر سنجیدگی سے یقین برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی انصاف کو پیشے کے طور پر اختیار کر سکتا ہے یا یہ کہ وہ بیواؤں اور یتیموں کے تحفظ کے لئے مامور ہوا ہے۔

بارش تیز ہو رہی ہے اور چونکہ ہمیں فرصت بھی ہے۔ لہٰذا اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی یادداشت کی ایک اور دریافت میں آپ کو شریک کروں گا۔ آیئے، بارش سے بچ کر ادھر اس بنچ پر بیٹھ جائیں۔ صدیوں سے پائپ پینے والے یہاں بیٹھ کر اسی بارش کو اسی نہر پر برستا ہوا دیکھتے رہے ہیں۔ اب جو بات میں آپ سے کہنے والا ہوں وہ نسبتاً ذرا مشکل ہے۔ اس بار معاملہ ایک عورت کا ہے۔ میں عورتوں کے معاملے میں ہمیشہ کامیاب رہا ہوں۔ کامیاب سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں نے انہیں آسودگی اور مسرت بہم پہنچانے میں یا خود اپنے آپ کو

خوشی کرنے میں کوئی کامیابی حاصل کی۔ نہیں، میرا مطلب صرف کامیابی ہے! جب جی چاہا اپنا مطلب نکال لیا' بس۔ مجھے کافی پرکشش سمجھا جاتا تھا۔ کوئی حد ہے! آپ جانتے ہیں کشش کیا چیز ہوتی ہے! براہِ راست سوال کئے بغیر جواباً "ہاں" کہلوانے کا طریقہ۔ یہ بات ان دنوں میرے متعلق سو فیصد سچ تھی۔ آپ کو اچنبھا ہو رہا ہے! چلئے تکلف مت برتئے۔ اس وقت میری جو شکل و صورت ہو رہی ہے اس کے پیشِ نظر آپ کی حیرت بالکل بجا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد ہر آدمی اپنے چہرے کا ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ میرا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب اس سے کیا؟ تو یہ سچی بات ہے کہ ان دنوں میں پرکشش سمجھا جاتا تھا اور میں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

لیکن کسی جوڑ توڑ کے بغیر۔ میں پوری نیک نیتی یا تقریباً پوری نیک نیتی سے کام کرتا تھا۔ عورتوں سے میرا تعلق، کہاوت کے مطابق، بالکل فطری اور آرام اور کھلے دل کا ہوتا تھا۔ اس میں کوئی عیاری نہیں ہوتی تھی بجز اس واضح عیاری کے جسے وہ اپنا خراج سمجھتی ہیں۔ عام، بے معنی الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے ان سے محبت کی اور جس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ان میں سے کسی سے بھی محبت نہیں کی۔ عورت بیزاری کو میں نے ہمیشہ گھٹیا اور احمقانہ فعل سمجھا اور تقریباً وہ تمام عورتیں جن سے میری آشنائی ہوئی، مجھے خود سے بہتر معلوم ہوئیں۔ بایں ہمہ انھیں اتنی بلندی پر بٹھانے کے باوجود میں نے ان کے کام آنے کی بجائے ان سے فائدہ ہی اٹھایا۔ کوئی کیسے اس بات کو سمجھ سکتا ہے؟ بلاشبہ سچی محبت ایک استثنائی چیز ہے جو دو تین سو سال میں کم و بیش دو تین بار ظہور پذیر ہوتی ہے اور باقی ماندہ اوقات میں صرف اکتاہٹ اور خود پسندی ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کبھی پرتگالی نن نہیں رہا۔ میں سنگدل نہیں ہوں بلکہ اس کے برعکس رحم اور ہمدردی سے معمور ہوں اور میری آنکھوں میں کبھی آنسوؤں کی کمی نہیں رہی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میری ساری جذباتیت کا مرکز و محور میں خود تھا اور ہمدردی اور ترحم کے سارے احساسات کا رُخ میری اپنی ذات کی طرف ہوتا تھا۔ بہر حال یہ سچ بات نہیں ہے کہ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ میں نے زندگی میں کم از کم ایک عظیم محبت کا ضرور تصوّر کیا ہے اور اس محبت کا مرکز ہمیشہ میری اپنی ذات تھی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو عنفوانِ شباب کی ناگزیر مشکلات کے بعد جلد ہی میں نے سنبھالا لے لیا تھا۔ صرف شہوانیت میری عشقیہ زندگی پر غالب رہی۔ مجھے صرف فتوحات اور لذتوں کی تلاش تھی۔ اور پھر میری خوبصورتی نے بھی مجھے کافی مدد دی۔ اس معاملے میں فطرت نے میرے ساتھ فیاضی سے کام لیا تھا۔ مجھے اس بات کا بڑی حد تک غرور بھی تھا اور اس سے میں نے کافی تسکین حاصل کی۔ گو مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس تسکین میں جسمانی لذت کا عنصر تھا یا ایک احساس وقار۔ اب یقیناً آپ پھر کہیں گے کہ میں ڈینگ مار رہا ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس پر کوئی فخر بھی نہیں ہے کیوں کہ میں دُھن کی لے بھی رہا ہوں تو ان باتوں پر جو سچی ہیں۔

join eBooks Telegram

بہرحال میری لذت پرستی اتنی حقیقی تھی کہ ایک دس منٹ کی "مہم" کے لئے بھی میں ماں باپ تک سے منہ موڑ سکتا تھا۔ خواہ مجھے بعد میں اس پر پچھتانا ہی کیوں نہ پڑتا۔ شاید میں نے غلط کہا۔ کیونکہ میں اس حد کو صرف دس منٹ کی مہم کی خاطر جاتا اور خصوصاً جب یہ یقین ہوتا کہ یہ دس منٹ پھر نہیں حاصل ہوں گے۔ میرے یقیناً کچھ اصول بھی تھے جیسے کہ دوست کی بیوی مقدس ہوتی ہے لیکن میں بآسانی چند دن پہلے ہی سے بڑے خلوص کے ساتھ شوہر سے دوستی ترک کر دیتا۔ شاید مجھے اس بات کو لذّت پسندی نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ لذت پسندی مکروہ نہیں ہوتی۔ چلئے ذرا نرم سا لفظ استعمال کریں اور اسے کمزوری کہیں۔ لیکن یہ کمزوری بہرکیف تھی بڑی سہولت کی چیز۔ میری بھول جانے کی صلاحیت کے ساتھ مل کر اس کمزوری نے میری آزادی کو بہت سہارا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس چیز نے مجھے "ناقابلِ حصول" اور "غیر متزلزل آزادی" کا لبادہ اڑھا کر نو بہ نو کامیابیوں کے مواقع بخشے۔ چونکہ میں خود رومانی نہیں تھا اس لئے میں نے رومانس کا "تختۂ مشق" اور چیز کو بنایا۔ ہماری دوست خواتین، بوناپارٹ کی طرح ہمیشہ یہ سمجھتی ہیں کہ جہاں دوسرے سب ناکام ہوتے ہیں وہاں وہ ضرور کامیاب رہیں گی۔ اس کاروبار میں میں نے لذت پرستی کے علاوہ اپنے ایک اور شوق کی تسلی کا بھی سامان فراہم کیا۔ مجھے قمار بازی سے دلچسپی تھی۔ عورتوں میں میں نے انہیں سے محبّت کی جو کسی کھیل میں میری شریک بن سکتی تھیں۔ جس میں کم از کم معصومی کی جھلک ہوتی۔ آپ جانتے ہیں میں اکتاہٹ برداشت نہیں کر سکتا اور صرف زندگی کی دلچسپیوں کی قدر کرتا ہوں۔ ہر سوسائٹی خواہ کتنی ہی کھر ذکیلی کیوں نہ ہو مجھے گراں بار کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جن عورتوں کو میں نے چاہا ان سے میں کبھی بور نہیں ہوا۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے لیکن میں آئن سٹائن سے دس ملاقاتوں کے بدلے ایک حسین رقاصہ سے پہلی ملاقات کو ترجیح دیتا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس سے دس ملاقاتوں کے بعد پھر میں آئن سٹائن یا کسی سنجیدہ کتاب کی آرزو کرنے لگ جاتا۔ مختصر یہ کہ میں زندگی کے بڑے مسائل سے کبھی متعلق نہیں رہا۔ سوائے ان وقفوں کے جو میری چھوٹی موٹی کامرانیوں کے درمیان آتے رہے۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ میں فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے دوستوں سے گرم مباحثہ میں مصروف تھا اور میرے خیالات کا تسلسل یک دم درہم برہم ہو گیا۔ کیونکہ عین اسی لمحہ کوئی دشمنِ جاں نازنین سڑک پار کر رہی تھی۔ تو جناب میں نے کھیل جاری رکھا۔ مجھے معلوم تھا عورتیں فوراً اظہار مدّعا کو پسند نہیں کرتیں۔ اولاً کچھ باتیں ہونی چاہئیں۔ ایسی توجہ دینی چاہیئے جسے ان کے اپنے الفاظ میں تمنا زدہ انہاک کہا جاتا ہے۔ باتیں کرنے کے معاملے میں مجھے کبھی کوئی تشویش نہیں ہوئی کیونکہ میں ایک وکیل تھا۔ اور نظروں سے کام لینا بھی میرے لئے مشکل نہ تھا کیونکہ فوج کی ملازمت کے زمانے میں مجھے اداکاری کا بھی شوق تھا۔ کردار بدلتے رہے لیکن کھیل ہمیشہ وہی رہا۔ مثلاً کشش پیدا کرنے کے لئے کوئی ایک ناقابلِ فہم حرکت کرنا، پُراسرار بننا، ایسا رویہ اختیار کرنا گویا یہ بڑی نامناسب اور غلط بات ہے۔ میں واقعی نہیں چاہتا کہ کسی کی طرف کھنچوں، میں محبت سے تھک گیا ہوں وغیرہ

وغیرہ۔! یہ چال ہمیشہ کارگر ثابت ہوئی حالانکہ یہ نہایت فرسودہ اور گھِسا پٹا حربہ تھا ایک ترکیب اور بھی تھی۔ وہ پُراسرار آسودگی اور مکمل مسرّت جو کوئی دوسری عورت آپ کو نہ دے سکی۔ شاید یہ اندھیرے میں تیر چلانا تھا۔ اور در حقیقت ہے بھی (کوئی اپنے آپ کو بہت زیادہ چھپا کر نہیں رکھ سکتا) لیکن ویسے یہ ترکیب ہے بڑی بے مثال۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور حربہ تھا۔ میں نے ایک چھوٹی سی تقریر تیار کر رکھی تھی۔ اس ڈرامہ کا اہم حصہ وہ تھا جہاں ایک درد ناک اور رقت آمیز انداز میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ "میں کوئی چیز نہیں ہوں، میرے ساتھ وابستہ ہو کر کیا ملے گا، میری زندگی کسی اور ہی راستہ پر چل نکلی ہے اور عام زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے کوسوں دور ہے جن کے لئے میں دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی بخوشی قربان کر دیتا۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے، وہ وقت گذر چکا ہے۔" رہا یہ سوال کہ اس فیصلہ کن دیری کے اسباب کیا تھے، تو اس کے متعلق میں نے ہمیشہ رازداری سے کام لیا کیونکہ میں جانتا تھا تھوڑی بہت پُراسراریت کے عالم میں بستر پر جانا بہتر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں میں اس اداکاری کے دوران میں جو کچھ کہتا اس پر خود مجھے بھی یقین سا ہو جاتا تھا کیونکہ میں اپنے کردار میں زندہ ہو جاتا تھا۔ لہذا یہ حیرت کی بات نہیں کہ میری ساتھیوں نے بھی بڑے شوق اور ولولے سے اسٹیج پر کام شروع کر دیا۔ ان میں سے جو بہت حساس قسم کی ہوتیں وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرتیں اور وہ اس کوشش میں ایک طرح کی والہانہ غم پرستی کا شکار ہو گئیں۔ دوسری عورتیں یوں مطمئن ہو جاتیں کہ مجھے کھیل کے آداب کا پاس تھا اور میں مطلب پر پہنچنے سے پہلے احتیاط برتنے کا سلیقہ رکھتا تھا اور اس اطمینان کے بعد وہ جلد "حقائق" کی طرف آجاتیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میری فتح ہوئی۔ یہ فتح دوہری ہوتی۔ کیونکہ اس طرح اپنی خواہش کی تکمیل کے علاوہ ہر موقعہ پر اپنی طاقتوں کا ثبوت اس محبت کو بھی تسکین بخشتا تھا جو مجھے اپنی ذات سے تھی۔

اس تسکین کی خاطر میں ان لڑکیوں سے بھی جن سے برائے نام آسودگی ملتی تھی، طویل وقفوں کے بعد دوبارہ تعلقات جوڑنے کی کوشش کرتا۔ اس کوشش میں دوری سے پیدا ہونے والی اس عجیب خواہش کا بھی یقیناً دخل ہوتا تھا جو کسی پرانے تعلق کی بازیافت سے جاگ اٹھتی ہے۔ لیکن دوبارہ تعلق قائم کرنے سے پہلے میں اس بات کا اطمینان کر لیتا کہ پرانے بندھن ابھی باقی ہیں اور ان بندھنوں کو مضبوط بنانے کا حق صرف مجھے حاصل ہے۔ بعض اوقات میں اس حد تک جاتا کہ ان سے اس بات کی قسمیں لیتا کہ وہ اپنے آپ کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد نہیں کریں گی اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس سلسلے میں پیدا ہونے والے سارے شکوک اور وسوسوں سے فراغت حاصل کر لیتا۔ لیکن ان وسوسوں اور شکوک سے کبھی میرے قلب و دماغ کا تعلق نہیں رہا۔ ایک مخصوص قسم کا دکھاوا مجھ میں اس طرح مجسّم ہو گیا تھا کہ شواہد کے باوجود میرے لئے یہ تصوّر کرنا مشکل تھا کہ کوئی عورت جو کبھی میری رہ چکی ہو کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کی وفاداری کی قسمیں انہیں پابند بناتی تھیں اور مجھے

join eBooks Telegram

آزاد کر دیتی تھیں۔ جیسے ہی مجھے علم ہو جاتا کہ اب وہ کبھی کسی اور کی نہ ہوں گی میں ان سے ترکِ تعلق کو تیار ہو جاتا ورنہ بصورت دیگر یہ ترکِ تعلق میرے لئے ہمیشہ ناممکن تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق تھا میں اپنی بات حتمی طور پہ ثابت کر چکا ہوتا۔ اور ایک کافی طویل عرصہ کے لئے اپنی طاقتوں کے بارے میں مطمئن ہو جاتا۔ عجیب معلوم ہوتا ہے نا! لیکن ہوتا ایسا ہی تھا۔ کچھ چلاتیں "مجھ سے محبّت کرو!" دوسری کہتیں "مجھ سے محبّت نہ کرو!" ایک اور قسم جو ان دونوں سے بدتر اور سنجیدہ دکھی عورتوں کی ہوتی وہ کہتیں "مجھ سے محبّت نہ کرو اور میرے وفادار رہو!"

یہاں تک تو ٹھیک ہے سوائے اس کے کہ اپنی طاقتوں کا کوئی ثبوت قطعی اور آخری تو بہر حال ہوتا نہیں لہٰذا ہر نئے وجود کے ساتھ از سرِ نو معاملہ شروع کرنا پڑتا۔ بار بار کی تکرار سے آدمی عادت کا شکار بن جاتا ہے اور پھر ساری باتیں بغیر کسی کوشش کے خود بخود زبان سے نکلتی رہتی ہیں یہاں تک کہ ایسا دن بھی آجاتا ہے جب دل میں کوئی خواہش نہیں ہوتی لیکن زبان باتیں کر رہی ہوتی ہے۔ یقین کیجئے، بعض لوگوں کے لئے کم از کم، یہ دنیا کا مشکل ترین امر ہوتا ہے کہ جس چیز کی خواہش نہ ہو رہی ہو اُسے حاصل نہ کریں۔

یہی بات انجام کار میرے ساتھ پیش آئی۔ وہ کون تھی یہ بتانا بے سود ہے۔ اتنا کافی ہے کہ اس نے صحیح معنوں میں متاثر کئے بغیر مجھے اپنی بے نیازانہ آرزو مندی سے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ صاف بات تو یہ ہے کہ یہ ایک مکروہ تجربہ تھا اور مجھے اس کا متوقع رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن میں کبھی الجھنوں کا شکار نہیں رہا اور ایسے لوگوں کو بہت جلد بھول جاتا ہوں جنھیں دوبارہ دیکھنے کا متوقع نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا اس نے کسی چیز پر توجہ نہیں دی تھی اور میں یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی کوئی رائے بھی ہوگی۔ علاوہ ازیں وہ اپنی بے نیازی کی وجہ سے میری نظروں میں دنیا سے کٹی ہوئی تھی۔ لیکن چند ایک ہفتوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس نے ایک تیسرے آدمی سے میری کچھ خامیوں کا ذکر کیا ہے۔ دفعتاً مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے دھوکا ہوا ہو۔ وہ اتنی بے نیاز نہیں تھی۔ جیسا کہ میرا قیاس تھا اور اس میں تمیز و فیصلے کی قوت کی بھی کمی نہیں تھی۔ میں نے اپنے کندھے سکوڑ کر مصنوعی قہقہہ لگایا، فوراً، کیونکہ ظاہر ہے بات کچھ اہم نہ تھی۔ انکساری کے لئے جنس کے میدان سے بڑھ کر موزوں جگہ اور کیا ہو سکتی ہے جہاں ان دیکھے اور ناقابلِ قیاس امکانات کی اتنی فراوانی ہو۔؟ لیکن نہیں، ہم میں سے ہر ایک تنہائی میں بھی اپنی صلاحیتیں اور خوبیاں ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ واقعہ سنکر میں نے اپنے کندھے سکوڑے تھے لیکن اس کے باوجود حقیقت میں میرا رویّہ کیا رہا تھا؟ میں نے کچھ عرصہ کے بعد اس عورت کو دوبارہ دیکھا اور اُسے رجھانے اور اپنی طرف کرنے کے پورے جتن کر ڈالے۔ اس میں کچھ زیادہ مشکل نہ تھی کیونکہ عورتیں خود بھی ایسے معاملات کو ناکامی پر منتج نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے بعد میں نے بالکل غیر ارادی

join eBooks Telegram

طور پر اُسے ہر ہر طرح سے ذلیل و پشیمان کرنا شروع کر دیا۔ کبھی چھوڑ دیتا، کبھی اپنا لیتا۔ بے محل مقامات اور مواقع پر اسے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دینے پر مجبور کرتا، ہر اعتبار سے اس کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرتا۔ یہاں تک کہ آخر مجھے اس سے ایسا تعلق پیدا ہو گیا جو کسی جیلر کو اپنے قیدی سے ہو جاتا ہے۔ یہ تعلق یونہی رہا حتیٰ کہ ایک بار آسودگی سے کچھ دیر پہلے ایک کرب کے عالم میں بے اختیار ہو کر اس نے باآوازِ بلند میری اُس صلاحیت کو خراجِ تحسین ادا کیا جس نے اسے میرا غلام بنا رکھا تھا۔ اسی دن سے میں نے اس سے الگ ہونا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں اُسے بھول گیا۔

آپ اخلاقاً کچھ نہ کہیں لیکن مجھے تسلیم ہے کہ یہ کوئی مناسب حرکت نہ تھی۔ لیکن ذرا اپنی زندگی پر غور کیجئے۔ اپنے حافظے کو کرید یئے۔ شاید آپ کو وہاں ایسی ہی کوئی کہانی ملے جو آپ مجھے بعد میں سُنائیں گے جہاں تک میرا تعلق ہے، جب بھی یہ چھوٹا سا واقعہ یاد آتا میں پھر قہقہہ لگاتا۔ لیکن اس بار کا قہقہہ دوسری قسم کا تھا۔ اس قسم کا قہقہہ جو شاید میں نے "فنون کا پُل" پر اس رات سُنا تھا۔ میں عورتوں کے سامنے اپنے مکالموں اور عدالت میں اپنی تقریروں پر ہنس رہا تھا۔ عورتوں کے ساتھ مکالموں پر کم اور عدالت کی تقریروں پر زیادہ۔ کیونکہ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے فطری جبلّت بغیر کسی حیلہ سازی کے میرے رویّے سے خود ظاہر ہو جاتی تھی محبّت کا دخل اعتراف کا دخل ہوتا ہے۔ خود غرضی زور سے چنگھاڑتی ہے، غرور خود نما ہوتا ہے یا اگر پھر سچا والہانہ پن ہے تو وہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ نتیجتہً اس افسوسناک واقعہ میں میں نے اپنی دانست سے بڑھ کر اپنے دیگر واقعات سے بھی کہیں زیادہ، صاف گوئی سے کام لیا۔ میں نے علی الاعلان ظاہر کر دیا تھا کہ میں کون تھا اور میری زندگی کیسے بسر ہو رہی تھی۔ جھوٹ اور تصنّع کے باوجود میں اپنی ذاتی زندگی میں (اور یہ ذاتی زندگی کیسی تھی میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں!) انصاف اور معصومیت کی خاطر بلند پروازی دکھلانے والے وکیل سے بہتر آدمی تھا۔ کم از کم دوسروں کے ساتھ اپنے آپ کو کام کرتا ہوا دیکھنے کے بعد میں اپنی فطرت کی اصلیت کے بارے میں خود کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی آدمی اپنی تفریحات میں منافق نہیں ہوتا۔ یہ جملہ پتہ نہیں میں نے کہیں پڑھا ہے یا میرا اپنا ہے!

جب میں نے اس طرح کسی عورت سے یک لخت ترکِ تعلق کی تکلیف کا تجزیہ کیا۔۔۔ ایسی تکلیف جو مجھے کئی ایک سے بیک وقت تعلقات میں مبتلا کر دیتی تھی۔۔۔ تو مجھے اپنی نرم دلی کا قائل ہونا پڑا۔ ویسے یہ واقعہ جو میں ابھی بیان کرنے والا ہوں اس میں نرم دلی میرے رویّہ کی محرک نہیں تھی۔ میری ایک داشتہ نے جو ہماری جذباتی کشمکش کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کا انتظار کرتے کرتے اکتا چکی تھی۔ ایک دفعہ مجھ سے الگ ہو جانے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد فوراً ہی میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، اپنی ہار مان لی اور

join eBooks Telegram

ساری لفاظی برت ڈالی۔ نرم دلی اور محبت کے احساسات کا جہاں تک تعلق ہے وہ سب ہیں نے اس ہیں بیدار کر دیئے اور خود مجھ پر ان احساسات کا صرف ایک ہلکا سا عکس پڑا۔ اس کے انکار نے مجھے محض تھوڑا سا مشتعل کر دیا تھا اور ایک محبت کے کھو جانے کا امکان بھی تشویش کا باعث تھا۔ اس میں شک نہیں بعض اوقات میں واقعی محسوس کرتا تھا کہ میں دکھی ہوں۔ لیکن اس باغی عورت کو بھلانے کے لئے مجھے صرف اتنا کافی تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دیتی اور میں اُسے اسی طرح بُھلا دیتا جس طرح واپسی کے بعد میرے پہلو میں ہونے کے باوجود میں اس کے وجود تک سے بے خبر ہو گیا تھا۔ مجھے کوئی چھوڑ جانے کی بات کرتا تو میرا پریشان ہو جانا محبت یا تعلق کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ خواہش ہوتی تھی کہ مجھے چاہا جائے اور وہ توجہ دی جائے جس کا میں اپنے آپ کو حقدار سمجھتا تھا۔ اور جس لمحہ مجھ سے محبت کی جاتی، اسی لمحہ میں اپنے ساتھی کو بھول جاتا اور یہ میری کامیابی کا اعلیٰ ترین مقام ہوتا اور یہاں پہنچنے کے بعد میں پسندیدگی کے قابل آدمی بن جاتا۔

علاوہ ازیں، یہ بھی آپ کو بتاتا چلوں کہ جب بھی میں دوبارہ محبت جیتنے میں کامیاب ہو جاتا تو اُسکے فوراً ہی، بعد میں اس محبت کے بوجھ کو محسوس کرنے لگ جاتا۔ اپنی جھنجلاہٹ کے لمحات میں میں اپنے آپ سے کہتا کہ اس سارے مسئلہ کا سب سے اچھا حل یہ ہوگا کہ وہ عورت جس سے مجھے دلچسپی ہے مر جائے۔ اس کی موت سے ایک طرف ہمارے تعلقات کے ٹوٹنے کی نوبت بھی نہیں آئے گی اور دوسری طرف تعلقات کی قید اور زنجیریں بھی ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن آدمی ہمیشہ ہر ایک کی موت کی تمنا تو نہیں کئے جا سکتا۔ اور نہ اس انتہا کو جا سکتا ہے کہ سارے کرۂ ارض کو غیر آباد کر دے تاکہ اس آزادی سے لطف اندوز ہو سکے جو بصورت دیگر ناقابلِ تصور ہے۔ میری حساس طبیعت اور نوعِ انسانی سے میری محبت، دونوں اس کی مخالف تھیں۔

ان معاملات میں اگر کبھی میں نے کوئی گہرا جذبہ محسوس کیا ہے تو وہ شکر و امتنان کا جذبہ ہے اور اس وقت جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو، مجھے نہ صرف سکون کے ساتھ رہنے کا موقعہ ہو بلکہ آنے اور جانے کی مکمل آزادی بھی حاصل ہو۔ میری نرم دلی، خوش مزاجی اور مسرت اپنی انتہا پر اس وقت ہوتیں جب میں ایک کے بستر سے نکل کر دوسری کی معیت میں ہوتا۔ گویا وہ قرض جو میں نے ایک عورت سے لیا تھا اُسے میں تمام عورتوں میں پھیلا دینا چاہتا تھا۔ بہر حال میرے جذبات بظاہر کتنے ہی غیر واضح اور الجھے ہوئے کیوں نہ ہوں لیکن ان سے میں جو نتیجہ حاصل کرتا تھا وہ بہت صاف اور واضح تھا۔ میں اپنے سارے جذبات کو اپنی دسترس کے اندر رکھتا تاکہ انہیں جب چاہوں استعمال کر سکوں۔ مجھے اقرار ہے میں صرف اس شرط پر خوش رہ سکتا تھا کہ روئے ارض پر بسنے والے سارے افراد یا ان کی بیشتر تعداد ہمیشہ کے لئے ہر ایک سے کٹ کر میری

join eBooks Telegram

طرف اس طرح مراجع ہو کہ ان کا اپنا کوئی آزادانہ وجود نہ رہے اور وہ کسی بھی لمحہ میرے ایک اشارے پر ناچنے کے لئے تیار رہیں یا، دوسرے الفاظ میں، مختصراً یوں کہیے کہ سب کے سب اس طرح ناکارہ ہو جائیں کہ جب تک میں ازراہِ عنایت ان کی طرف توجہ نہ کروں وہ کسی قابل نہ بن سکیں۔ یعنی میرے خوش رہنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ جن افراد کو میں منتخب کروں ان کا زندہ وجود ہی نہ رہے۔ انہیں صرف میرے حکم پر وقتاً فوقتاً زندگی ملتی رہے۔

یقین مانئیے یہ سب آپ کو سُناتے ہوئے مجھے کوئی تسکین نہیں مل رہی ہے۔ میں اس زمانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب احساس طاری ہو جاتا ہے جب میں ہر چیز کا طلبگار ہوتا تھا اور کسی چیز کی قیمت ادا نہیں کرتا تھا، جب میں آدمیوں کی اتنی بڑی تعداد کو اپنی خدمت میں جُتا رکھتا تھا، جب میں لوگوں کو گویا برف خانے میں محفوظ رکھتا تھا تاکہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقعہ انہیں نکال کر استعمال کر سکوں۔ ان سب کی یاد سے جو احساس پیدا ہوتا ہے اُسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا کیا اسے شرم کا احساس نہیں کہا جا سکتا؟ میرے عزیز ہم وطن، مجھے بتایئے کیا شرم کا احساس تیشہ زنی نہیں کرتا؟ ممکن ہے یہ شرم کا احساس ہو یا پھر ان احمقانہ احساسات میں سے کوئی احساس ہو جن کا عزت وغیرہ سے تعلق ہوتا ہے۔ بہرصورت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ احساس جسے آپ کوئی بھی نام دے لیں، اس واقعہ کے بعد کبھی میرے ذہن سے فراموش نہیں ہوا۔ اب وہ واقعہ میں کسی مزید تاخیر کے بغیر آپ کو سُنا دوں گا۔ حالانکہ میں نے اسے ملتوی کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کافی کوشش کی جس کی آپ یقیناً مجھے داد دیں گے۔

دیکھئے بارش ختم ہو گئی۔ براہ مہربانی میرے ساتھ گھر تک چلئے۔ میں عجیب سی تھکان محسوس کر رہا ہوں۔ ان باتوں کی وجہ سے نہیں جو میں نے آپ سے کہیں۔ بلکہ ان باتوں کے خیال سے جو مجھے ابھی کہنی ہیں۔ ہاں، ہاں صرف چند الفاظ میری خصوصی دریافت کو بیان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ویسے بھی زیادہ باتوں کا فائدہ کیا ہے؟ مجسمہ کی نقاب کشائی کے بعد عمدہ تقریروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تو لیجئے سُنئے۔ اُس شام سے دو تین سال پہلے، جب مجھے اپنی پشت پر قہقہوں کی آواز کا گمان گذرا تھا، نومبر کے مہینے میں ایک رات میں گھر لوٹ رہا تھا۔ آدھی رات گذرے کوئی ایک پہر ہو چکا تھا۔ مہین پھوار پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے معدودے چند راہگیروں نے بھی سڑک خالی کر دی تھی۔ میں اپنی ایک محبوبہ کے پاس سے واپس لوٹ رہا تھا جو اس وقت تک یقیناً سو بھی چکی ہو گی۔

مجھے چلنے میں لطف آ رہا تھا۔ میرا بدن گرتی ہوئی پھوار کی مانند خون کے دوران سے سیراب

join eBooks Telegram

اور پُرسکون ہو رہا تھا۔ پُل پر، جہاں سے میں گذر رہا تھا، کوئی شخص جنگلے پر جھکا ہوا دریا کو تک رہا تھا، قریب سے دیکھا تو وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوعمر دبلی پتلی لڑکی تھی۔ اس کے سیاہ بالوں اور کوٹ کے کالر کے درمیان سے سرد اور نم گردن کا ایک حصہ جھانک رہا تھا جس پر نظر پڑتے ہی میرے بدن میں ایک لہر سی دوڑ گئی لیکن میں ایک لمحہ ٹھٹھک کر آگے بڑھ گیا۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے ہوا ہوگا کہ میں نے ایک آواز سُنی جو فاصلے کے باوجود، نصف شب کے سکوت میں ہیبت ناک حد تک پُرشور تھی یہ واضح طور پر ایک انسانی جسم کے پانی میں گرنے کی آواز تھی۔ میں رک گیا لیکن پلٹا نہیں۔ آواز کے ساتھ ہی فوراً ایک چیخ کی آواز آئی جو کئی بار دہرائی گئی۔ آواز پانی کے بہاؤ کے ساتھ دور ہوتے ہوتے اچانک ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جو سناٹا پھیلا وہ رات کے ناگہاں رک جانے کی طرح لامتناہی معلوم ہو رہا تھا۔ میں بھاگنا چاہتا تھا لیکن قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ میں نے خود سے کہا کہ مجھے عجلت کرنی چاہیئے لیکن ایک ناقابلِ مقاومت کمزوری نے مجھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مجھے یاد نہیں اس وقت میں نے کیا سوچا تھا" بہت دیر ہو گئی۔۔۔ فاصلہ بہت ہے" یا اسی قسم کی کچھ بات تھی۔ میں اب بھی بے حس و حرکت کھڑا خاموشی پر کان لگائے ہوئے تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میں برسات میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

لیجئے ہم آگئے۔ یہ میرا گھر ہے، میری پناہ گاہ! کل؟ ہاں، اگر آپ چاہیں۔ میں آپ کو مارکن کے جزیرے پرلے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ زوی ڈرزی (ایک دریا) دیکھ سکیں۔ تو کل ہم گیارہ بجے "میکسیکو سٹی" میں ملیں گے۔ جی؟ وہ لڑکی؟ اوہ، میں نہیں جانتا۔ واقعی میں اُسے نہیں جانتا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد کئی دن تک میں نے اخبارات نہیں دیکھے۔

گڑیوں کا گاؤں لگتا ہے نا؟ یہاں انوکھے پن کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن عزیز دوست میں یہاں آپ کو انوکھا پن دکھلانے نہیں لایا ہوں۔ ہر کوئی آپ کو کسانوں کے یہ عجیب سروں کے پہناوے، چوبی جوتے اور مزین و آراستہ مکانات جس میں ماہی گیر اپنا دل پسند تمبا کو پیتے ہوئے فرنیچر کی پالش کی بو میں بیٹھے ہیں، دکھا سکتا ہے۔ اس کے برعکس میں ان چند ایک افراد میں سے ہوں جو آپ کو وہ چیزیں دکھلا سکتے ہیں جو واقعی اہم ہیں۔

اب ہم بند کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس بند کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلئے تاکہ ان ضرورت سے

join eBooks Telegram

زیادہ دلکش مکانوں سے جہاں تک ممکن ہو سکے دور نکل جائیں۔ یہاں بیٹھ جائیے۔ اب بتائیے آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ خوبصورت ترین منظر نہیں ہے؟ ذرا بائیں جانب اس راکھ کے ڈھیر کو دیکھئے (جسے یہاں کے لوگ ریت کے ٹیلے کہتے ہیں!) اس بھورے رنگ کی مینڈ کو دیکھئے، یہ خاکستری ساحل جو ہمارے قدموں کے نیچے ہے، یہ سمندر جو سجّی کا محلول معلوم ہوتا ہے اور جس کے بے رنگ پانی میں وسیع آسمان جھلکتا ہے۔ واقعی ایک پچپچاتا ہوا جہنم ہے! ہر چیز افقی ہے، کوئی ابھار نہیں ہے۔ فضا بے رنگ اور زندگی مُردہ ہے۔ کیا یہ ایک عالمگیر تباہی یا ازلی بے معنویت اور معدومیت کی تصویر نہیں ہے؟ کہیں کوئی آدمی نہیں دکھائی دیتا۔ جی ہاں سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کوئی آدمی نہیں دکھائی دیتا۔ صرف آپ اور میں اس سیارے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ جو بالآخر ویران ہو چکا ہے!۔ آسمان زندہ ہے؟ ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آسمان گہرا ہوتا ہے، کمان کی طرح خم ہوتا ہے، ہواؤں کے در باز کرتا ہے اور سحابی دروازے بند کرتا ہے۔ وہ دیکھئے وہ فاختائیں ہیں۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ ہالینڈ کا آسمان لاکھوں فاختاؤں سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو اپنی اونچی اڑان کی وجہ سے نظر نہیں آتیں۔ فاختائیں جو اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی، ایک ساتھ مل کر ابھرتی یا ڈوبتی ہیں اور آسمانی فضا کو اپنے خاکستری پروں کے ہجوم سے پُر کر دیتی ہیں، جنہیں ہوا اِدھر اُدھر اڑائے پھرتی ہے۔ فاختائیں وہاں، اوپر، سال کے بارہ مہینے انتظار میں رہتی ہیں۔ زمین کے اوپر چکر لگاتی ہیں، نیچے نظر کرتی ہیں۔ وہ نیچے اترنا چاہتی ہیں لیکن نیچے سمندر، نہروں اور سائن بورڈوں سے ڈھکی ہوئی چھتوں کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ کہیں کوئی انسانی سر نظر نہیں آتا جس پر وہ اتر سکیں۔

آپ نہیں سمجھے میرا مطلب کیا ہے؟ مجھے آپ کا خیال تسلیم ہے کہ میں اب تھک گیا ہوں۔ بات کا تسلسل نہیں قائم رکھ پاتا۔ اب مجھ میں وہ سلاست اور خوش بیانی نہیں رہی جس کی داد دے کر میرے دوست خوش ہوتے تھے میں میرے دوست "صرف اصول کی بنا پر کہتا ہوں ورنہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ اب صرف میرے ساتھی ہیں، شرکائے جرم —! دوستوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے میں نے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کر لیا ہے وہ پوری نوع انسانی پر مشتمل ہیں اور نوعِ انسانی میں آپ سب سے پہلے ہیں۔ جو بھی سب سے قریب ہو وہی پہلا ہوتا ہے۔ مجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرے دوست نہیں ہیں؟ بہت آسان بات ہے۔ یہ بات میں نے اس وقت دریافت کی جب میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ اپنے دوستوں پر ایک چال چل سکوں اور ایک طرح سے انہیں اذیت دے سکوں لیکن اذیت کیسے ہوگی؟ کچھ لوگ متحیر شاید ضرور ہوں گے لیکن اذیت کوئی نہیں محسوس کرے گا۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میرا کوئی دوست نہیں اور اگر کوئی ہوتا بھی تو میرے لئے کیا فرق پڑتا؟ اگر میں خودکشی کے بعد ان کا ردِ عمل دیکھ سکتا تو یہ ناٹک واقعی اس قابل تھا کہ کھیلا جاتا۔ لیکن، عزیز دوست، زمین تاریک ہے، تابوت سخت لکڑی کا اور کفن دبیز کپڑے کا بنا ہوتا ہے جس میں سے آنکھیں کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔ روح کی آنکھیں؟ — بے شک —

join eBooks Telegram

اگر واقعی روح کا وجود ہوا اور وہ آنکھیں رکھتی ہو۔ لیکن ہمیں اس کا یقین نہیں اور ہم یہ یقین حاصل بھی نہیں کرسکتے ورنہ اس مشکل کا ایک حل مل جاتا اور آدمی کم از کم موت کے بعد اپنی اہمیت کا نظارہ دیکھ لیتا۔ آپ کے دلائل، آپ کا خلوص، آپ کے مصائب کی شدت، کوئی چیز بجز آپ کی موت کے، کسی انسان کو قائل نہیں کرسکتی جب تک آپ زندہ ہیں آپ کا معاملہ مشکوک ہے۔ آپ صرف لوگوں کے شکوک و شبہات کے حقدار ہیں۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر موت کے بعد یہ تماشا دیکھنے اور لطف اٹھا سکنے کا ذرا سا بھی یقین ہوتا تو یہ سودا اس قیمت پر سستا تھا کہ ہم مر کر اپنے دوستوں کو ان باتوں کا ثبوت فراہم کرکے ششدر کر دیتے جن کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ لیکن اپنی جان لینے کے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ کے دوستوں نے آپ کو مانا یا نہیں؟ آپ مرنے کے بعد نہ اپنے دوستوں کی عارضی حیرت اور خجالت دیکھ سکتے ہیں اور نہ خود اپنا جنازہ اٹھتا ہوا دیکھ سکتے ہیں دیر ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے۔ ایک مشکوک صورتِ حال کے وجود سے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ اپنے وجود کو ختم کردینا ہے۔

علاوہ بریں، کیا یہ بہتر صورت نہیں ہے؟ ورنہ اپنے دوستوں کی بے نیازی ہمیں موت کے بعد بھی کافی دکھ پہنچا سکتی ہے۔ ایک لڑکی کو اس کے باپ نے ایک زیادہ چالاک لڑکے سے شادی کرنے سے روکا۔ لڑکی نے باپ سے کہا "آپ کو اس کا بدلہ دینا پڑے گا" اور خودکشی کرلی۔ لیکن باپ کو کوئی بدلہ نہیں دینا پڑا۔ وہ مچھلی کے شکار کا شائق تھا اور کوئی تین ہفتوں کے بعد وہ دریا کو واپس ہوگیا تاکہ، اس کے اپنے قول کے مطابق، غم بھلا سکے۔ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ غم بھول گیا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ بھول نہ پاتا تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ خودکشی کرکے آپ اپنی بیوی کو سزا دے رہے ہیں حالانکہ آپ کی موت اسے محض آزادی دے رہی ہے۔ نہیں، یہی بہتر ہے کہ آدمی اپنی موت کے بعد یہ سب نہ دیکھے۔ اس کے علاوہ پھر وہ وجوہات بھی تو سننی پڑیں گی جو لوگ آپ کی خودکشی کا سبب بتلانے کے لئے بیان کریں گے۔ مثلاً اگر میں نے خودکشی کرلی ہوتی تو لوگ کیا کہتے! میں ابھی سُن سکتا ہوں، "بیچارے نے خودکشی کرلی کیونکہ وہ یہ برداشت نہ کرسکا۔۔۔" اُفوہ! لوگ باتیں گھڑنے میں بھی کتنے پچھڑے ہوئے ہوتے ہیں! وہ ہمیشہ یہی سوچتے ہیں کہ آدمی کی خودکشی کی ایک وجہ ہوگی حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی دو وجوہات کی بنا پر خودکشی کرے۔ لیکن نہیں، لوگوں کے دماغ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ پھر ارادی طور پر جان دینے کا فائدہ کیا؟ اتنی سی بات کے لئے اپنی جان قربان کرنا بے کار ہے کہ لوگ آپ کے بارے میں وہی رائے قائم کریں جو آپ نے خود اپنے لئے قائم کر رکھی ہے۔ ایک بار آپ زندگی سے ہاتھ دھولیں تو پھر لوگ موقعہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور آپ کے فعل کی احمقانہ اور لچر وجوہات تلاش کرلیں گے۔ شہیدوں کو صرف دو باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یا وہ بھلا دیئے جانے اور تمسخر کا ہدف بننے پر راضی

join eBooks Telegram

ہو جائیں یا پھر آلۂ کار بننا منظور کر لیں۔ ان دو کے علاوہ اور کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ کوئی آپ کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، اس کی توقع ہی فضول ہے۔

اور پھر ان سب باتوں کے علاوہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے زندگی سے محبت ہے، اتنی زیادہ محبت ہے کہ میں عدمِ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح کا حریصانہ پن ممکن ہے عامیانہ معلوم ہوتا ہو۔ کیونکہ اُمرا اور خواص کا طبقہ اپنے آپ کو خود سے اور خود اپنی زندگی سے تھوڑے بہت فاصلے پر رکھے بغیر گذارا نہیں کر سکتا۔ اگر ضرورت پڑے تو جان دے دے، ٹوٹ جائے مگر جھکے نہیں۔ مگر میں جھکتا ہوں کیونکہ میری اپنی ذات سے محبت برقرار ہے۔ مثلاً اب جو اتنی ساری باتیں میں نے آپ کو بتائی ہیں ان سے آپ کیا سمجھتے ہیں میں نے کس قسم کے نتائج اخذ کئے؟ اپنے آپ سے کراہت؟ جی نہیں میں تو بیشتر اوقات اوروں سے ہی متنفر رہا۔ اس میں شک نہیں مجھے اپنی کوتاہیوں کا علم تھا اور ان کا مجھے افسوس بھی رہا لیکن اس کے باوجود ان کو بھلا دینے کے سلسلے میں میری زود فراموشی پتھر کی طرح اٹل تھی۔ اور دوسری طرف اس کے برعکس دوسروں کا احتساب میرے دل کے اندر برابر جاری رہا۔ یقیناً ــــ شاید یہ بات آپ کو بُری لگی ــــ شاید آپ کی دانست میں یہ بات کچھ معقول نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن سوال معقول بنا رہنے کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ آدمی کس طرح چھپ کر نکل سکے اور سب سے بڑھ کر ــــ جی ہاں، سب سے بڑھکر ــــ یہ کہ آدمی کس طرح فیصلے سے بچ نکلے۔ میں سزا سے بچنے کی بات نہیں کر رہا ہوں ـ فیصلے کے بغیر سزا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اس کا ایک نام ہوتا ہے۔ ایسی سزا ہماری معصومیت کی ضمانت ہوتی ہے، اس سزا کو بدنصیبی کا نام دیا جاتا ہے۔ معاملہ سزا سے نہیں فیصلہ سے بچنے کا ہے۔ فیصلہ کی زد میں آکر، کسی سزا کے اعلان کے بغیر، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قصوروار ٹھہر جانے سے بچنا اہم بات ہے۔

لیکن اس سے بچنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آج کل ہم لوگ فیصلہ صادر کرنے کے لئے بھی اتنی ہی آسانی سے تیار رہتے ہیں جتنی کہ زنا کاری کے لئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موخر الذکر کی طرح یہاں اپنی کوتاہیوں کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو میری اس بات پر یقین نہ ہو تو اگست کے مہینے میں کسی بھی گرمائی ہوٹل کو چلے جایئے اور وہاں میز دل پردہ گفتگو سنئے جو ہمارے فیاض ہم شہر اپنی اکتاہٹ کے ازالہ کے لئے کرتے ہیں۔ اگر آپ اب بھی حیص بیص میں ہیں تو ہمارے اس وقت کے عظیم آدمیوں کی تحریریں پڑھئے۔ یا پھر اپنے خاندان پر نظر ڈالئے، کچھ باتیں آپ کو خود بخود معلوم ہو جائیں گی۔ میرے عزیز دوست، لوگوں کو کوئی موقعہ، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اب نہیں دینا چاہیئے کہ وہ ہم پر فیصلے کے لئے بیٹھ سکیں۔ ورنہ ہم چیتھڑوں میں پھر یں گے۔ ہم وہی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہیں جو شیروں کو سدھانے والا اختیار کرتا ہے: پنجرے میں جانے سے پہلے اگر ڈاڑھی بناتے ہوئے اس کے چہرے پر زخم آ گیا ہے تو پھر وہ درندوں کے لئے ذائقہ تر

join eBooks Telegram

بن جاتا ہے۔ یہ سب مجھ پر اس دن کھلا جس دن میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید میں اتنا قابلِ تعریف آدمی نہیں ہوں۔ بس اس کے بعد میں مشکوک ہو گیا۔ میرے جسم سے تھوڑا سا خون نکل رہا تھا اب درندوں سے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ مجھے بھنبھوڑ کر کھا جاتے۔

اپنے ہم عصروں سے میرے تعلقات بظاہر حسبِ معمول تھے۔ لیکن اندرونی طور پر ان میں فرق آ گیا تھا۔ میرے دوست بدلے نہیں تھے۔ موقعہ ملنے پر اب بھی وہ میری صحبت سے تحفظ اور توازن کا احساس حاصل کرتے لیکن میں اب صرف اس انتشار اور بے سرے پن سے آگاہ تھا جو میری ذات کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ میں تنہا اور غیر محفوظ محسوس کرنے لگا تھا جیسے برسرِ عام مجھ پر مقدمہ چلانے کے لئے مجھے عوام کے سپرد کر دیا گیا ہو۔ اب میرے ساتھی میرے لئے وہ باعزت لوگ نہیں رہے تھے۔ جن کا میں عادی تھا۔ وہ دائرہ، جس کا میں مرکزی نقطہ تھا، ٹوٹ چکا تھا اور میرے ساتھی اس طرح ایک قطار میں کھڑے ہو گئے تھے جس طرح عدالت میں منصفوں کی قطار بیٹھتی ہے۔ جس لمحہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میری ذات میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے، اس لمحے سے میرے ساتھی میرے لئے ایسے منصف کی حیثیت اختیار کر گئے جن کا محبوب ترین مشغلہ احتساب کرنا اور فیصلہ دینا تھا۔ ویسے وہ سب پہلے ہی کی طرح تھے لیکن وہ ہنس رہے تھے۔ یا مجھے یوں لگتا تھا کہ میں جس کسی سے ملتا ہوں وہ ایک خفیہ تبسم سے میری طرف دیکھتا ہے۔ مجھے ان دنوں یہ گمان بھی رہنے لگا کہ لوگ مجھے اڑنگا لگا کر گرانا چاہتے ہیں بلکہ دو ایک پبلک مقامات پر داخل ہوتے ہوئے میرے پیر لڑکھڑا گئے تھے اور ایک بار تو میں فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میرے اندر جو فرانسیسی موجود ہے اس نے جلد ہی مجھے بڑھ کر سہارا دیا اور ان حادثات کو اس واحد قابلِ فہم قدرت سے منسوب کیا جسے اتفاق کہا جاتا ہے۔ تاہم میری بے اعتمادی برقرار رہی۔

ایک بار توجہ اِدھر مبذول ہوئی تو پھر یہ دریافت کرنا مشکل نہ تھا کہ میرے دشمن بھی تھے۔ یہ دشمن میرے پیشے میں تھے اور میری سماجی زندگی میں بھی۔ ان میں سے چند وہ تھے جن کے ساتھ میں نے اچھا سلوک کیا تھا اور کچھ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ مجھے اچھا سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ بہر حال یہ سب فطری باتیں تھیں اور میں نے زیادہ غم و افسوس کے بغیر ہی انھیں دریافت کر لیا تھا۔ لیکن اس امر کا اعتراف قدرے مشکل اور تکلیف دہ تھا کہ ان لوگوں میں بھی میرے دشمن تھے جن سے میری شناسائی بہت ہی کم یا بالکل ہی نہیں تھی۔ میں اپنی فراست سے (جس کا اب تک آپ کو کافی ثبوت مل چکا ہو گا) یہ سمجھتا تھا کہ جو لوگ مجھے نہیں جانتے اگر جاننے لگیں تو پھر مجھے پسند کرنے سے باز نہ رہ سکیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا!! سب سے زیادہ دشمنی انہیں لوگوں سے ظاہر ہوئی جو مجھے صرف دور سے جانتے تھے اور جنھیں میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ بے شک وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میں بڑی کامیاب اور بھرپور زندگی گذار رہا ہوں اور میری زندگی میں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور قابلِ معافی نہیں تھا۔ کامرانی کا احساس

join eBooks Telegram

ایک خاص انداز سے ظاہر ہو تو احمق سے احمق آدمی بھی بُرا مان جاتا ہے۔ پھر میری زندگی اتنی بھرپور اور مصروف تھی کہ وقت کی کمی کے باعث کئی ایک کی پیش قدمیوں کو قبول کرنے سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے انکار کو بھول جاتا اور اس کا سبب بھی فرصت کی کمی تھی لیکن جو لوگ پیش قدمی کرتے تھے ان کی زندگیاں اتنی بھرپور نہیں ہوتی تھیں اور اسی لئے وہ میرا انکار یاد رکھتے تھے۔

بس یہ معاملہ تھا جو آخرکار مجھے مہنگا پڑا۔ ایک مثال کے لئے عورتوں کو ہی لے لیجئے۔ جو وقت میں ان پر صرف کرتا تھا وہ وقت مردوں کو نہ دے سکا اور انہوں نے میرا یہ قصور معاف نہیں کیا۔ اب بتایئے میں کیا کرتا؟ آپ کی خوشیاں اور فتوحات صرف اس وقت درگذر کی جا سکتی ہیں جب آپ ان میں دوسروں کو بھی فیاضی سے شریک کرنے پر راضی ہوں۔ مگر خوش رہنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے بارے میں زیادہ پریشان نہ ہو۔ نتیجہ یہ کہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ خوش رہو اور سزا پاؤ یا سزا نہ پاؤ اور ناخوش رہو۔ میرے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی بے انصافی ہوئی تھی کیونکہ مجھے اپنی گذشتہ کامرانیوں پر مردود ٹھہرایا گیا تھا۔ طویل عرصے تک میں نے اپنے اور دنیا کے درمیان ایک مجموعی سمجھوتے کے دھوکے میں زندگی گذاری حالانکہ چاروں طرف سے مجھ پر فیصلوں، تیروں اور استہزاؤں کی بارش ہو رہی تھی، لیکن مسکراہٹ کے ساتھ اور غیر محسوس طور پر۔ جس دن پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا اس دن کے بعد پھر ہر چیز واضح ہو گئی۔ میں نے تمام چوٹیں بیک وقت کھائیں اور میری طاقت فوری جواب دے گئی۔ اور اس کے بعد ساری کائنات مجھ پر ہنسنے لگی۔

یہ وہ چیز ہے جسے کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ (سوائے ان لوگوں کے جو حقیقتاً زندہ نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر دانشمند لوگ) کینہ بازی، خودنمائی کا واحد ممکن ذریعہ ہے۔ لوگ دوسروں پر فیصلہ صادر کرنے میں عجلت اس لئے کرتے ہیں کہ کہیں خود ان پر فیصلہ نہ صادر ہو جائے۔ اس صورت حال میں کیا توقع رکھی جائے؟ ہر انسان کے ذہن میں بجد فطری طور پر، جیسے وہ اس کی فطرت ہی کا ایک جزو ہو، جو خیال آتا ہے وہ اس کی اپنی معصومیت کا خیال ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم سب لشن دال کے اس چھوٹے فرانسیسی کی مانند ہیں جو جیل خانے کے کلرک سے (جو خود بھی قیدی تھا) اس بات پر مصر تھا کہ وہ اپنے رجسٹر میں اس کی شکایت کا اندراج کرے۔ کلرک جو اس نئے قیدی کی آمد ریکارڈ میں درج کر رہا تھا ہنس پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی ہنسنے لگے اور انہوں نے فرانسیسی سے کہا "فضول بات ہے، بڑے میاں، یہاں کوئی شکایتیں نہیں درج کرواتا۔"

"لیکن جناب" فرانسیسی نے کہا۔ "آپ یہ تو دیکھئے کہ میرا معاملہ غیر معمولی ہے۔ میں بے گناہ اور معصوم ہوں!"

ہم سب کے معاملات غیر معمولی ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کسی بھی قیمت پر معصوم کہلائے جانے پر مصر ہے۔ خواہ اس کے لئے پوری نوعِ انسانی اور ساری کائنات

join eBooks Telegram

کو بھی کیوں نہ ملزم قرار دینا پڑے۔ اگر آپ کسی آدمی کو اس کی ان کاوشوں کی داد دیں جن کی وجہ سے وہ اتنا ذہین اور فیاض بن سکا ہے تو وہ آدمی آپ کی اس تعریف کو سنکر خوش نہیں ہوگا۔ اس کی بجائے اگر آپ اس کی طبعی فیاضی کی داد دیں تو مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا اُٹھے گا۔ کسی مجرم سے آہستہ سے کہئے کہ اس کے جرم میں اس کے کردار یا فطرت کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ ساری ذمہ داری چند افسوسناک حالات اور واقعات پر عائد ہوتی ہے اور پھر آپ کے لئے اس کی شکر گزاری کا عالم دیکھئے۔ اپنے وکیل کی تقریر کے دوران میں یہی تو موقعہ ہوتا ہے جہاں مجرم رو پڑتا ہے۔ حالانکہ پیدائشی طور پر ایماندار یا ذہین ہونا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح فطرتاً مجرم پیدا ہوتے ہیں بھی آدمی کی اپنی کوشش کا اتنا ہی کم دخل ہوتا ہے جتنا حالات کے دباؤ سے مجرم بننے میں۔ لیکن یہ بدمعاش تو بہانہ چاہتے ہیں، غیر ذمہ داری کا اور نہایت بے شرمی سے فطرت یا حالات کا عذر تراش لیتے ہیں خواہ اصل صورت حال بالکل برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں معصوم سمجھا جائے ان کی خوبیاں جو پیدائشی ہیں، معرض بحث نہ بنائی جائیں اور ان کی غلط حرکتیں جو ایک وقتی بدنصیبی کا نتیجہ ہوتی ہیں، عارضی سمجھی جائیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا، یہ سب فیصلہ کو ٹالنے کا معاملہ ہے۔ چونکہ ٹالنا مشکل ہے اور خود کو لائق تحسین اور قابلِ معافی، دونوں بیک وقت، ظاہر کرنا ذرا پیچیدہ مسئلہ ہے اس لئے سب کے سب دولت مند ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں؟ کبھی آپ نے خود سے پوچھا ہے؟ ظاہر ہے اقتدار کے لئے۔ خصوصاً اس لئے کہ دولت آپ کے خلاف ہونے والے فوری فیصلوں کے مقابل ڈھال کا کام دیتی ہے، زمین دوز راستوں کے ہجوم سے نکال کر آپ کو کرومیم کی چمکتی ہوئی کار میں حصار بند کر دیتی ہے۔ وسیع، محفوظ، سبزہ زاروں میں پہنچا دیتی ہے، فرسٹ کلاس کیبنوں میں لے جا کر بٹھاتی ہے دولت، میرے عزیز دوست، آدمی کو بری تو نہیں کرتی لیکن اس کے وقت مقررہ کو ملتوی ضرور کر دیتی ہے اور یہ مہلت اس قابل ہے کہ اس کے لئے آدمی سعی کرے۔

سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھئے کہ جب آپ کے دوست آپ سے مخلصانہ صاف گوئی کی درخواست کریں تو آپ محتاط رہیں۔ کیونکہ ان کو آپ سے صرف اتنی توقع ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے بارے میں جو اچھی رائے قائم کر رکھی ہے اسے آپ کی جانب سے مزید تقویت ملے گی کیونکہ انہوں نے پہلے ہی آپ سے خلوص کا وعدہ لے لیا ہے۔ خلوص کس طرح دوستی کی شرط بن سکتا ہے؟ صداقت کا شوق تو ایک ایسا جذبہ ہے جو نہ کسی چیز کو بخشتا ہے اور نہ کوئی چیز اس کی مقاومت کرتی ہے۔ یہ ایک عیب ہے جو کبھی آرام دہ ہوتا ہے اور کبھی خود غرضی بن جاتا ہے لہٰذا اگر آپ کبھی ایسی صورتِ حال میں ہوں تو ہچکچایئے نہیں، سچ کہنے کا وعدہ کیجئے اور جس قدر ہو سکے جھوٹ بولئے۔ آپ اپنے دوستوں کی پوشیدہ تمنا کی

join eBooks Telegram

تسکین کا باعث بنیں گے اور اپنی محبت کا دگنا ثبوت دیں گے۔

— یہ بات اتنی سچی ہے کہ ہم کبھی ان لوگوں کو اپنا راز دار نہیں بناتے جو ہم میں سے بہتر ہوں بلکہ ایسے لوگوں کی صحبت سے ہم گریز کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم اپنے اعترافات زیادہ تر ایسے لوگوں کے سامنے کرتے ہیں جو ہم جیسے ہوں اور ہماری جیسی کمزوریاں رکھتے ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری خواہش اپنے آپ کو بہتر بنانے یا اپنی اصلاح کرنے کی نہیں ہوتی کیونکہ اس کے لئے ہمیں پہلے اپنے احتساب کی اور اپنے آپ پر کسی کو فیصلہ کے لئے مقرر کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ لوگ ہم سے ہمدردی کریں اور ہم نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا ہے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ہم بیک وقت فردِ جرم سے آزاد بھی رہنا چاہتے ہیں اور تزکیۂ جرم کی کوئی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتے۔ نہ حسبِ ضرورت کلبیت ہے اور نہ حسبِ ضرورت نیکی۔ ہم میں نہ برائی کیلئے پوری توانائی ہے اور نہ نیکی کیلئے۔ آپ دانتے سے واقف ہیں؟ واقعی؟ پھر تو آپ کو پتہ ہوگا کہ دانتے غیر جانبدار فرشتوں کے تصور کا قائل تھا جو خدا اور شیطان کے درمیان جنگ میں کسی ایک کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ انہیں اعراف میں رکھتا ہے جو جہنم کی پیش دہلیز ہے ہم سب اسی پیش دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں۔

صبر؟ شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یوم الحساب کے انتظار کے لئے صبر کی یقیناً ضرورت ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم جلدی میں ہیں اتنی جلدی میں کہ مجھے اپنے آپ کو شرمسار منصف (JUDGE-PENITENT) بنانا پڑا۔ پہلے تو مجھے اپنی دریافتوں کے ساتھ اپنی جگہ بدلنی پڑی اور اپنے ہم عصروں کے استہزا کو قبول کرنا پڑا۔ اس شام سے جب کہ مجھے بلاوا آیا تھا۔ یقیناً مجھے بلایا گیا تھا — میں جواب دینے یا جواب کی تلاش میں منہمک ہو گیا تھا۔ یہ آسان امر نہ تھا۔ بعض اوقات میں ڈگمگا جاتا۔ پہلے تو اس مستقل ہنسی اور ہنسنے والوں نے مجھے یہ سبق سکھایا کہ اپنی ذات کے اندر جھانک کر صاف طور پر دیکھ سکوں اور یہ جانوں کہ میں سیدھا سادہ انسان نہیں تھا۔ مسکرایئے نہیں۔ یہ صداقت اتنی بنیادی نہیں ہے جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ ہم جنہیں بنیادی سچائیاں کہتے ہیں وہ دراصل محض وہ باتیں ہیں جو سب سے آخر میں دریافت ہوتی ہیں۔

بہرحال اور کچھ بھی ہو لیکن میں نے دروں بینی کے طویل عمل کے بعد انسانی وجود کے بنیادی دوغلے پن کو پالیا۔ اپنی یادداشت کی سرزمین میں کھدائی کی وجہ سے مجھے پتہ چلا کہ مجھے انکسار تے نمایاں ہونے میں، عجز نے فتوحات حاصل کرنے میں اور خوبیوں نے جبر کرنے میں مدد دی ہے۔ میں ہمیشہ پُرامن طریقوں سے حملہ آور ہونے اور بالآخر، بے غرض ذرائع سے ہر وہ چیز حاصل کر لینے کا عادی تھا جو مجھے مطلوب تھی۔ مثلاً میں نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ میری سالگرہ کا دن نظر انداز کر دیا جاتا ہے بلکہ میں خود اس موضوع پر اتنا محتاط رہتا تھا کہ لوگ حیران ہوتے تھے اور اس حیرانی میں تحسین کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ لیکن میری بے نیازی اس سے بھی دور کی چیز ہے

join eBooks Telegram

نظر رکھتی تھی۔ میری تمنا تھی کہ مجھے بھلا دیا جائے تاکہ مجھے اپنے آپ سے اس کی شکایت کرنے کا موقع ملے۔ اس مشہور تاریخ سے دو جو مجھے بخوبی معلوم تھی) کئی دن پہلے میں چوکنا ہو جاتا اور پوری احتیاط برتتا تھا کہ کوئی ایسی غلطی نہ ہو جس کی وجہ سے لوگوں کی یادداشت اس طرف مبذول ہو جائے۔ ان کی یادداشت کی کمزوری پر تو میرا تکیہ تھا۔ (ایک بار تو میں نے اس مقصد کے لئے اپنے ایک دوست کے کیلنڈر میں تبدیلی تک کا ارادہ کیا تھا) جب میری تنہائی کلی طور پر ثابت ہو جاتی تو پھر میں ایک عجیب لذت کے ساتھ خود ترسی کے تند رو دھارے پر بہہ نکلتا۔

اس طرح میری تمام خوبیوں کا ایک دوسرا نسبتاً کم شاندار، رُخ بھی تھا۔ یہ سچ ہے کہ دوسرے معنوں میں میری خامیاں میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ مثلاً اپنی زندگی کے گھناونے پہلو کو پوشیدہ رکھنے کے لئے مجھے اپنے چہرے پر جو سرد مہری کا تاثر قائم رکھنا پڑتا تھا۔ اسے نیکی کے تاثر سے تعبیر کر لیا جاتا تھا۔ میری بے نیازی نے مجھے محبوب بنایا اور میری خود غرضی فیاضیوں پر منتج ہوئی۔ میں یہاں بس کرتا ہوں کیونکہ اور زیادہ آگے بڑھنے سے بات بگڑ جائے گی۔ لیکن یہ طے ہے کہ میں نے اپنے ظاہر پر درشتگی کا خول چڑھائے رکھا مگر کبھی شراب یا عورت کی دعوت کو رد نہ کر سکا! مجھے چست اور توانا آدمی سمجھا جاتا تھا اور میری سلطنت میرا بستر تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنی وفاداری کا اشتہار دیا لیکن میں نہیں سمجھتا کوئی ایسا شخص ہوگا جس کے ساتھ میں نے محبت کرنے کے بعد بالآخر دغا نہ کی ہو۔ لیکن یہ بے وفائیاں کبھی میری نمک حلالی کے راستے میں نہیں آئیں۔ فرصت اور کاہلی کے متواتر وقفوں میں میں کافی کام چکا دیتا تھا۔ اپنے پڑوسی کے کام آ کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے اس کی بدولت میں نے کبھی اپنے پڑوسی کی مدد سے جی نہیں چرایا۔ لیکن ان باتوں کو باربار دہرانے کے باوجود مجھے ان سے محض عارضی اور سطحی دلاسا ملتا تھا۔ کئی صبحیں ایسی آئیں کہ میں اپنی ذات کے خلاف مقدمہ دائر کرتے ہوئے بیدار ہوتا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ تحقیر و تضحیک میرے سب سے بڑے ہتھیار ہیں۔ وہی لوگ جن کی میں نے سب سے زیادہ مدد کی تھی میرے لئے سب سے زیادہ قابلِ تحقیر تھے۔ میں بڑے اخلاق کے ساتھ، جذبے سے معمور استواری کے ساتھ، ہر روز اندھوں کے منہ پر تھوکتا رہا۔

مجھے صاف صاف بتایئے، کیا اس کا کوئی جواز ہے؟ ایک جواز تو ہے لیکن اتنا نکما کہ اُسے اپنی مدافعت میں پیش کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بہرحال اسے آپ کے سامنے رکھے دیتا ہوں۔ میں درحقیقت کبھی بھی اس بات کا یقین نہ کر سکا کہ انسانی امور سنجیدہ معاملات تھے۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ سنجیدہ چیز کہاں ہو سکتی ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ کم از کم میرے اردگرد کہیں اس کا وجود نہ تھا اور جو کچھ میرے اردگرد موجود تھا وہ مجھے ایک محظوظ کن یا تھکا دینے والا کھیل معلوم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں میں نے ایسے عقائد اور کوششیں بھی دیکھیں جو کبھی میری سمجھ میں نہ آسکیں۔ میں ہمیشہ حیرت اور تھوڑے بہت شک کے ساتھ

ایسے عجیب لوگوں کو دیکھا کرتا تھا جن میں سے کسی نے دولت کے لئے جان دے دی تھی، کوئی کسی مقام یا منصب کے چھن جانے کی وجہ سے دل برداشتہ ہو گیا تھا اور کسی نے اپنے خاندان کی خوشحالی کی خاطر اپنے آپ کو بڑے عظیم و ارفع انداز میں ڈرامائی طور پر قربان کر ڈالا تھا۔ ان سب لوگوں کے مقابلے میں میں اپنے ایک دوست کو بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا جس نے سگریٹ نوشی چھوڑ دینے کی کوشش کی اور اپنی قوت ارادی کی وجہ سے اس عادت کو ترک کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک دن صبح اس نے اخبار کھولا تو ہائیڈروجن بم کے پھٹنے کی خبر آئی ہوئی تھی۔ بم پھٹنے کے شاندار نتائج کی تفصیلات پڑھ چکنے کے بعد میرے دوست نے باہر نکل کر سیدھا سگریٹ کی دکان کا رُخ کیا۔

ویسے میں نے کبھی کبھی زندگی کو سنجیدگی سے اختیار کرنے کا بہروپ بھی بھرا ہے۔ لیکن بہت جلد سنجیدگی کا طفلانہ پن مجھ پر ظاہر ہو جاتا اور میں اپنا رول حتیٰ الامکان بہتر طور پر انجام دینے کی طرف متوجہ ہو جاتا میں نے کئی رول ادا کئے۔ کارگزار، ذہین، نیک، اچھا شہری، صدمہ زدہ، ناز اٹھانے والا، ذمہ دار، اعلیٰ دماغ غرض کہاں تک گنواؤں۔ آپ اب تک سمجھ چکے ہوں گے کہ میں اپنے ان ولندیزی کھائیوں کی طرح تھا جو یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی یہاں ہیں۔ میں جہاں جسمانی طور پر موجود ہوتا وہیں صحیح معنوں میں غیر حاضر رہتا میں کبھی واقعی مخلص اور گرم جوش نہیں رہا سوائے دو ایک موقعوں کے جب میں کھیل کود سے دلچسپی رکھتا تھا یا فوجی ملازمت کے زمانے میں ہم لوگ محض اپنی تفریح کی خاطر ڈرامے کرتے تھے جن میں میں حصہ لیا کرتا تھا ان دونوں کھیلوں میں ایک ایسا قاعدہ تھا جو سنجیدہ اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن اسے سنجیدہ سمجھ کر اختیار کرنے میں ہمیں لطف آتا تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے بھر پور تھیٹر اور اسٹیڈیم جہاں اتوار کے کھیل تماشے ہوتے ہیں جنہیں میں نے بے مثال عقیدت سے چاہا ہے۔ آج بھی وہ واحد جگہیں ہیں جہاں میں اپنے آپ کو معصوم محسوس کرتا ہوں۔ لیکن محبت، موت اور مزدوروں کی اجرت کے مسائل کے ساتھ ایسے طرزِ عمل کو کون جائز قرار دیگا؟ اور پھر کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ آئی سولڈے کی محبت کا میں صرف ناولوں میں اور اسٹیجوں پر تصور کر سکتا تھا۔ بعض اوقات مجھے ایسا لگتا جیسے بسترِ مرگ پر آخری سانسیں لینے والے لوگ اپنے رول سے بہت مطمئن ہیں۔ میرے موکل بیچارے جس قسم کی باتیں کرتے تھے وہ بھی اسی قبیل کی معلوم ہوتی تھیں۔ چنانچہ لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی دلچسپیوں میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے میں کبھی اپنے وعدوں پر یقین کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا میں اتنا خوش اخلاق اور آرام طلب تھا کہ مجھے ان توقعات کے پورا کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی جو میرے پیشہ میں، میرے خاندان کی طرف سے یا بحیثیت شہری مجھ سے وابستہ کی جاتی تھیں۔ میں ہر رول کامیابی سے ادا کرتا تھا لیکن ایسی بے نیازی کے ساتھ جو ہر چیز کو بگاڑ دیتی تھی۔ میں نے ساری زندگی ایک دُہرے

join eBooks Telegram

ضابطے کے تحت ترتیب دی تھی۔ میرے سنجیدہ ترین افعال وہ ہوتے تھے جن میں میری ذات کم سے کم شامل ہوتی تھی۔ کہیں یہی تو وہ چیز نہ تھی جس کے لئے (اپنی ساری غلطیوں پر ستزاد) میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر سکا اور جس نے مجھے اس فیصلے کے خلاف شدت سے بغاوت پر اکسایا جو میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھ میں اور میرے ارد گرد تشکیل پا رہا ہے اور جس نے مجھے فرار کی تلاش پر مجبور کیا ؟

کچھ عرصہ تک میری زندگی بظاہر اسی طرح چلتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں پٹڑی پر تھا اور پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کی داد و تحسین، گویا ایک خاص مقصد کے تحت، بڑھتی گئی۔ اور یہیں سے خرابی پیدا ہوئی۔ آپ کو کسی کا یہ مقولہ یاد ہوگا "بڑا بدنصیب ہے وہ آدمی جس کا ذکر سارے لوگ اچھے الفاظ میں کرتے ہوں۔" جس کسی نے بھی یہ مقولہ کہا ہو، بڑی بصیرت کی بات کہی ہے! تو یہ میری بدنصیبی تھی! نتیجۃً پٹڑی پر دوڑنے والے انجن میں ناقابل فہم خرابیاں اور اس کی رفتار میں وقفے پیدا ہونے لگے۔

اسی وقت میرے ذہن میں موت کا خیال یکایک پیدا ہوا۔ اور میں ان برسوں کا شمار کرتا جو ابھی میرے خاتمے کے درمیان حائل تھے۔ میں ان لوگوں کی مثالیں تلاش کرتا جو میرے ہم عمر تھے اور کبھی کے مر کھپ چکے تھے۔ اور یہ خیال مجھے اذیت دیتا کہ شاید مجھے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے وقت نہ مل سکے۔ کونسا مقصد؟ اس کا مجھے خود علم نہ تھا۔ صاف بات تھی، میں کر ہی کیا رہا تھا جو تکمیل کو پہنچانے کے قابل ہوتا! لیکن بات صرف اتنی نہ تھی۔ ایک مضحکہ خیز خوف میرا تعاقب کر رہا تھا۔ آدمی اپنی تمام دروغ گوئیوں کا اعتراف کئے بغیر مر نہیں سکتا۔ خدا کے یا خدا کے کسی نمائندہ کے سامنے نہیں۔ میں اس سے بالاتر تھا۔ جیسا کہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ نہیں دراصل یہ آدمیوں کے سامنے، مثلاً کسی دوست، محبوبہ کے سامنے اعتراف کرنے کی ضرورت تھی۔ بصورت دیگر اگر ایک جھوٹ بھی زندگی میں پوشیدہ رہ جاتا تو موت اسے قطعی بنا دیتی۔ کسی کو اس نکتہ کے بارے میں سچائی سے واقف ہونے کا پھر موقعہ نہ ملتا کیونکہ وہ واحد شخص جو اس سے واقف تھا اس راز کو سینے میں چھپائے ہوئے دنیا سے گذر چکا ہوگا۔ ایک سچائی کا اس طرح سے قطعی طور پر خون کر دینے کا تصور مجھے چکرا دیتا تھا۔ لیکن آج، بطور جملۂ معترضہ عرض کر دوں یہی بات مجھے اندرونی طور پر خوش کرے گی۔ مثلاً یہ خیال کہ میں وہ واحد شخص ہوں جس کی ہر ایک کو تلاش ہے۔ اور میرے پاس گھر میں ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاش نے تین ملکوں کی پولیس کو حیران و سرگرداں رکھا ہے، بڑا لذیذ اور مسرت بخش تھا۔ لیکن ہم فی الحال اس کی تفصیلات میں نہ جائیں گے۔ کیونکہ اس وقت تک مجھے وہ نسخہ دستیاب نہیں ہوا تھا اور میں پریشان ہو رہا تھا۔

بہر حال میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ نسلوں کی تاریخ میں ایک آدمی کے جھوٹ سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اور پھر یہ کیسی حماقت ہے کہ ایک ایسی معمولی دھوکہ بازی کو سچائی کی روشنی میں کھینچ لانے کی کوشش

join eBooks Telegram

کی جائے جو وقت کے غاروں میں اس طرح گم ہو گئی ہو جیسے ریت کا ایک ذرہ سمندر میں گم ہو جائے۔ میں نے اپنے آپ سے یہ بھی کہا کہ جسم کی موت، جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق تھا، کافی سزا ہے، اور آدمی کو ساری خطاؤں سے بری کر دیتی ہے۔ نزع کا کرب نجات کا سامان (یعنی ہمیشہ کے لئے غائب ہو جانے کا حق) بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن ان خود تسلیوں کے باوجود میری بے کلی بڑھتی گئی۔ موت بڑی وفاداری سے میرے بستر سے لگی رہی۔ میں ہر صبح اس کی معیت میں جاگتا۔ اور لوگوں کے تعریفی و توصیفی کلمات میرے لئے روز بروز زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتے گئے۔

اور ایک دن ایسا آیا جب میں یہ سب برداشت نہ کر سکا۔ میرا پہلا ردِعمل انتہائی شدید تھا۔ میں نے ہمیشہ جھوٹ بولا تھا اور اب اس کا انکشاف کر دوں گا اور اس سے قبل کہ یہ سارے احمق خود اس بات کو دریافت کر سکیں میں اپنی ریاکاری کا لبادہ ان کے منہ پر دے ماروں گا۔ اگر مجھے سچائی کے نام پر مشتعل کیا جائے تو میں چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔ یہ خطرہ کہ لوگ مجھ پر قہقہے ماریں گے تو میں نے پہلے ہی سے سوچ لیا تھا کہ تضحیک اور تمسخر کے ہذیانی سیلاب میں خود بھی کود پڑوں گا۔ دراصل اب بھی سارا مسئلہ فیصلہ سے بچ نکلنے کی کوشش کا ہے۔ میں قہقہوں کو اپنی طرف یا کم از کم خود کو قہقہوں کی طرف رکھنا چاہتا تھا۔ مثلاً میں نے سوچا کہ راستے پر اندھوں کو دھکا دے کر گراؤں۔ اس خیال سے جو پوشیدہ مسرت مجھے حاصل ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ میری روح کا ایک حصہ ان سے کیسی نفرت کرتا تھا۔ میں نے کئی منصوبے سوچے! بیمار کرسیوں کے ٹائر پنکچر کر دوں، مچانوں کے نیچے، جن پر مزدور کام کر رہے ہوں، جا کر "گندے عوام" کا نعرہ لگاؤں، زمین دوز راستوں میں بچوں کو طمانچے ماروں۔ میں نے ان سارے منصوبوں کے خواب دیکھے اور ایک کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا۔ یا شاید اس قسم کی کوئی حرکت میں نے کی ہو جو اب یاد نہیں آ رہی ہے۔ بہر صورت "انصاف" کا لفظ ہی مجھے عجیب طرح مغلوب الغضب کر دیتا تھا۔ میں صرف ضرورتاً اس لفظ کا استعمال عدالت میں اپنی تقریروں میں کرتا رہا۔ لیکن میں نے کھلے بندوں انسانیت پرستی کے جذبے کو للکار کر اپنا انتقام لیا۔ میں نے ایک منشور کی اشاعت کا اعلان کیا جس میں اس ظلم و ستم کی وضاحت کی گئی جو مجبور اور مظلوم لوگ شریف لوگوں پر ڈھاتے ہیں۔ ایک دن میں ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا جھینگے مچھلی کھا رہا تھا کہ ایک بھک منگے نے تنگ کرنا شروع کیا میں نے بآوازِ بلند ہوٹل کے مالک کو طلب کیا اور جب اس "حاکمِ انصاف" نے اس پر چلاتے ہوئے کہا "تم لوگوں کو کوفت میں ڈالتے ہو، ذرا اپنے آپ کو ان خواتین و حضرات کی جگہ رکھ کر تو سوچو آخر!" تو میں نے پوری طرح ان الفاظ کی تائید کی۔ اختتاماً جہاں کہیں کوئی سننے والا مل جاتا میں اس سے اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا کہ بدقسمتی سے اب اس روسی زمیندار کا رویہ اختیار کرنا ممکن نہیں رہا جس کے کردار کا میں مداح تھا۔ ان صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ جو لوگ ان کے آگے جھک کر کورنش بجا لاتے

تھے اور جو لوگ ایسا نہ کرتے تھے دونوں کی پٹائی کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ دونوں حالتوں میں ایسی بدتمیزی اور گستاخی شامل تھی جو سزا کی مستحق تھی۔ لیکن اب مجھے زیادہ خطرناک زیادتیاں نظر آرہی ہیں۔ میں نے ایک نظم "در مدح پولیس" اور ایک قصیدہ بہ عنوان "گلوٹین کی صداقت" لکھنا شروع کیا۔ اور زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو باقاعدہ ایسے مخصوص قہوہ خانوں میں جانے پر مجبور کرتا تھا جہاں ہمارے پیشہ ور انسانیت پرست اور آزاد فکر کے حامی جمع ہوتے تھے۔ میرا ماضی کا عمدہ ریکارڈ اس بات کی ضمانت تھا کہ ان حلقوں میں میرا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور وہاں بظاہر نادانستہ طور پر میں ایک آدھ ممنوعہ جملہ کہہ بیٹھتا" خدا کا شکر ہے"۔۔۔ یا کبھی صرف "یا خدا۔۔۔" کہہ دیتا۔ آپ جانتے ہیں ہمارے قہوہ خانوں کے دہریئے کیسے شرمیلے بچے ہوتے ہیں۔ میری زبان سے ان شرمناک الفاظ کے نکلتے ہی وہ سب گونگوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگتے۔ اور پھر طوفان پھٹ پڑتا۔ کچھ قہوہ خانے سے اٹھ کر باہر نکل جاتے کچھ لوگ ایک اہانت آمیز احساس کے ساتھ یوں اپنی بک بک جاری رکھتے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو اور سب کے سب مقدس پانی میں شیطان کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے۔

آپ کو یہ سب طفلانہ پن معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ ان چھوٹے موٹے لطیفوں کے پیچھے ایک زیادہ سنجیدہ وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ میں اب اس ناٹک کی بساط درہم برہم کرنا چاہتا تھا اور سب سے زیادہ میں اپنے ماضی کی اس دلخوش کن شہرت کو ملیا میٹ کرنا چاہتا تھا جس کا تصوّر تک مجھے طیش میں لے آتا تھا۔ "آپ جیسا آدمی" لوگ بڑی خوش خلقی سے کہتے اور میں سفید پڑ جاتا۔ مجھے ان کی عزت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ عزت عمومی نہیں تھی اور عمومی ہو نہ سکتی تھی۔ کیونکہ میں اس میں حصہ دار نہیں تھا۔ اس لئے یہ بہتر تھا کہ ہر چیز کو فیصلے اور عزت، دونوں کو ایک تمسخر کے لبادے میں ڈھانپ دیا جائے۔ مجھے بہر قیمت اس احساس سے گلو خلاصی حاصل کرنی تھی جو میرا دم گھونٹے دے رہا تھا۔ میں جو خوبصورت نقاب ہر جگہ اوڑھے رہتا تھا اسے چاک کر کے پھینک دینا چاہتا تھا تاکہ ساری آنکھوں کو نظر آ سکے کہ اس نقاب کے پس پشت کیا تھا۔ مثلاً مجھے اپنی ایک غیر رسمی تقریر یاد آتی ہے جو میں نے نو آموز وکلاء کی ایک جماعت کے سامنے دی تھی۔ بار کے صدر نے جماعت سے میرا تعارف کراتے ہوئے میری ایسی تعریفیں کیں کہ میں زیادہ دیر اپنی جھنجھلاہٹ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اپنی تقریر کا آغاز حسبِ توقع جوش و خروش سے کیا اور اس میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لیکن میں یکایک اس بات کی حمایت کرنے لگا کہ اتحاد ایک نظامِ دفاع کی صورت میں ہونا چاہیئے۔ سزا رسانی کے جدید اداروں نے جس چیز کی تکمیل کی ہے وہ اتحاد نہیں ہے جو ایک چور اور ایک ایماندار آدمی کا بیک وقت محاسبہ کرتا ہے تاکہ اول الذکر کو موخر الذکر کے جرائم

join eBooks Telegram

کے تلے کچل سکے۔ اس کے برخلاف میرا مدعا یہ تھا کہ چور کا دفاع ایماندار آدمی (جس کے لئے میں نے وکیل کی مثال دی تھی) کے جرائم کے انکشاف سے ہونا چاہیئے۔ میں نے اس نکتہ پر اپنے خیالات بہت وضاحت سے پیش کئے۔

"فرض کیجئے میں نے ایک ایسے قابلِ رحم شہری کا دفاع کرنا قبول کر لیا جس نے رقابت کی بنا پر قتل کا ارتکاب کیا ہے۔ میں اس کا دفاع یوں کروں گا۔ معزز اراکینِ جیوری، ذرا غور فرمائیے۔ صنفِ نازک کی خباثت کے ہاتھوں کوئی جب اپنی فطری نیکی کو آزمائش میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کا برافروختہ اور مشتعل ہو جانا کس قدر قابلِ معافی فعل ہے۔ کیا اس کی بجائے کٹہرے کے اس طرف، میری جگہ پر ہونا، زیادہ سنگین جرم نہیں ہے کہ آدمی کبھی نیک نہ رہا ہو یا کبھی دھوکہ کھانے کی نوبت کو نہ پہنچا ہو؟ میں آزاد ہوں، آپ کی زیادتیوں اور سختیوں سے بالا ہوں لیکن اس کے باوجود میں کیا ہوں؟ غرور پر آؤں تو لوئی چہاردہم، ہوسناکی میں سانڈ، غیظ و غضب میں فرعون، اور آرام طلبی اور کاہلی میں بادشاہ! میں نے کسی کا قتل نہیں کیا ہے؟ نہیں، اب تک تو یقیناً نہیں! لیکن کیا میں نے کئی ایک زندگی کے مستحق لوگوں کو موت کے گھاٹ اترتے نہیں دیا ہے؟ شاید۔ اور شاید میں دوبارہ ایسا کرنے کیلئے تیار ہوں۔ اس کے مقابلے میں اس آدمی کو دیکھئے، یہ شخص دوبارہ قتل کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ ابھی تک وہ اس حیرانی سے جانبر نہیں ہو سکا ہے کہ اس نے یہ کام کیسے کر دیا۔" اس تقریر نے میرے نوعمر ساتھیوں کو ذرا پریشان کر دیا۔ لیکن ایک لمحہ بعد انہوں نے اسے مذاق میں اڑا دینا مناسب سمجھا۔ اور پھر ان کی پریشانی غائب ہو گئی اور وہ بالکل مطمئن ہو گئے جب میں نے اختتاماً انسانی فرد اور اس کے مزعومہ حقوق کی دہائی دی۔ اس دن آخر میں میدان عادت کے ہاتھوں رہا۔

ان خوشگوار بے احتیاطیوں سے میں عام خیالات میں محض ذرا اضطراب سا پیدا کر رہا تھا۔ ان سے میں نہ عام خیالات کو پوری طرح مغلوب کر سکا تھا اور نہ خود کو۔ میری اس طرح کی گفتگو میرے سامعین پر حیرت اور رکی پریشانی کی وہ کیفیت پیدا کرتی تھی، جو اس وقت آپ پر طاری ہے ـــــ نہیں، نہیں، انکار مت کیجئے ـــ اس سے میں مطمئن نہیں ہو سکا۔ دراصل بات یہ ہے کہ اپنی برأت کے لئے اپنے آپ کو صرف مطعون کرنا کافی نہیں ہے ورنہ میں بچھڑے کی طرح معصوم ہوتا۔ اپنے آپ کو ایک خاص طریقے سے ملزم ٹھہرانے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا مکمل علم مجھے بعد میں چل کر ہوا۔ یہ طریقہ میں انتہائی بے بسی اور تنہائی سے دوچار ہونے سے پہلے دریافت نہ کر سکا۔ اس وقت تک میرا تعاقب کرنے والا قہقہہ مجھے راستہ سے ہٹاتا رہا۔ میری بے ترتیب کوششیں ایک مشفقانہ نرم دلی کی اس کیفیت کو اس قہقہے سے الگ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں جو مجھے تکلیف پہنچاتی تھیں۔

لیکن دیکھئے معلوم ہوتا ہے دریا چڑھاؤ پر ہے۔ ہماری کشتی کے نکلنے میں زیادہ دقت نہیں ہے۔ دن ختم ہو رہا ہے۔ فاختائیں اوپر اکٹھی ہو رہی ہیں، ایک دوسرے سے یوں لگی ہوئی ہیں کہ بمشکل کوئی حرکت کر رہی ہیں۔ روشنی

join eBooks Telegram

مدھم ہوتی جارہی ہے۔ کیوں نہ کچھ دیران منحوس قسم کے لمحات کا لطف اٹھانے کے لئے خاموش رہیں؟ نہیں!
میری باتیں آپ کے لئے اس سے زیادہ دلچسپی کا موجب ہیں؟ واقعی آپ بہت بااخلاق آدمی ہیں۔ علاوہ اس کے
مجھے اب آپ کے لئے دلچسپی کا باعث بننے کا خطرہ درپیش ہے۔ شرمسار منصف JUDGE-PENITENT کے
مسئلہ پر اپنے آپ کو پوری طرح واضح کرنے سے پیشتر مجھے آپ سے زنا کاری اور عیاشی کے متعلق بات کرنا ہے۔

آپ کا خیال غلط ہے، کشتی پوری تیزی سے چل رہی ہے۔ لیکن زوئی ڈرزی ساکت اور تقریباً مُردہ سمندر
ہے۔ اس کے مسطح ساحلوں کی وجہ سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ شروع کہاں سے ہوتا ہے اور ختم کہاں۔ منظر کی یکسانی کی وجہ
سے ہمیں اپنی رفتار کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں لیکن باہر ہر چیز ویسی کی ویسی ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہے
اس طرح کا بحری سفر دراصل خواب دیکھنے کی مانند ہوتا ہے۔

یونانی مجمع الجزائر میں اس کے بالکل برعکس محسوس ہوتا ہے۔ افق پر مسلسل نئے جزیرے اُبھرتے رہتے ہیں۔
اور ان کی بے برگ درخت چوٹیاں آسمان کی حدود قائم کرتی ہیں۔ پتھریلے ساحل سمندر کے تقابل میں نمایاں
رہتے ہیں اور ہر چیز واضح اور صاف ہوتی ہے۔ تیز روشنی میں ہر چیز دورانِ سفر میں گزرتے ہوئے نشانات
کا بدل ہوتی ہے۔ اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھے ہوئے، جو کبھی ڈگمگ ڈول جاتی ہے، مسلسل ایک جزیرے
سے دوسرے جزیرے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ہم ہلکی سرد موجوں کے مضطرب سینے
پر سوار، جھاگ اور ہنسی بکھیرتے ہوئے، کشتیوں کی دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں۔ بس، موسیو! اسی دن سے
یونان میرے وجود کے اندر، میری یادوں کی سطح پر مسلسل تیرتا پھرتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔ ذرا رکئے۔ میں بہکنے لگا ہوں
نہیں۔ واقعی آپ مجھے اس طرح شاعری نہ کرنے دیجئے۔

ویسے کیا آپ یونان گئے ہیں؟ نہیں؟ چلئے، اچھا ہی ہوا۔ میں تو کہتا ہوں ہم وہاں ہوتے تو کرتے
بھی کیا؟ وہاں ہمارا کیا کام؟ وہاں تو پاک اور مصفّا قلوب کی ضرورت ہے۔ آپ جانتے ہیں وہاں دوستوں
کے جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں؟ جی ہاں، عورتیں گھروں پر ہی رہتی ہیں۔
آپ اکثر کسی ادھیڑ عمر کے معزز آدمی کو، چہرے پر مونچھوں کی اچھی خاصی باڑھ جمائے ہوئے ہاتھ کی
انگلیاں اپنے دوست کی انگلیوں میں پھنسائے ہوئے سڑکوں پر سنجیدگی کے ساتھ چلتا ہوا دیکھیں گے

join eBooks Telegram

مشرق میں بھی بعض اوقات یہ منظر دکھائی دیتا ہے؟ میں انکار نہیں کرتا لیکن یہ بتائیے کیا آپ پیرس کی سڑکوں پر اس طرح اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ لئے ہوئے چل سکیں گے؟ ہمارے پاس شائستگی کا احساس جو ہے! یونانی جزیروں میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں اپنی تطہیر کی ضرورت پڑے گی۔ وہاں کا سمندر، وہاں کی حسین سرزمین لطیف اور شفاف ہیں۔ اور ہم ------

آئیے عرشہ پر پڑی ہوئی ان کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ غضب کا کہرا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے شاید سزا اور تکلیف کے موضوع پر اپنی بات چھوڑی تھی۔ ہاں، میں ابھی بتلاؤں گا میرا مطلب کیا ہے بالآخر اپنی ساری جدوجہد، بدتمیزی اور دیدہ دلیری کے سارے مظاہروں، اور تمام بے سود کوششوں کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ انسانوں کی محبت چھوڑ دوں گا۔ نہیں، نہیں میں نے کسی غیر آباد جزیرے کا رخ نہیں کیا کیونکہ اب کوئی ایسا جزیرہ باقی نہیں رہا ہے۔ میں نے صرف عورتوں میں پناہ لی۔ آپ جانتے ہیں عورتیں کسی کو بھی واقعی مردود نہیں ٹھہراتیں بلکہ وہ تو ہماری طاقت کو توڑنے اور ہمیں منکسر بنانے کی طرف زیادہ مائل رہتی ہیں۔ اسی لئے تو عورت ایک انعام ہے سپاہی کا نہیں بلکہ مجرم کا انعام۔ وہی اس کی آخری منزل اور ملجا اور ماویٰ ہے۔ اس کی گرفتاری عموماً عورت کے بستر پر ہی ہوتی ہے۔ جنت ارضی کا جو کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے وہ عورت ہی کی شکل میں تو ہمیں ملا ہے۔ مصیبت میں آیا تو میں بھی اپنی فطری پناہ گاہ کی طرف دوڑا۔ لیکن اب میری لچھے دار تقریریں ختم ہو چکی تھیں۔ میں اب بھی جوا کھیلتا تھا لیکن صرف عادتاً۔ اب اس کی بھی تمام ندرت جاتی رہی تھی۔ (میں اس امر کے اعتراف سے جھجکتا ہوں صرف اس خوف سے کہ چند اور ممنوعہ الفاظ نہ استعمال کرنے پڑیں) کہ ان دنوں مجھے کچھ یوں لگتا تھا جیسے مجھے محبت کی ضرورت ہے۔ ہے نا عامیانہ بات؟ بہر حال بات جو بھی ہو مجھے اندرونی طور پر ایک اذیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ایسا احتیاج جس نے مجھے مزید کھوکھلا کر دیا اور اس بات کا موقعہ دیا کہ میں کچھ تو تجسس کی وجہ سے، اور کچھ مجبوراً چند ایک تعلقات میں پھنس جاؤں مجھے چاہنے اور چاہے جانے کی اتنی ضرورت تھی کہ میں اپنے آپ کو واقعی محبت میں مبتلا سمجھنے لگا۔ بالفاظ دیگر میں ایک بیوقوف کا رول ادا کر رہا تھا۔ اب میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگا تھا جو پہلے میں ایک تجربہ کار انسان کی حیثیت سے ہمیشہ ٹال دیتا تھا، "کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" آپ جانتے ہیں موسیو، ان حالات میں عام جواب یہی ہو سکتا ہے "اور آپ"؟ اگر میں اثبات میں جواب دیتا تو مجھے پتہ چلتا کہ میں اپنے اصل احساسات سے آگے نکل گیا ہوں اور اگر انکار کر دوں تو محبت سے محروم ہو جانے کا خطرہ، جو میرے لئے تکلیف دہ ہوتا۔ جس جذبے میں مجھے آسودگی کی امید تھی وہ جذبہ جتنا زیادہ خطرے میں ہوتا اتنا ہی زیادہ میں اپنے ساتھی سے اس کی طلب کرتا۔ یہ چیز مجھے زیادہ سے زیادہ واضح عہد و پیمان کی طرف لے گئی اور میں اپنے دل سے زیادہ سے زیادہ جذبات کا تقاضہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح میں ایک دلکش مگر بیوقوف لڑکی کے لئے اس نقلی جذبے کا شکار ہو گیا۔

join eBooks Telegram

اس لڑکی نے سارے رومانی ناولوں کا اتنا وسیع مطالعہ کر رکھا تھا کہ وہ محبت کا ذکر ایسے یقینی اور قطعی انداز میں کرتی کہ کوئی انٹلکچوئل غیر طبقاتی سماج کا اس سے بہتر ذکر کیا کرتا۔ ایسا یقین اور قطعیت، آپ جانتے ہیں، متعدی ہوتی ہے میں نے بھی اسی انداز میں محبت کے بارے میں بات کرنے کی کوشش شروع کی اور بالآخر خود اپنی باتوں پر یقین کرنے لگا۔ آخر کار وہ میری داشتہ بن گئی اور میں نے محسوس کیا کہ رومانی ناولیں محبت کے بارے میں بات کرنا تو سکھا دیتی ہیں لیکن محبت کرنے کا فن نہیں سکھاتیں۔ میں نے ایک طوطے سے محبت کی تھی اور جس کے ساتھ بستر پر گیا وہ سانپ تھا۔ چنانچہ میں اس محبت کی تلاش میں دوسری طرف متوجہ ہوا وہ محبت جو کتابوں میں دکھائی جاتی ہے لیکن زندگی میں کہیں میسر نہیں ہوتی۔

لیکن مجھ میں عشق کی کمی تھی تیس سال سے زائد عرصے کے لئے میں خالصتاً اپنے آپ سے محبت میں مبتلا رہا تھا۔ ایسی قدیم عادت کے ترک ہونے کی کیا امید تھی؟ میں اسے چھوڑ نہ سکا اور عشق بازی کے معاملے میں دھانسو ہی رہا۔ میں اپنے دعووں کو ضرب دیتا رہا، بیک وقت کئی ایک محبتیں کیں بالکل اسی طرح جس طرح ابتدائی دور میں بیک وقت کئی ایک سے روابط رکھتا تھا۔ اس طرح میں نے دوسروں کے لئے اتنی زیادہ بدقسمتیاں فراہم کیں جتنی اپنے ابتدائی لطیف بے نیازی کے دور میں نہیں کی تھیں۔ شاید میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ میرا طوطا، دل برداشتہ ہو کر فاقوں کے مارے جان دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے میں عین موقعہ پر پہنچ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑنا منظور کر لیا۔ اور اس وقت تک پکڑے رہا جب تک اس کی ملاقات جزیرۂ بالی کے سفر سے واپس آنے والے اس انجینئر سے نہیں ہوئی جس کی کنپٹیاں سفید ہو رہی تھیں اور جس کی ساری صفات کا مکمل تذکرہ وہ اپنے محبوب ہفتہ وار اخبار میں پڑھ چکی تھی۔ بہرکیف میں احساسات کی ابدیت میں پاک و مطہر ہو کر گم ہو جانے کی بجائے نیکی کے راستے سے بھٹکتا رہا اور اپنے جرائم میں مزید اضافہ کرتا رہا۔ نتیجتاً میرے دل میں محبت کے خلاف ایسی شدید بیزاری پیدا ہو گئی کہ میں عشق و محبت کے گانے سن کر دانت پیسنے لگتا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک طرح سے عورتوں سے منہ موڑ لینے اور پاک صاف زندگی گذارنے کی کوشش کی۔ آخر ان کی صرف دوستی بھی تو مجھے مطمئن کر سکتی تھی۔ لیکن اس کا مطلب تھا کہ جوا ترک کر دیا جائے۔ خواہش کا عنصر غائب ہوا تو عورتیں مجھے میری توقعات سے کہیں زیادہ بور کرنے لگیں اور صاف ظاہر تھا وہ بھی مجھ سے اتنا ہی زیادہ بیزار ہو رہی تھیں۔ اب نہ جوا تھا اور نہ تھیٹر۔ میں شاید سچائی کی مملکت میں تھا لیکن سچائی، میرے عزیز دوست، بے حد اکتا دینے والی شے ہے۔

محبت اور پاکیزگی سے تنگ آ کر میں نے آخر کار اپنے آپ سے کہا کہ اب عیاشی کے سوا، محبت کے بدل کے طور پر، اور کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے۔ یہی چیز قہقہوں کو ساکت کر کے خاموشی کو بحال کرتی ہے۔

join eBooks Telegram

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، آدمی کو ابدیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ ہلکے سے سرور کی ایک مخصوص منزل پر، تمام خواہشوں سے خالی، راتیں گئے، دو طوائفوں کے درمیان لیٹے ہوئے یوں لگتا کہ امیدیں اب آزاد نہیں رہیں ایسا معلوم ہوتا کہ ذہن سارے ماضی پر محیط ہے اور جینے کا کرب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ ویسے ایک طرح سے دیکھا جائے تو میں نے ہمیشہ عیاشی میں ہی زندگی گذاری ہے کیونکہ لافانی بننے کی خواہش کبھی مجھ میں سرد نہیں ہوئی تھی۔ یہ میری فطرت کی کلید تھی اور اپنے آپ سے اس عظیم محبت کا نتیجہ بھی تھی جس کے بارے میں میں نے آپ کو بتایا ہے۔ ہاں میں ہمیشہ لافانی بننے کی تمنا میں تڑپتا رہا۔ مجھے اپنی ذات سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ اس کے نظر سے اوجھل ہونے کا میں تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ بیداری کے عالم میں، اور تھوڑی بہت خود آگاہی کے ساتھ آدمی سوچے تو ایک شہوت پرست بندر کو ابدی زندگی بخشنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور پھر مجبوراً اس ابدی زندگی کا بدل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

چونکہ میں ابدی زندگی کا خواہاں تھا، اس لئے رنڈیوں کے ساتھ سوتا رہا، رات رات بھر پیتا رہا لیکن صبح اٹھتا تو اس فانی وجود کی تلخی کڑواہٹ بن کر میری زبان پر موجود رہتی۔ مگر اس سے پہلے، کم از کم کچھ گھنٹوں کے لئے میں اس عالمِ فانی سے بہت اوپر اٹھ جاتا تھا۔ مجھے اب بھی ان راتوں کی یاد عزیز ہے جب میں ایک ناچنے والی سے ملنے کے لئے ایک گھٹیا نائٹ کلب کو جایا کرتا تھا اور وہ اپنی نوازشات سے میری عزت افزائی کیا کرتی تھی۔ ایک بار میں نے اس کی خاطر ایک داڑھی والے شیخی خورے سے لڑائی تک کر لی تھی۔ ہر رات میں شراب خانے میں چلا جاتا، اس جنتِ ارضی کی سُرخ روشنی اور دھول میں بیٹھ کر بے تکان جھوٹ بولتا اور دیر تک پیتا رہتا۔ میں سحر ہونے کے انتظار میں رہتا اور بالآخر خاتمہ میری شہزادی کے بستر پر ہوتا (جو ہمیشہ استعمال شدہ رہتا) جو میکانکی طور پر جنسی فعل میں حصہ لیتی اور کسی وقفہ کے بغیر فوراً سو جاتی۔ دن کی روشنی نرم روی کے ساتھ اس تباہی پر طلوع ہوتی اور میں اس کامرانی کی سحر میں اٹھ کر بے حس و حرکت کھڑا ہو جاتا تھا۔

شراب اور عورت نے مجھے وہ واحد تسلی بخشی جس کا میں مستحق تھا۔ میں یہ راز آپ کو بتا دوں گا۔ اور آپ بلاخوف و خطر اُسے استعمال کیجئے پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ سچی عیاشی آزادی بخش ہوتی ہے کیونکہ وہ فرائض نہیں عائد کرتی۔ اس عیاشی میں آپ پر صرف اپنی ذات طاری رہتی ہے۔ اسی لئے یہ اپنی ذات سے محبت کرنے والے عظیم عشاق کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ ایک ایسا جنگل ہے جس کا نہ ماضی ہے اور نہ حال اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس میں نہ امیدوں کا سمبندھ ہوتا ہے اور نہ کسی فوری تعزیر کا خطرہ۔ وہ جگہیں جہاں عیاشی ہوتی ہے، باقی دنیا سے جدا ہو جاتی ہیں۔ ان میں داخل ہوتے ہوئے آدمی امید اور خوف کو باہر چھوڑ آتا ہے۔ یہاں بات کرنا بھی لازمی نہیں ہے جس کام کے لئے یہاں انسان آتا ہے وہ کام الفاظ کے بغیر، بلکہ اکثر اوقات پیسے کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان گمنام

join eBooks Telegram

اور فراموش شدہ عورتوں کو اپنا ہدیۂ تکریم پیش کردں جنہوں نے اس زمانے میں میری مدد کی۔ آج بھی جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو میرے دل میں ان کے لئے عزت سے ملتا جلتا ایک جذبہ بے اختیارانہ ابھر آتا ہے۔

بہر طور میں نے اس آزادی کا کھلے بندوں فائدہ اٹھایا۔ میں ایک ایسے ہوٹل تک میں دیکھا گیا تھا۔ جو گناہ کے لئے وقف تھا۔ ان دنوں میں ایک پختہ عمر طوائف اور اعلیٰ سوسائٹی کی ایک دوشیزہ کے ساتھ بیک وقت زندگی گذار رہا تھا۔ اول الذکر کے ساتھ میرا رویہ ایک آزمودہ کار سورما کا تھا اور موخر الذکر کو میں نے زندگی کے کچھ حقائق سے آشنا ہونے کا موقع دیا۔ بدقسمتی سے طوائف کی ذہنیت شدید طور پر متوسط طبقے کی نکلی۔ بعد میں دہ سچے اعترافات شائع کرنے والے ایک کافی جدید خیال کے اخبار میں اپنے حالاتِ زندگی لکھنے پر آمادہ ہو گئی۔ کنواری لڑکی نے اپنی تندو تیز خواہشات کی تسکین اور اپنی قابلِ ذکر صلاحیتوں کو پردۂ کار لانے کی خاطر شادی کر لی۔ میں اب اس بات پر بھی کم نازاں نہیں ہوں کہ ان دنوں مجھے مردوں کی ایک انجمن میں بھی بطورِ ہم رتبہ شریک کر لیا گیا تھا جسے ان دنوں کافی برا بھلا کہا جاتا تھا۔ لیکن مجھے اس افتخار پر زیادہ اصرار نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، ذہین ترین آدمی بھی اس بات پر اتراتے ہیں کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں ایک بوتل زیادہ پی سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ اس مسرت بخش عیاشی میں بالآخر مجھے قرار اور سکون مل جاتا، لیکن یہاں بھی ایک رکاوٹ درپیش تھی اور یہ رکاوٹ بھی میری ہی ذات کی پیدا کردہ تھی۔ اس بار مسئلہ میرے جگر کی خرابی کا تھا اور ایک ایسا اضمحلال جس نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ انسان لافانی بننے کا ڈھونگ رچاتا ہے اور چند ہی ہفتوں میں یہ نوبت آ جاتی ہے کہ وہ یہ بھی بتانے کے قابل نہیں رہتا کہ دوسرے دن تک بھی جی سکے گا یا نہیں۔

جب میں نے اپنی شبانہ ترکتازیاں ختم کر دیں تو اس تجربے کا واحد فائدہ یہ ہوا کہ زندگی میرے لئے قدرے کم تکلیف دہ بن گئی۔ وہ تھکان جو اپنی چکی میں میرے جسم کو پیسے ڈال رہی تھی، اس نے ساتھ ہی ساتھ میرے اندر کئی خام پہلوؤں کی بھی تراش خراش کر ڈالی۔ ہر بے اعتدالی، توانائی میں کمی کا باعث ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ عام خیال کے برعکس، عیاشی میں دیوانہ وار دوڑ دھوپ کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک طویل عرصۂ خواب ہے۔ آپ نے غور کیا ہو گا کہ وہ لوگ جو واقعی رقابت کی آگ میں جلتے رہیں، ان کی فوری خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ اس عورت کے ساتھ ہمبستری کر لیں جسے وہ اپنی دانست میں بیوفا سمجھتے ہیں۔ بے شک، وہ اپنے آپ کو ایک بار اور یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کی متاعِ عزیز اب بھی انہیں کی ملکیت ہے۔ ملکیت کا احساس ان کے لئے اصل چیز ہے۔ لیکن یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ ملکیت کے بعد رقابت اور حسد کے احساس میں کافی کمی بھی آ جاتی ہے۔ جسمانی نقاہت جیک وقت تخیل کی پیداوار بھی ہے اور خود احتسابی کا ایک طریقہ بھی۔ ہم وہ سارے ناخوشگوار خیالات رقیب کی ذات سے منسوب کر دیتے ہیں۔ جو کبھی ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔ خوش قسمتی سے جسمانی لذتوں کی زیادتی تخیل اور احتساب دونوں قوتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ جب تک

join eBooks Telegram

ہماری توانائی برقرار ہے۔ اذیت اور کرب بھی خوابیدہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوبالغ لڑکے اپنی پہلی محبوبہ سے ملتے ہی اپنی تمام مابعد الطبعاتی بے چینیاں بھول بیٹھتے ہیں۔ اور چند ایک شادیاں، جو دراصل زنا کاری کی قانونی شکل ہوتی ہیں، جرأت اور اختراع کی ساری صلاحیتوں کو بے رنگ تابوتوں میں دفن کر دیتی ہیں۔ جی ہاں، میرے عزیز دوست، شادی کے بیہودہ ادارے نے ہمارے ملک کو اس راستہ پر ڈال دیا ہے جو جلد ہی اُسے موت کے دروازے تک پہنچا دے گا۔

کیا میں مبالغہ آرائی کر رہا ہوں؟ نہیں، لیکن میں موضوع سے بھٹک رہا ہوں۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتلانا چاہتا تھا کہ عیاشی کے ان ایام میں، میں نے کیا کیا فوائد حاصل کئے۔ میں ایک گہرا کرد دھندلکے میں زندہ تھا جس میں اس قہقہے کی آواز اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ میں نے اس پر توجہ دینی چھوڑ دی تھی۔ بے اعتنائی اور بے نیازی جو میری ذات کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھی اب کوئی مزاحمت نہیں محسوس کر رہی تھی اور بے حسی کا یہ خول اب تقریباً پوری شخصیت پر چڑھ چکا تھا۔ اب جذبات باقی نہ رہے تھے۔ ایک معتدل مزاج، یا یوں کہیے، کوئی مزاج ہی باقی نہ رہا تھا۔ دق زدہ پھیپھڑوں کا واحد علاج یہ ہے کہ انہیں معطل کر دیا جائے، اور اس طرح بتدریج ان پھیپھڑوں کے خوش قسمت مالک کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میری اپنے علاج سے پُر سکون موت واقع ہوئی۔ میں اب بھی اپنے کام پر بسر اوقات کر رہا تھا، گو میری شہرت کو میری زبان کی بے لگامی سے ناقابلِ تلافی دھکا لگ چکا تھا لیکن میرے پیشے کی باقاعدگی میری زندگی کی بدنظمی سے سمجھوتہ کئے ہوئے چل رہی تھی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ لوگ میری بدطینی سے کہیں زیادہ میری باتوں پر مشتعل ہوتے تھے۔ خدا کا خالصتاً لفظی ذکر، جو میں عدالت میں اپنی تقریروں میں کیا کرتا تھا، اس سے میرے موکلوں میں بدظنی پیدا ہونے لگی تھی۔ غالباً انہیں خوف تھا کہ خدا ان کے مفاد کی وہ ترجمانی نہیں کر سکے گا جو ضابطۂ قانون پر پورا عبور رکھنے والا ایک ناقابلِ شکست وکیل کر سکتا ہے۔ ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہ تھا کہ میرا بار بار خدا کا ذکر کرنا اس بات کا غماز ہے کہ میں اسی تناسب سے قانون سے بے بہرہ ہوں۔ میرے موکلوں نے یہ قدم اٹھایا اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد گھٹنے لگی۔ کبھی کبھار کوئی بھٹک کے آجاتا تو مجھے ایک مقدمہ مل جاتا۔ بعض اوقات جب میں یہ بھول جاتا کہ جو باتیں میں کہہ رہا ہوں ان پر خود میرا یقین نہیں ہے تو ایسے موقعوں پر میں اچھا وکیل ثابت ہو جاتا۔ صرف میری آواز میری رہنمائی کرتی اور میں اس کے پیچھے چل پڑتا۔ پہلی سی بلند پروازی تو خیر نہ ہوتی تھی ہاں دو چار زقندیں بھر کر زمین کی سطح سے تھوڑا بہت اوپر ضرور اٹھ جاتا تھا۔ اپنے پیشے کے باہر میں بہت کم لوگوں سے ملتا تھا اور دو ایک دم توڑتے ہوئے تعلقات کو بڑی مشکل سے قائم رکھے ہوئے تھا۔ اب میں محض دوستانہ قسم کی شامیں بھی گذار لیا کرتا تھا۔ جن میں خواہش کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا تھا۔ مگر اتنے سے فرق کے ساتھ کہ اپنے آپ کو اکتاہٹ کے سپرد کر کے میں نے

join eBooks Telegram

ان باتوں کو سُننا ہی چھوڑ دیا تھا جو میرے آس پاس کہی جاتی تھیں۔ میں قدرے فربہ ہوگیا تھا اور بالآخر یہ یقین کرنے کے قابل بھی ہوگیا کہ بحران ختم ہو چکا ہے۔ اب بوڑھا ہوتے جانے کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا تھا۔

ایک بار سمندر کے سفر میں میں نے اپنی ایک دوست کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ لیکن اُسے یہ خبر نہ تھی کہ میں یہ سفر اپنی صحت کی بحالی کی خاطر کر رہا تھا۔ دورانِ سفر میں ایک دن میں جہاز کے بالائی گوشہ پر تھا کہ اچانک دور، سمندر کی خاکستری سطح پر، میں نے ایک سیاہ دھبّے کو اُبھرتے دیکھا۔ میں نے فوراً منہ پھیر لیا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ دل پر جبر کر کے میں نے دوبارہ اس طرف دیکھا تو وہ دھبّہ غائب ہوگیا تھا۔ میں بیوقوفی سے مدد کے لئے چلّانے ہی والا تھا کہ پھر وہ دھبّہ نظر آیا تو پتہ چلا کہ وہ دراصل اس ملبہ کا ایک حصہ تھا جو جہاز اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکا، کیونکہ اس منظر کے ساتھ فوری طور پر مجھے ایک ڈوبتے ہوئے انسان کا خیال آگیا تھا تب میں نے محسوس کیا کہ وہ قہقہہ جو سال پہلے میرے پیچھے، دریا سین کی سطح پر بلند ہوا تھا، ابھی تک جاری ہے۔ اُسے دریا نے سمندر کے پانیوں کے سپرد کر دیا تھا جہاں سے وہ سمندر کی بے کنار وسعتوں پر تیرتا ہوا ساری دنیا میں پھیل گیا تھا، اس دن کا منتظر تھا کہ وہ دوبارہ میرے سامنے آئے۔ اور میں نے جان لیا کہ دریاؤں اور سمندر پر، ہر اس جگہ جہاں میرے بپتسمہ کا تلخ پانی پہنچا ہے وہ قہقہہ ہمیشہ میرا انتظار کرتا رہے گا۔ ویسے کیا ہم اس وقت بھی پانی پر موجود نہیں ہیں؟ یہ مسطح، اکتا دینے والا، لامحدود پانی جس کی حدیں زمین کی حدوں سے یوں ملی ہوئی ہیں کہ دونوں میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم امسٹرڈیم پہنچ سکیں؟ مقدس پانی کے اس بادیہ سے ہم کبھی بھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔ سنیئے، کیا آپ کو نظر نہ آنے والی مرغابیوں کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہیں؟ اگر وہ ہماری طرف رخ کر کے چیخ رہی ہیں تو یہ کس طرف کا بلاوا ہے؟

لیکن یہ تو وہی مرغابیاں ہیں جو اس دن بھی اوقیانوس پر آوازدے رہی تھیں، جس دن مجھے ہمیشہ کے لئے معلوم ہوگیا تھا کہ میں اپنے مرض سے صحتیاب نہیں ہوا ہوں اور بُری طرح محصور ہوں اور اب صرف حتی الامکان جیسے بن پڑے گذارہ کئے جانا ہے۔ شاندار زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر اس کے ساتھ ہی خواہش کا جنونانہ اضطراب بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب مجھے اذیت میں زندہ رہنا تھا مجھے شکست کا اور اپنے جرم کا اعتراف کرنا پڑا۔

مجھے یقین ہے کہ آپ قرونِ وسطیٰ کے اس تہہ خانے سے واقف نہ ہوں گے جس کا نام "اذیت گھر" تھا۔ کسی کو اس میں قید کرنے کا مطلب تھا کہ اب وہ آدمی ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس تہہ خانہ کو دوسرے تہہ خانوں سے ممیز کرنے والی چیز اس کے طول و عرض تھے۔ یہ نہ تو اتنا اونچا تھا کہ آدمی کھڑا ہو سکے اور نہ اتنا چوڑا کہ لیٹ سکے۔ بمشکل ایک تکونا ساز اویہ بنا کر آدمی کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس سیدھی سادھی تعمیر میں ایک جینئیس کا ذہن کارفرما تھا۔ یہ ملحوظ رکھیئے میں جینئیس کا لفظ بہت سوچ سمجھ کے استعمال کر رہا ہوں۔ روزانہ اس شکنجہ

کی جسم کو اکڑا دینے والی سختی سے سزا پانے والے قیدی کو پتہ چلتا کہ وہ مجرم ہے۔ اور بے گناہی خوشی کے ساتھ ہاتھ پیر پھیلا سکنے کا نام ہے۔ ایک ایسا شخص جو پہاڑوں کی اونچائی یا جہاز کے بالائی عرشے کا عادی ہو، کیا آپ اس کا اس تہہ خانے میں تصور کر سکتے ہیں۔ ؟ کیا ان تہہ خانوں میں رہ کر بھی کوئی معصوم رہ سکتا ہے؟ ناممکن، قطعاً ناممکن ورنہ میرے استدلال کی ساری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ معصوم لوگ اور کبڑے بن کر زندگی گذاریں! میں لمحہ بھر کے لئے بھی اس مفروضہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ علاوہ ازیں ہم کسی کی معصومیت ثابت نہیں کر سکتے، جبکہ ہم پورے ایقان کے ساتھ ہر ایک کا جرم بیان کر سکتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے تمام اشخاص کے جرم کی شہادت دے سکتا ہے، یہ میرا عقیدہ اور امید ہے۔

یقین جانئے تمام مذاہب جس دم اوامر و نواہی کے فرمان نافذ کرنے لگتے ہیں، اسی دم غلط راستے پر لگ جاتے ہیں۔ جرم کی تخلیق کرنے یا کسی کو سزا دینے کے لئے خدا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارے اپنے بھائی بند خود ایک دوسرے کے تعاون سے یہ کام کر لیتے ہیں۔ آپ "آخری فیصلہ" کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ اجازت ہو تو آپ کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ذرا ہنس لوں۔ میں "آخری فیصلہ" کا انتظار پوری ثابت قدمی سے کروں گا۔ کیونکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ بدتر چیز، یعنی انسانوں کے فیصلے کا علم ہے۔ انسانوں کی نظر میں جرم سے بری کرنے کے امکانات کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ایک نیک ارادہ بھی جرم قرار دیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے اس قید خانے کے متعلق کچھ سنا ہے جہاں قیدیوں کے منہ پر تھوکا جاتا ہے؟ انسانوں کی ایک مخصوص نسل نے یہ قید خانہ صرف یہ ثابت کرنے کے لئے ایجاد کیا تھا کہ وہ دنیا کی اعلیٰ ترین نسل ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی چہار دیواری تھی جس میں قیدی ہلے جلے بغیر صرف کھڑا رہ سکتا تھا۔ سیمنٹ کی دیوار کا دروازہ جو قیدی کی ٹھوڑی تک آتا تھا۔ باہر سے صرف اس کا چہرہ نظر آسکتا تھا جس پر گذرنے والا جیلر منہ بھر کر تھوکتا تھا۔ قیدی اس کٹہرے میں اس طرح ٹھنسا رہتا کہ اپنا چہرہ بھی صاف نہ کر سکتا تھا۔ ہاں البتہ اُسے اپنی آنکھیں بند کر لینے کی ضرور اجازت تھی! تو یہ ہے میرے عزیز، انسان کی ایجاد۔ اس چھوٹے سے شاہکار کے لئے انہیں کسی خدا کی حاجت نہیں پیش آئی۔

آپ سمجھتے ہیں اس سے کچھ نہیں ثابت ہوتا؟ خدا صرف معصومیت کی ضمانت کے طور پر کارآمد ہو سکتا تھا۔ میں مذہب کو ایک طرح سے ایک عظیم دھلائی کے کارخانے کے طور پر دیکھنے کا قائل ہوں، جیسا کہ وہ ایک مختصر عرصے یعنی تین سال کے لئے، رہا بھی ہے۔ اس وقت وہ مذہب نہیں کہلاتا تھا۔ اس کے بعد صابن کا فقدان ہو گیا۔ ہمارے چہروں پر گندگی ہے اور ہم ایک دوسرے کی ناک صاف کر رہے ہیں۔ سب کے سب پاگل اور سزا یافتہ ہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے کے منہ پر تھوکتے رہو۔ جلدی کرو، اور ابتدا اوپر کی طرف لپکو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر شخص تھوکنے میں پہل کی کوشش کرتا ہے۔ میں آپ کو یہ اہم راز بتاتا ہوں: "آخری فیصلے" کا انتظار مت کیجئے۔ آخری فیصلہ ہر روز ہوتا ہے۔

نہیں، کچھ نہیں۔ میں صرف اس کمبخت مرطوب ہوا کی وجہ سے کپکپا رہا ہوں۔ بہر حال اب ہم خشکی پر پہنچے

join eBooks Telegram

ہی والے ہیں لیجئے، یہ پہنچے۔ پہلے آپ۔ لیکن کچھ دیر اور ٹھہریئے۔ میرے ساتھ گھر تک چلئے۔ میں نے اپنا بیان ابھی ختم نہیں کیا ہے۔ مجھے اپنی بات جاری رکھنی ہے۔ دراصل بیان جاری رکھنا ہی مشکل ہے۔ اچھا یہ بتایئے، آپ جانتے ہیں وہ کس لئے مضطرب ہوا تھا! ــــ وہی، جس کے متعلق آپ اس لمحہ سوچ رہے ہیں۔ ویسے وجوہات کا ایک دفتر موجود ہے۔ کسی انسان کے قتل کی وجوہات ہمیشہ موجود رہتی ہیں، اس کے برعکس کسی کے وجود کا جواز پیش کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ جرم کو اس کی مدافعت کرنے والے ہمیشہ مل جاتے ہیں۔ لیکن بے گناہی کو اپنا وکیل کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ لیکن ان وجوہ کے علاوہ جو ہمیں پچھلے دو ہزار سال میں کافی وضاحت کے ساتھ سمجھائی گئی ہیں، اس ہولناک سانحے کا ایک اور زبردست سبب بھی تھا جسے پتہ نہیں کیوں اتنی احتیاط اور کاوش سے پوشیدہ رکھا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کلی طور پر بے گناہ اور معصوم نہیں ہے۔! اس پر جس جرم کا الزام لگایا گیا تھا وہ اس سے بری تھا لیکن اس نے دوسرے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ گو وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ جرم کیا تھا۔

لیکن کیا واقعی وہ اس جرم سے لاعلم تھا! آخر اس کی ذات ہی تو ان جرائم کا سبب تھی۔ اس نے معصوم بچوں کے قتلِ عام کا ذکر تو ضرور سنا ہوگا۔؟ جوڈیا کے وہ نوزائیدہ بچے جن کا قتلِ عام عین اس وقت ہو رہا تھا جب اس کے ماں باپ اسے ایک محفوظ مقام کی طرف لے جا رہے تھے ــــ وہ بچے کس لئے موت کے گھاٹ اتارے گئے؟ ان کی موت کا سبب اگر وہ نہیں تھا تو اور کون تھا؟ خون کے چھینٹوں سے رنگی ہوئی وردیوں والے سپاہی، وہ بے گناہ بچے جو ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے، ان سب نے اس کے دل کو دہشت اور خوف سے بھر دیا۔ لیکن وہ جس قسم کا آدمی تھا اس کے پیشِ نظر مجھے یقین ہے کہ وہ اس سانحہ کو فراموش نہ کر سکا۔ وہ اداسی جو اس کے ہر عمل سے جھلکتی تھی، ایک ایسے انسان کی ناقابلِ علاج افسردگی تھی جس کے کانوں میں ہر رات راشیل[1] کی فریاد گونجتی تھی جو زندگی کی ہر آسائش کو ٹھکرا کر اپنے بچوں کے لئے گریہ کناں تھی۔ اس کے نوحے رات کے سینے میں شگاف ڈال رہے تھے۔ راشیل اپنے بچوں کو پکارتی تھی جو اس کی خاطر قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور وہ خود ابھی زندہ تھا۔

وہ جو انسان کے بارے میں ہر بات جانتا تھا، .... جسے معلوم تھا کہ وہ کیا جانتا تھا، بھلا وہ کیسے یہ یقین کرتا کہ صرف دوسروں کی جان لینا ہی جرم نہیں بلکہ خود جان نہ دینا بھی کم جرم نہیں ہے۔ دن رات اس معصوم

---

[1] جوڈیا کے شہنشاہ ہیرو ڈ کو کاہنوں نے بتایا تھا بیت اللحم سے ایک ستارہ طلوع ہوگا اور اس رات اس کی مملکت میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر اس کے زوال کا باعث بنے گا۔ ستارہ نظر آتے ہی ہیرو ڈ نے اس رات پیدا ہونے والے سارے بچوں کو قتل کا حکم دے دیا۔ سینکڑوں بچے تہہ تیغ کئے گئے لیکن عیسیٰ کو بچا لیا گیا۔ قتل ہونے والے بچوں میں راشیل کے بچے بھی شامل تھے۔ (ایاز)

گناہ کا روبرو سامنا کرتے ہوئے جینا اس کے لئے روز بروز مشکل تر ہوتا گیا۔ اس زندگی سے قطع تعلق بہتر تھا اس نے سوچا اپنا دفاع کئے بغیر جان دیدے، تاکہ وہ اکیلا زندہ رہنے والا نہ رہ جائے اور کسی ایسی جگہ نکل جائے جہاں اسے تسلیم کیا جائے۔ لیکن اسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس نے شکایت کی۔ اور پھر یہ ہوا کہ شکایت کرنے پر اس کی مذمت کی گئی۔ یہ آخری وار تھا۔ ہاں وہ تیسرا حواری تھا جس نے اس کی شکایت کا گلا گھونٹ دیا۔ "یارب، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" کیا یہ ایک کربناک صدا نہیں تھی؟ اور پھر اس کے بعد تختۂ دار تھا! یاد رکھئے اگر لوقا نے کسی چیز کو چھپایا نہ ہوتا تو ادھر کسی کی توجہ بھی مبذول نہ ہوتی۔ بہرِ حال، اس کی، کم از کم اتنی اہمیت تو نہ ہوتی۔ احتساب ممنوعہ شے کا باآواز بلند اعلان کرتا ہے۔ دنیا کا سارا انظام اسی طرح غیر واضح اور دورُخا ہے۔ تاہم جس آدمی کی مذمت کی گئی تھی وہ متحمل نہ ہو سکا۔ مجھے معلوم ہے میں کس چیز کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب مجھے کسی لمحہ اس بات کا شمہ بھر بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ میں دوسرے لمحے تک کیسے پہنچوں گا۔ ہاں اس دنیا میں انسان جنگ چھیڑ سکتا ہے، محبت کا منہ چڑا سکتا ہے، اپنے بھائی بندوں پر ظلم ڈھا سکتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں جیے جانا، زندگی کو محض گھسیٹے جانا ایک فوق الانسانی کام بن جاتا ہے اور میری بات کا یقین کیجئے وہ فوق الانسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے کرب کی شدت کا باآواز بلند اظہار کیا اور اسی لئے مجھے اس سے محبت ہے۔ میرے دوست نے جانے بغیر جان دے دی۔ بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیں تنہا چھوڑ گیا کہ ہم ہر حالت میں، ایذادہی اور ایذارسانی کے عالم میں بھی جیے جائیں۔ ہمیں وہ سب معلوم ہے جو اسے معلوم تھا لیکن ہم وہ کرنے کے قابل نہیں ہیں جو اس نے کیا ہم اس کی طرح مر نہیں سکتے۔ آدمیوں نے قدرتی طور پر اس کی موت سے ایک مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ طے شدہ بات ہے تم بہت خوشگوار آدمی نہیں ہو۔ ہم تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ ہم بس تمہیں فوراً صلیب پر چڑھا کر ختم کر دیں گے! لیکن ان دنوں لوگ صلیب پر اس لئے چڑھتے ہیں کہ اونچائی پر ہوں تو لوگ انہیں دور دور سے دیکھ سکیں گے اور اس مقصد کے لئے صلیب پر چڑھنے میں اگر اس پر پیر بھی رکھنے پڑیں جو اتنے عرصے سے وہاں ٹنگا ہوا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بھلروی کی مشق میں لوگوں نے فیاضی کا جھگڑا ابھی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بے انصافی، کیسی عظیم بے انصافی اس بیچارے کے ساتھ ہوئی ہے۔ سوچتا ہوں تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ توبہ، انسان کتنی جلد عادت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بس گویا اب کمرۂ عدالت میں تقریر کرنے والا ہوں۔ معاف کیجئے، اور یہ بات یاد رکھئے کہ میں ایسی حرکتیں کرتا ہوں تو ان کی کچھ وجوہ بھی ہوتی ہیں۔ یہاں سے چند ایک گلیاں اور آگے نکل جایئے تو ایک میوزیم ہے جس کا نام ہے "ہمارا خداوند— بالائی کمرے میں" اس کمرے کے نیچے ان دنوں ایک زمین دوز قبرستان بھی تھا۔ یہاں تو تہہ خانوں میں سیلاب کا پانی بھر جاتا ہے۔ لیکن آج — آپ مطمئن رہیئے — ان کا خداوند نہ کمرے میں ہے اور نہ نیچے تہہ خانے میں۔ اب اسے انہوں نے اپنے دلوں کے خفیہ گوشے میں ایک منصف کی مسند پر بٹھا دیا ہے۔

join eBooks Telegram

اور خود ادا کرتے ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ، خود فیصلے صادر کرتے ہیں، مگر اس کے نام پر۔ اس نے تو ایک زانیہ سے کہا تھا: "اور نہ میں تجھے معتوب ٹھہراتا ہوں۔" لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ لوگ بخشتے کسی کو نہیں۔ اور معتوب ہر ایک کو قرار دیتے ہیں۔ خداوند کے نام پر، یہ لو، جس کے تم مستحق ہو ـــ! خداوندا! میرا دوست، اتنا سخت گیر نہ تھا۔ اس کی مانگ اتنی زیادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے لئے صرف محبت پوچھی تھی۔ اور کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں عیسائیوں میں بھی کئی ایک ایسے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ اسے یہ بات بھی پہلے ہی سے بخوبی معلوم تھی کیونکہ اس میں مزاح کی حس تھی۔ پیٹر، آپ جانتے ہیں، وہی بزدل پیٹر، اس نے جھٹلایا: "میں اس انسان کو نہیں جانتا۔ ۔ ۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیا کہتا ہے ۔ ۔ ۔ وغیرہ" اور میرا دوست الفاظ سے کھیلتا ہے۔ "تو پیٹر ہے اور اس چٹان پر میں اپنا کلیسا بناؤں گا" کیا طنز اس سے زیادہ گہرا ہو سکتا ہے؟ لیکن نہیں، فتح پھر بھی اس کی ہوتی ہے۔ اور وہ آپ سے کہتے ہیں۔ "دیکھئے خود اسی نے کہا ہے!" بے شک اسی نے کہا ہے۔ وہ معاملہ کی اصلیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر وہ لوگوں کو مواخذہ کرنے اور معتوب قرار دینے کے لئے چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا۔ لوگوں کے پاس ہونٹوں پر معافی کے الفاظ اور دلوں میں سزا کے فیصلے باقی رہ گئے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رحم کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔ نہیں، خدا کی قسم رحم کا ذکر کرتے ہوئے ہم تھکتے نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اب کسی کو برأت نہیں ملتی۔ معصومیت کے مُردہ جسد کے ارد گرد منصفوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ان میں ہر قسم کے منصف شامل ہیں۔ وہ جو مسیح کے حامی ہیں اور وہ بھی جو اس کے مخالف ہیں۔ لیکن دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ایذا دہی کے معاملے میں سب ایک سمجھوتے پر متفق ہیں۔ ہر معاملے میں عیسائیوں کو بالکلیہ موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے کیونکہ اس میں دوسرے بھی شامل ہیں۔ آپ کو پتہ ہے اس مکان کا کیا حشر ہوا جس میں کبھی ڈیکارٹ رہا کرتا تھا؟ اب وہاں پاگل خانہ ہے۔ جی ہاں ایک عام ہذیان اور ایذا دہی۔ ہم بھی، قدرتی طور پر وہاں پہنچنے پر مجبور ہیں۔ آپ نے اب تک یہ بات محسوس کر لی ہو گی کہ میں کسی بھی چیز کو بخشنے کا عادی نہیں ہوں اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے مجھے معلوم ہے آپ بھی میری ہی طرح سوچتے ہیں۔ لہٰذا چونکہ ہم سب منصف ہیں اس لئے ایک دوسرے کے سامنے ہم سب مجرم بھی ہیں۔ ہر ایک اپنے سستے طریقے پر ایک مسیح ہے اور سب یکے بعد دیگرے، ہمیشہ بغیر علم کے مصلوب کئے جاتے ہیں۔ ہمیں مصلوب ہونا ہی پڑتا اگر میں، کلیمنس، نے ایک راہ مفر نہ ڈھونڈ نکالی ہوتی۔ واحد حل ـــ سچائی آخر کار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گھبرائیے نہیں، عزیز دوست، میں اب ختم ہی کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں اب مجھے آپ سے رخصت ہونا ہے کیونکہ ہم میرے گھر کے دروازے پر آ پہنچے ہیں۔ تنہائی کے عالم میں آدمی، تھکا ہوا ہو تو، اپنے آپ کو پیغمبر سمجھنے پر مائل ہوتا ہے۔ آخری تجزیے میں دیکھا جائے تو میں دراصل پیغمبر ہی ہوں جس نے جوہڑوں، کہر آلود دھندلکوں اور پتھروں کے ویرانے میں پناہ لی ہے۔ ایک ذلیل دنیا کے لئے ایک کھوکھلا پیغمبر۔ ایلیا ایلیاہ جسے کوئی مسیحا نہ مل سکا۔ بخار اور شراب کی

join eBooks Telegram

آگ میں تپتا ہوا، اس بوسیدہ دروازہ کی طرف اپنی پشت کئے، خوفناک آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر ان گمراہ انسانوں کیلئے بددعا کر رہا ہوں جو کسی فیصلہ کا بار اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے۔ وہ فیصلہ کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ اور یہی بنیادی بات ہے وہ جو کسی قانون کا پابند ہوتا ہے، اُسے اس فیصلہ کا خوف نہیں ہوتا جو اس کی جگہ اس کے اپنے تسلیم کردہ قانون کے نظام میں متعین کرتا ہے۔ لیکن انسانی اذیتوں میں سب سے بڑی اذیت یہ ہے کہ آدمی پر کسی قانون کے بغیر فیصلہ صادر ہوا ہو۔ بایں ہمہ ہم سب اس اذیت کا شکار ہیں۔ سارے منصف اپنے حدود سے تجاوز کرکے، سمت اور جہت سے آزاد، فیصلہ دینے کی دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں۔ لہذا ہمیں ان سے زیادہ تیز دوڑنا چاہیئے۔ اور یہ واقعی ایک پاگل خانہ ہے، پیغمبروں اور عطائیوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی ہے۔ سب اس عجلت میں ہیں کہ دنیا کی مکمل تباہی سے پہلے ایک عمدہ قانون یا ایک مکمل اور استحکام سے مبرا نظام لے کر محلِ وقوع پر پہنچ جائیں۔ خوش قسمتی سے میں پہنچ گیا ہوں۔ میں انتہا بھی ہوں اور ابتدا بھی۔ میں قانون کا اعلان کرتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ میں شرمسار منصف (JVDGE - PENiTENT) ہوں۔

ہاں، ہاں، کل آپ کو ضرور بتلاؤں گا کہ اس معزز پیشے کی تفصیل کیا ہے۔ آپ پرسوں یہاں سے جا رہے ہیں اس لئے ہمیں عجلت کرنی چاہیئے۔ میرے گھر آیئے گا نا! تین بار گھنٹی بجایئے۔ آپ پیرس جا رہے ہیں! پیرس تو بہت دور ہے پیرس بہت خوبصورت شہر ہے۔ میں اسے ابھی تک بھولا نہیں ہوں۔ وہاں کی اس موسم کی شاموں کا حسن بہت یاد آتا ہے۔ دھوئیں سے نیلی چھتوں پر، دھند میں لپٹی ہوئی گرم شام آہستہ آہستہ اترتی ہے، شہر آوازوں سے گونجنے لگتا ہے، دریا پیچھے کی طرف بہتا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے۔ تب میں سڑکوں پر گھوما کرتا تھا۔ لوگ اب بھی وہاں اسی طرح گھومتے ہوں گے مجھے معلوم ہے۔ وہ آوارہ گردی کرتے ہوں گے اور بظاہر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہوں گے کہ دراصل تھکی ہوئی بیوی، سخت گیر گھر، کی طرف جانے کی جلدی میں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ آہ، میرے دوست کیا آپ جانتے ہیں ایک یکہ و تنہا آدمی بڑے شہروں میں آوارہ گھومتے ہوئے کیسا لگتا ہے!

مجھے بڑی پشیمانی ہے کہ آپ تشریف لائے ہیں اور میں بستر میں پڑا ہوا ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں، بس معمولی سا بخار ہے جس کا علاج میں جن سے کر رہا ہوں۔ میں اب ان دوروں کا عادی ہو چلا ہوں۔ ملیریا ہے۔ اُن دنوں سے اس کا شکار ہوں جب میں پوپ ہوا کرتا تھا۔ ارے میں یونہی مذاق کر رہا تھا مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں یہی کہ میری باتوں میں سچائی کو جھوٹ سے الگ کرنا بہت مشکل ہے مجھے تسلیم ہے آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں

join eBooks Telegram

میں خود ۔ ۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ کسی زمانے میں میں ایک ایسے شخص کو جانتا تھا جس نے جملہ نوعِ انسانی کو تین قسموں میں بانٹ رکھا تھا۔ ایک قسم ان لوگوں کی جو جھوٹ بولنے پر مجبور ہونے کے مقابلے میں اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ کوئی ایسا راز نہ ہی رکھیں جسے چھپانا پڑے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی جو چھپانے کے قابل کوئی بات نہ رکھنے پر جھوٹ بولنے کو ترجیح دیتے ہیں اور تیسری قسم ان لوگوں کی جنہیں جھوٹ بولنا بھی پسند ہے اور باتوں کو پوشیدہ رکھنا بھی۔ اب یہ فیصلہ آپ پر چھوڑے دیتا ہوں کہ میرا شمار کس قسم کے لوگوں میں ہوگا۔

لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ کیا تمام جھوٹی باتیں بالآخر سچ ہی کی طرف نہیں جاتیں؟ اور کیا میرے تمام قصے، خواہ وہ جھوٹے ہوں یا سچے، اسی نتیجہ کی طرف نہیں جاتے؟ کیا ان سب کا ایک ہی مفہوم نہیں ہے۔؟ پھر اس سے کیا غرض کہ وہ جھوٹی ہیں یا صداقت پر مبنی، جبکہ دونوں صورتوں میں وہ یہی بتاتی ہیں کہ میں کیا تھا اور کیا ہوں۔ بعض اوقات سچے آدمی کے مقابلے میں جھوٹے آدمی کا باطن زیادہ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سچائی تیز روشنی کی طرح خیرہ کن ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جھوٹ خوبصورت جھٹ پٹے کی ایسی مدھم روشنی کی مانند ہے جو ہر شے کی کیفیت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ خیر آپ ان باتوں کو جیسا چاہیں لیں، بات اتنی ہے کہ قیدیوں کے ایک کیمپ میں میرا نام پوپ رکھا گیا تھا۔

مہربانی سے بیٹھ جائیے۔ آپ اس کمرہ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ خالی کمرہ ہے لیکن ہے پاک و صاف۔ بالکل ورمیئر کی تصویر ہے جس میں نہ فرنیچر نہ تانبے کے برتن حتیٰ کہ کتابیں بھی نہیں۔ کیونکہ ایک عرصہ گذرا میں مطالعہ ترک کرچکا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب میرا مکان آدھی پڑھی ہوئی کتابوں سے بھرا رہتا تھا۔ کتابوں کو آدھا پڑھ کر چھوڑ دینا اتنا ہی مکروہ فعل ہے جتنا کلیجی کے لذیذ کباب کا ایک ٹکڑا کاٹ کر بقیہ حصہ پھینک دینا۔ بہرکیف مجھے اب سوائے اعترافات کے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں رہی۔ اعترافات کے مصنف اس لئے اعترافات لکھتے ہیں کہ بطورِ خاص اعترافات سے بچیں اور کوئی ایسی بات نہ کہیں جو انہیں معلوم ہے۔ جس وقت یہ لوگ بقولِ خود بجد تکلیف وہ اعترافات کررہے ہوتے ہیں۔ انہیں غور سے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ وہ دراصل مردہ جسموں کو لباس پہنا رہے ہیں۔ یقین مانئے مجھے معلوم ہے کہ میں کس چیز کے بارے میں گفتگو کررہا ہوں۔ لہذا میں نے مطالعہ کا فضول شوق ہی ترک کر دیا۔ نہ کتابوں کی ضرورت ہے اور نہ دیگر بے مصرف اشیاء کی۔ بس چند ناگزیر ضروریاتِ زندگی جو تابوت کی مانند اجلی، چمکیلی اور ستھری ہوں۔ علاوہ ازیں یہ ڈچ طرز کے بستر اور یہ ان کی اتنی اجلی چادریں، ان پر جان دیتے ہوئے آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اس نے قبل از وقت ہی کفن پہن لیا ہو اور جیسے اسے پوری پاکیزگی کے عالم میں حنوط کر دیا گیا ہو۔

آپ میری پاپائی مہمات اور کارروائیوں کے بارے میں متجسس ہیں! کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

join eBooks Telegram

مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ انہیں آپ کے سامنے بیان کر سکوں! بخار اتر رہا ہے۔ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت کے افریقہ کا قصہ ہے جب خدا بھلا کرے جناب رومیل کا جن کے سبب وہاں جنگ کی بھٹی دہک رہی تھی۔ گھبرایئے نہیں میں اس جنگ میں شامل نہیں تھا۔ میں تو یورپ کی جنگ میں شامل ہونے سے بھی بچ نکلا تھا۔ فوج میں بھرتی تو ضرور ہو گئی لیکن کبھی محاذ پر جانا نہ پڑا۔ ایک طرح سے مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔ ممکن ہے اس سے بہت ساری باتیں تبدیل ہو جاتیں۔ فرانسیسی افواج کو محاذ پر میری ضرورت نہ تھی۔ مجھے صرف پسپائی کے وقت واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں پیرس لوٹ آیا اور ساتھ ہی جرمن بھی آگئے۔ تحریک مزاحمت (RESISTANCE MOVEMENT) مجھے اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔ اس تحریک کا لوگوں میں عین اسی وقت چرچا ہو رہا تھا جس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں خاصا محبّ الوطن آدمی ہوں۔ آپ مسکرا رہے ہیں! نہیں، آپ غلطی پر ہیں۔ میں نے یہ دریافت شنلے اسٹیشن پر میٹرو کی گذرگاہوں میں کی تھی۔ ایک کتا کہیں سے بھٹک کر ان بھول بھلیوں میں آنکلا تھا۔ قوی ہیکل، تنا رجیسے بال، مسکراتی ہوئی آنکھیں، ایک اتراتی ہوئی چال کے ساتھ آنے جانے والوں کی ٹانگیں سونگھ رہا تھا۔ کتوں سے مجھے ہمیشہ بڑی پائیدار محبّت رہی ہے۔ میں نے اس کتے کو قریب بلایا۔ پہلے تو وہ کچھ جھجکا۔ بالآخر مانوس ہو گیا اور نہایت تپاک سے دُم ہلاتے ہوئے مجھ سے چند گز آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحہ ایک نوجوان جرمن سپاہی جو بڑی تیزی سے چل رہا تھا میرے پہلو سے گذرا کتے کے قریب پہنچ کر اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، چمکارا اور کتا جھجکے بغیر اسی تپاک کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور تھوڑی دیر میں دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے اس وقت اس جرمن سپاہی کے لئے میں نے غصہ اور نفرت کے جو جذبات محسوس کئے ان سے مجھے واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ میرا یہ شدید ردِعمل میری حب الوطنی کا نتیجہ تھا۔ اگر کتا کسی فرانسیسی شہری کے ساتھ جاتا تو مجھے کوئی احساس نہ ہوتا لیکن اس کے برعکس میں نے کتے کے دوستانہ رویے کو جرمن فوج کے لئے ایک فال نیک سمجھا اور اس خیال نے مجھے بہت طیش دلایا۔ اور یہ میری وطن پرستی کا یقینی ثبوت تھا۔

تحریکِ مزاحمت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے میں جنوبی حلقے کو گیا لیکن وہاں پہنچ کر حقیقت معلوم ہوئی تو میں ٹھٹھک گیا۔ یہ مہم مجھے قدرے مجنونانہ، یا ایک لفظ میں یوں کہہ لیجئے، "رومانی" لگی۔ میں نے خاص طور پر یہ محسوس کیا کہ اس طرح کی زمین دوز کارروائی نہ تو میرے مزاج سے لگا کھاتی تھی اور نہ میرے کھلی بلندیوں کو ترجیح دینے کے مذاق کی تسکین کرتی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی کال کوٹھری میں بند ہو کر کپڑا بننے کے لئے کہا جا رہا ہو جہاں کچھ وحشی انسان مجھے ڈھونڈھ نکالیں گے اور ایک کال کوٹھری سے دوسری کال کوٹھری میں منتقل کر کے مار مار کے میرا ادھر کس نکال دیں گے۔ میں ان لوگوں کی بہادری کا معترف ضرور تھا۔ جنہوں نے ان زمین دوز تحریکوں میں اپنے جوہر دکھائے۔ لیکن ان کی تقلید میرے بس کا روگ نہ تھی۔

چنانچہ میں لندن پہنچنے کے مبہم ارادے سے شمالی افریقہ جا نکلا۔ لیکن افریقہ میں صورتِ حال صاف نہیں تھی۔ ساری اختلافی پارٹیاں اپنی اپنی جگہ حق بجانب نظر آتی تھیں۔ میں سب سے الگ تھلگ رہا۔ آپ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں بہت ساری ایسی تفصیلات کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو آپ کی دانست میں مخصوص اہمیت کی مالک ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن آپ سے اچھی طرح واقف ہونے کی بنا پر میں یہ تصوّر کرنے لگا ہوں کہ جن باتوں کے ذکر سے میں گریز کروں گا وہ باتیں آپ خود بخود زیادہ بہتر طور پر محسوس کر لیں گے۔ بہر حال میں آخر کار تیونیشیا جا پہنچا۔ جہاں ایک دوست نے میرے لئے کچھ کام فراہم کر دیا۔ یہ دوست ایک بہت ذہین عورت تھی جس کا فلمی کاروبار سے تعلق تھا۔ میں اس کے ساتھ تیونس گیا۔ الجزائر کے ساحل پر اتحادی افواج کے پہنچنے تک مجھے اس کی حقیقی سرگرمیوں کا علم نہ ہو سکا۔ اسی دن وہ جرمنوں کے ہاتھ گرفتار ہوئی اور اس کے ساتھ بغیر کسی قصد و ارادہ کے میں بھی پکڑا گیا۔ مجھے پتہ نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی گئی اور کافی پریشانی کے بعد مجھے علم ہوا کہ میری نظر بندی محض حفاظتی اقدام کے طور پر ہوئی تھی۔ ہم لوگ تری پولی کے ایک کیمپ میں نظر بند تھے۔ جہاں دشمن کی بہیمیت یا سفاکی سے زیادہ پیاس اور کسمپرسی کی وجہ سے ہمیں تکلیف اٹھانی پڑی۔ بس وہ تفصیلات اب آپ کے سامنے نہیں بیان کروں گا کیونکہ اس صدی کے وسط کی نسل کو اس قسم کے مقامات کا تصور کرنے کے لئے کسی خاکے یا تصویر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے لوگ جھیلوں اور جنگلوں کو دیکھ کر جذباتی ہو جاتے تھے لیکن آج ہمارے پاس صرف کال کوٹھریوں کی شعریت باقی رہ گئی ہے اس لئے تفصیلات میں آپ کے تخیل کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ کو صرف چند جزئیات کے اضافے کی ضرورت پڑے گی جیسے گرمی، سمت الراس پر دہکتا ہوا سورج، ریت اور پانی کی قلّت۔

میرے ساتھ ایک نوجوان فرانسیسی تھا جو با عقیدہ آدمی تھا۔ یقیناً جناب یہ بالکل پریوں کی کہانی ہے وہ فرانس سے اس ارادہ کے ساتھ اسپین آیا تھا کہ محاذ پر لڑائی میں حصّہ لے۔ لیکن کیتھولک جنرل نے اُسے نظر بند کر دیا اور جب اس نے فرانکو کے کیمپ میں دیکھا کہ فرانکو کی افواج کو پاپائے روم کی دعائیں حاصل ہیں تو وہ شدید مایوسی اور افسردگی کا شکار ہو گیا۔ اس افسردگی سے اُسے نہ افریقہ کا وہ آسمان نجات دلا سکا جس کے نیچے وہ اسپین سے نکلنے کے بعد پہنچا تھا اور نہ کیمپ کی فرصتیں اس کے اس دکھ کو بہلا سکیں۔ لیکن کچھ تو غور و فکر اور کچھ یہاں کی بے پناہ گرمی نے اسے خاصا متزلزل کر دیا۔ ایک دن جب ہم سب، کوئی دس ایک آدمی خیمے کے اندر گویا پگھلے ہوئے سیسے میں غرق بیٹھے مکھیوں کی مسلسل بھنبھناہٹ سے تنگ آ رہے تھے تو اس نے پاپائے روم کے متعلق جسے وہ صرف رومن کہتا تھا سخت و سُست الفاظ دہرائے۔ کوئی ہفتہ بھر کی بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ اس نے ہم سب پر ایک وحشیانہ نظر ڈالی، وہ کمر تک برہنہ تھا اور اس کا سارا بدن پسینے میں تر تھا۔

join eBooks Telegram

اپنی باہر کو نکلی ہوئی پسلیوں پر زور زور سے دو ہتڑ مار کر اس نے ایک نئے پوپ کی ضرورت کا اعلان کیا۔ "ایسا پوپ جو تخت پر بیٹھ کر دعائیں دینے کی بجائے مصیبت زدوں کی زندگی میں شرکت کر سکے اور ایسے ایک پوپ کا انتخاب جتنا جلد ہو سکے ہونا چاہیئے۔" "ہاں" اس نے وحشت زدہ آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ "یہ انتخاب جتنی جلد ہو سکے ہونا چاہیئے۔" پھر وہ اچانک خاموش ہو گیا اور سست آواز میں کہنے لگا۔ "ہمیں اس نئے پوپ کا اپنے مابین ہی انتخاب کرنا چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایک پورے آدمی کو اس کی ساری اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ قبول کرتے ہوئے منتخب کر لیں اور اس سے اپنی وفاداریوں کو وابستہ کرنے کا حلف اٹھائیں صرف ایک شرط پر کہ وہ ہمارے مصائب کے مشترک احساس کو خود میں اور دوسروں میں قائم رکھے گا۔" "ہمارے درمیان سب سے زیادہ کمزوریاں رکھنے والا آدمی کون ہے؟" اس نے دریافت کیا۔ میں نے مذاق میں اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ میں واحد آدمی تھا جس نے ہاتھ اٹھایا۔ "ٹھیک ہے، ژاں پاپنیت ٹھیک رہے گا۔" نہیں، اس نے، بالکل یہی الفاظ نہیں کہے تھے۔ کیونکہ ان دنوں میرا نام کچھ اور تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو جس طرح پیش کیا تھا وہ بذاتِ خود بہت بلند حرکت تھی لہذا مجھے منتخب کر لینا چاہیئے۔ دوسروں نے بھی مذاقاً اس کی تائید کی لیکن اس مذاقاً تائید میں سنجیدگی کا بھی ایک عنصر شامل تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس پاگل نے ہم سب کو خاصا متاثر کر دیا تھا۔ اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خود بھی اس معاملہ کو صرف ہنسی مذاق میں نہیں اڑا رہا تھا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ ہمارا ننھا پیغمبر حق بجانب تھا۔ پھر تپتے ہوئے سورج، جان لیوا محنت اور پانی کی دیوانہ وار طلب کی وجہ سے ہم سب صحیح ذہنی حالت میں نہ تھے۔ بہر حال میں نے کئی ہفتوں تک بڑھتی ہوئی سنجیدگی کے ساتھ اپنے پاپائی فرائض ادا کئے۔ یہ فرائض کیا تھے؟ یوں سمجھئے میں ایک گروپ لیڈر یا خانقاہ کے مہتمم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اور دوسرے لوگ جن میں اعتقاد نہ رکھنے والے بھی شامل تھے، میری اطاعت کے عادی بن گئے تھے۔ وہ دیوانہ بیمار تھا اور اس کی تیمارداری کے دوران اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ پوپ بننا اتنا آسان کام نہ تھا جتنا میں سمجھتا تھا۔ اس کا احساس مجھے کل بھی ہوا تھا جب میں آپ کے سامنے ہمارے بھائیوں یعنی منصفوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار کر رہا تھا۔ کیمپ میں سب سے بڑا مسئلہ پانی کی تقسیم کا تھا۔ دوسرے لوگ سیاسی یا علیحدگی پسند حلقوں میں بٹ گئے تھے اور ہر گروپ اپنے آدمیوں کی پاسداری کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بھی اپنے گروپ کی پاسداری کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بہر حال شروعات کے لئے یہ ایک معمولی سی رعایت تھی۔ خود اپنے لوگوں میں بھی پوری مساوات قائم رکھنا میرے لئے بہت دشوار تھا۔ اپنے ساتھیوں میں جس کی جو حالت ہوتی اور جس کا جو کام ہوتا اس کے پیشِ نظر ان کے ساتھ سلوک میں بھی فرق کرنا پڑتا

join eBooks Telegram

تھا۔ ایسے امتیازات، یقین رکھئے بڑے دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن اب میں واقعی تھک چکا ہوں اور ان دنوں کے بارے میں مزید سوچنا نہیں چاہتا۔ مختصراً بس اتنا کہنے دیجئے کہ یہ سلسلہ بالآخر اُس دن ٹوٹ گیا جس دن میں نے اپنے ایک قریب المرگ رفیق کے حصے کا پانی پی لیا۔ نہیں، نہیں، یقین کیجئے مرنے والا وہ دیوانہ نہیں تھا۔ وہ تو پہلے ہی مرچکا تھا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ فاقہ کشی کرتا تھا۔ علاوہ ازیں اگر وہ موجود ہوتا تو میں اس کی محبت کی خاطر کچھ دیر اور اپنی پیاس پر قابو رکھ لیتا۔ کیونکہ مجھے اس سے محبت تھی۔ ہاں، میں واقعی اس سے محبت کرتا تھا۔ یا کم از کم مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ تو بہرحال، میں نے پانی پی لیا اور اپنے آپ کو یہ سمجھا تا رہا کہ وہ آدمی جو بہرحال مرنے ہی والا تھا، اس کے مقابلے میں لوگوں کو میری زیادہ ضرورت تھی اور میرا فرض تھا کہ میں خود کو دوسروں کی خاطر زندہ رکھوں۔ عزیزم! سلطنتیں اور مذاہب اسی طرح موت کے سورج کے نیچے وجود میں آتی ہیں۔ کل آپ سے میں نے جو باتیں کہی تھیں ان کی تصحیح کرنے کے لئے آپ کو اس عظیم خیال کے بارے میں بتاؤں گا جو اس گفتگو کے دوران میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ میں اب پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال محض ایک خواب تھا یا میں اس پر عملی طور پر کار فرما رہا۔ بہرحال وہ عظیم خیال یہ ہے کہ پوپ کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہیئے۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ اُسے اوروں کے مقابلے میں معافی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے آدمی پوپ سے اونچا اٹھ سکتا ہے۔

کیا آپ نے کواڑ مضبوطی سے بند کر لیا تھا؟ ہاں؟ از راہِ کرم ذرا اطمینان کر لیجئے۔ معاف کیجئے مجھے دروازے کو کھٹکا لگانے کا جنون (BOLT-COMPLEX) ہے۔ آنکھ لگتے وقت مجھے کبھی یاد نہیں رہتا کہ میں نے دروازہ بند کیا ہے یا نہیں اور ہر رات مجھے اس بات کا اطمینان کرنے کے لئے بستر سے اٹھنا پڑتا ہے۔ میں نے پہلے ہی آپ کو بتایا ہے نا کہ کسی بھی بات کا قطعی یقین ناممکن ہے۔ دروازہ بند رکھنے کے سلسلے میں میرے اس جنون کو ایک عام خوفزدہ آدمی کے ردِ عمل سے مت تعبیر کیجئے۔ پرانے دنوں میں، میں کبھی اپنے کمرے یا کار کو تالا نہیں لگاتا تھا۔ حتیٰ کہ نقدی بھی کبھی میں نے قفل میں نہیں رکھی۔ میں نے کبھی اپنی کسی ملکیت سے چمٹے رہنے کی کوشش نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی چیز کی ملکیت کا احساس میرے لئے باعثِ ندامت تھا۔ کبھی کبھار، عام گفتگو کے دوران میں میں سنجیدگی سے یہ اعلان کیا کرتا تھا — !

"حضرات! ملکیت قتل کا دوسرا نام ہے!" چونکہ میں اتنا وسیع القلب نہیں تھا کہ اپنی دولت میں کسی مستحق نادار کو شریک کر لیتا، اس لئے میں نے اپنی ملکیت چوری کے لئے آزاد چھوڑ دی تاکہ جو ناانصافی مجھ سے ہوئی ہے اس کے ازالے کا اس طرح اتفاق پیدا ہو جائے۔ آج کل میں کسی شے کا مالک نہیں

join eBooks Telegram

ہوں اس لئے اب میں اپنی ملکیت کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی حاضر دماغی کے بارے میں متفکر رہتا ہوں اور ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی خاص خیال رہتا ہے کہ یہ محصور اور مختصر سی کائنات ، جس کا میں بیک وقت بادشاہ ، پوپ اور منصف ہوں ، اس کا دروازہ مضبوطی سے بند رکھوں ۔ جی ہاں وہ روغنی تصویر ملاحظہ فرمایئے ۔ کیا آپ نے پہچانا نہیں ؟ اس کا عنوان ہے "عادل منصفین" اسے دیکھ کر آپ اچھل نہیں پڑے ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ فنونِ لطیفہ کے بارے میں آپ کی معلومات ناقص ہوں ؟ اگر آپ اخبار پڑھتے ہوں تو گھن کے سال باد کلیسا میں چوری کی ایک مشہور واردات آپ کو یاد آنی چاہیئے ۔ اُس کلیسا کی قربان گاہ پر مشہور مصور خان آئنگ نے " بھیڑ کی تعظیم کے نام سے جو تصویریں بنائی تھیں ان میں سے ایک تصویر چرالی گئی تھی ۔ اس تصویر کا عنوان تھا "عادل منصفین" اس تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ منصفین گھوڑوں پر سوار مقدس جانور کی تعظیم کے لئے آرہے ہیں ۔ چونکہ اصلی تصویر دوبارہ ہاتھ نہ آسکی اس لئے کلیسا میں اس کی جگہ ایک نہایت شاندار نقل آویزاں کر دی گئی ۔ تو جناب وہ تصویر یہ ہے ۔ نہیں ، میرا اس کارنامے سے دور کا بھی واسطہ نہیں " میکیکو سٹی " کا ایک روز آنے والا گاہک ، وہی گوریلا جس کی آپ نے اس دن شام کو ایک جھلک دیکھی تھی ، ـــــ ایک شام مدہوشی کے عالم میں صرف ایک بوتل کے عوض یہ تصویر فروخت کر گیا تھا ۔ میں نے اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ وہ اس تصویر کو کسی نمایاں جگہ لٹکائے ۔ طویل عرصے تک ، جب کہ اس کی تلاش روئے زمین کے چپے چپے پر نہایت مستعدی سے جاری تھی ، ہمارے یہ مقدس منصفین " میکیکو سٹی " میں شرابیوں اور دلالوں کے سروں کے اوپر اپنا سنگھاسن جمائے جلوہ افروز تھے ۔ اس کے بعد گوریلا نے میری درخواست پر یہ تصویر میری تحویل میں دے دی ۔ پہلے تو اسے کچھ پس و پیش ہوا لیکن جب میں نے اُسے معاملے کی نوعیت سے آگاہ کیا تو وہ گھبرا گیا ۔ بس تب سے جناب یہ معزز مجسٹریٹ صاحبان میری تنہائی کے واحد ساتھی ہیں ۔ " میکیکو سٹی " میں بار کے اوپر آپ نے اس عظیم " خلا " کو ضرور محسوس کیا ہو گا ۔ جو یہ اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ میں نے تصویر کلیسا کو واپس کیوں نہ کر دی ؟ خوب بات کہی آپ نے ! بالکل ایک پولیس والے کا ردِ عمل ہے ۔ خیر میں آپ کو جواب بھی اسی طرح دوں گا جس طرح سرکاری وکیل کو دیا جاتا ہے ، یعنی اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ یہ تصویر میرے کمرے میں ہے تب ۔ تو چلیے جناب پہلی بات تو یہ کہ تصویر میری نہیں بلکہ میکیکو سٹی کے مالک کی ہے جس کا وہ اتنا ہی مستحق ہے جتنا گھن کے اسقف یا لاٹ پادری ہو سکتے ہیں دوسری بات یہ کہ وہ تمام حضرات جو "بھیڑ کی تعظیم" کے آگے سے ہو کر گزر رہے ہیں ۔ ان میں سے کوئی نقل کو اصل سے متمیز کرنے کے قابل نہیں تھا لہذا میرے غلط عمل سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔ تیسری بات یہ کہ اس تصویر کو اپنے پاس رکھ کر مجھے اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے کیونکہ جھوٹے منصفین کو دنیا کی تعریف و تحسین کے لئے پیش کیا جا رہا ہے اور مجھے صرف مجھے ، اس بات کا علم ہے کہ سچے اور اصلی منصفین کون ہیں ۔ چوتھی بات یہ کہ اس صورتِ حال میں مجھے جیل بھیجے جانے کا امکان باقی رہتا ہے جو ایک طرح سے کافی دل خوش کن تصور ہے ۔ پانچویں بات یہ کہ تصویر میں منصفین بھیڑ سے ملنے جا رہے ہیں ، لیکن دنیا میں اب کوئی

join eBooks Telegram

معصومیت باقی ہے نہ بھیڑ! اور جس ہوشیار بدمعاش نے اس تصویر کی چوری کی تھی وہ دراصل ایک غیبی انصاف کا آلۂ کار تھا اور کبھی ایسے انصاف کے راستہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہیئے۔ اختتاماً آخری وجہ بھی بتا دوں کہ اس تصویر کو الماری میں رکھ دینے سے ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انصاف کو معصومیت سے اس طرح الگ کرکے کہ موخر الذکر صلیب پر، اور اوّل الذکر میری الماری میں مقفل رہے میں نے اپنے نظریات کے مطابق عمل کرنے کے لئے راستہ ہموار کرلیا ہے اور میں ایک صاف ضمیر کے ساتھ شرمسار مصنف کے مشکل پیشے پر عمل پیرا ہو سکتا ہوں جسے میں نے کتنی ہی جدوجہد اور کتنی ہی امیدوں کی ناکامی کے بعد اختیار کیا۔ اور اب چونکہ آپ جا رہے ہیں، وقت آگیا ہے کہ اس کی تفصیل آپ کو بتا دوں۔

مجھے اٹھ کر بیٹھ جانے کی اجازت دیجئے تاکہ ذرا آسانی سے سانس لے سکوں۔ اُف! میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں۔ براہ کرم میرے مضمون کو مقفل کر دیجئے۔ رہا "شرمسار منصف" کا پیشہ، تو میں آج کل اسی پر عمل پیرا ہوں عام طور پر میرا دفتر "میکسیکو سٹی" میں ہوا کرتا ہے لیکن اصل شوق جو ہے اس کی تکمیل کام کی جگہ کی حدود کی پابند نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ بستر میں اور بخار کی حالت میں بھی میں اپنے فرائض بجا لاتا رہتا ہوں۔ علاوہ بریں یہ پیشہ ایسا نہیں ہے کہ آدمی اسے صرف برت لے بلکہ یہ تو سانس کی آمد و شد کے ساتھ آپ کے وجود میں جاری و ساری رہتا ہے یہ خیال دل میں نہ لائیے کہ پانچ دن تک اتنی طوالت کے ساتھ میں نے آپ سے جو گفتگو کی ہے وہ محض تفنن طبع کی خاطر تھی۔ اپنے پچھلے دنوں میں میں اس قسم کی بکواس کافی کر چکا ہوں۔ لیکن اب میری ہر بات کا ایک مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد واضح ہے۔ اس قہقہہ کی آواز کو خاموش کرنا جو میرا تعاقب کر رہی ہے، اس فیصلہ سے بچ نکلنا جو ذات خود اپنے آپ پر صادر کرتی ہے۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ ان سے مفر کی کوئی صورت نہیں اور کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ان سے فرار کہیں اس لئے تو نا ممکن نہیں کہ آپ کو مجرم قرار دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ دائرۂ جرم کو اتنی وسعت دی جائے کہ سب اس میں شامل ہو جائیں بلا استثنیٰ سب کو مجرم قرار دیا جائے تاکہ اس طرح اپنا بار ہلکا ہو سکے۔

کسی کے لئے کوئی رورعایت نہیں، یہ میرا پہلا اصول ہے۔ نیک نیتی، شریفانہ غلطی، بے احتیاطی، مجبور کن حالات، یہ سب قطعاً ناقابلِ قبول ہیں۔ میں نے اپنے ہاں گناہوں سے پاک کئے جانے یا بخشے جانے کا معاملہ ہی نہیں رکھا۔ ہر چیز بہت صاف واضح اور طے شدہ ہے۔ حساب لگایا اور بتا دیا کہ حاصلِ جمع یہ ہے۔ آپ بدکار ہیں، ہوس پرست ہیں، پیدائشی جھوٹے ہیں، لوطی ہیں، فنکار ہیں وغیرہ۔ میں سیاست کی طرح فلسفہ میں بھی ہر اس نظریہ کا حامی ہوں جو انسان کو معصومیت عطا کرنے سے انکار کرتا ہے اور ہر اس رویہ کا موئید ہوں جو انسان کے ساتھ مجرم کا سلوک روا رکھتا ہے۔ آپ کو مجھ میں غلامی کا ایک آزاد خیال حامی نظر آ رہا ہو گا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ غلامی کے سوا کوئی قطعی اور حتمی حل ہے بھی نہیں۔ مجھے بہت جلد اس کا پتہ چل گیا۔ میں کسی زمانے میں چوبیس ۲۴ گھنٹے آزادی کی باتیں کیا کرتا تھا۔ صبح ناشتہ پر میں اسے ٹوسٹ پر لگا کر کھاتا تھا سارا سارا دن اسی کی جگالی کرتا تھا اور احباب کے درمیان میری سانس آزادی کی مہک سے معطر رہتی تھی۔ اس اسم اعظم کی مدد سے میں ہر اس شخص کو زیر کر دیتا تھا جو مجھ سے اختلاف کی کوشش کرتا۔ میں نے اس لفظ کو اپنی قوت اور مقصد برآری کے لئے استعمال کیا۔ میں بستر میں اپنے ساتھ سونے والی عورتوں کے کانوں میں اسی لفظ کی سرگوشی کیا کرتا تھا، اور اس سے مجھے انہیں چھوڑ دینے میں آسانی ہوتی تھی۔ بس، میں اس لفظ کو چپکے سے۔۔۔

لیکن، خدا را ٹھہریئے، میں جوش میں آگیا ہوں اور اپنا توازن کھو رہا ہوں۔ آخر میں نے بعض مواقع پر آزادی کا بے غرض استعمال بھی تو کیا ہے اور میری سادگی کی داد دیجئے، دو تین بار اس کی مدافعت میں میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ جان تو خیر نہیں دی لیکن چند ایک کافی بڑے خطرے مزید مول لے لئے تھے۔ ان سر پھری حرکتوں کے لئے مجھے معاف کر دیا جانا چاہیئے کیونکہ مجھے خود علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ مجھے علم نہ تھا کہ آزادی کوئی تمغہ یا انعام نہیں ہے جس کے حصول پر شامپین کے کاگ اڑا کر جشن منایا جا سکے۔ یہ کوئی تحفہ نہیں ہے اور نہ ایسا مصالحہ ہے جسے چھڑک کر آپ مٹن چاپ کے مزے لیں۔ جی نہیں، یہ ایک بیہودہ کام ہے، گھاٹے کا سودا، طویل فاصلے کی دوڑ جو تن تنہا سر کرنی ہوتی ہے اور جو بے حد تھکا دیتی ہے۔ اس میں نہ شامپین ہوتی ہے نہ جام اٹھا کر آپ کی طرف محبت کی نظروں سے دیکھنے والے دوست ہوتے ہیں۔ آپ کی جگہ ایک تنہا اور ممنوعہ کمرے میں ہوتی ہے یا ملزموں کے کٹہرے کے سامنے۔ تنہا۔ خواہ آپ خود اپنے آپ پر فیصلہ صادر کر رہے ہوں یا دوسرے آپ پر فیصلہ دے رہے ہوں، دونوں حالتوں میں آپ تنہا رہتے ہیں۔ تمام آزادیوں کے سرے پر عدالت کا فیصلہ سزا ہوتا ہے اسی لئے آزادی کا سہارنا بڑا بوجھل کام ہے۔ خصوصاً اس وقت جب آپ بخار سے مغلوب چلے ہوں، یا پریشان ہوں، یا کسی سے محبت نہ کرتے ہوں۔

میرے عزیز دوست، ہر اس آدمی کے لئے جو تنہا ہے، جس کا کوئی خدا ہو نہ آقا، شب و روز کا بوجھ بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر آدمی کے لئے ایک آقا کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ خدا کا چلن تو عرصہ ہوا ختم ہو چکا۔ علاوہ ازیں خدا کا لفظ اب اتنا بے معنی ہو گیا ہے کہ اس کے استعمال سے کسی کو ششدر کرنے کی کوشش بھی خطرے سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے اخلاق کے معلم، فلاسفروں کو دیکھئے، جو سب کے سب اتنے سنجیدہ، پڑوسیوں سے محبت کرنے والے، وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان میں اور مذہب کو ماننے والے عیسائیوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں سوائے اس کے کہ وہ گرجاؤں میں تبلیغ کرنے نہیں جاتے۔ آپ کی رائے میں کونسی چیز انہیں مذہب قبول کرنے سے روکتی ہے؟ غالباً عزت، انسانوں کی عزت، جی ہاں، عزت نفس۔ وہ کسی

join eBooks Telegram

قسم کا اسکینڈل نہیں پھیلانا چاہتے، اس لئے اپنے احساسات اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔ میں ایک ملحد ناول نگار سے واقف تھا جو ہر رات چھپ کر عبادت کرتا تھا۔ اس سے کسی چیز میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا اور وہ اپنی کتابوں میں خوب خدا کی مذمت کرتا رہا! کوئی اس کی کتابیں پڑھتا تو کہہ اٹھتا واہ صاحب! کیا ٹھکائی کی ہے! ایک کٹر آزاد خیال شخص سے جب میں نے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے (یقیناً، کسی برے ارادے کے بغیر!) اور کہنے لگا۔" آپ مجھے کوئی نئی چیز نہیں بتلا رہے ہیں۔ یہ سب کے سب ایسے ہی ہیں!" اس کے خیال کے مطابق ہمارے اسّی فیصد لکھنے والے ایسے ہیں کہ اگر وہ اپنا نام مخفی رکھ سکیں تو بلا استثنٰی خدا کی برتری کا اعلان کریں گے۔ لیکن وہ اپنا نام مخفی نہیں رکھ سکتے کیونکہ انہیں اپنے آپ سے محبت ہے اور وہ کسی کی برتری کا اعلان نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ خود اپنے آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو فیصلہ دینے سے باز نہیں رکھ سکتے اس لئے بطور تلافی اخلاقیات کا پرچار کرتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان کی شیطانیت بڑی پاک باز ہے۔ واقعی یہ عجب دور ہے۔ کوئی اچنبھے کی بات نہیں اگر انسانی دماغ پراگندہ ہو گئے ہوں اور اگر میرا ایک دوست جو اپنے الحاد کے دور میں ایک مثالی شوہر تھا قبولِ مذہب کے ساتھ ہی زانی بن گیا! آہ! یہ چھوٹے تنا ننیئے، یہ نقّال، یہ منافق ــــ یہ ایں ہمہ یہ سب قابلِ رحم ہیں۔ یقین کیجئے کہ یہ لوگ آسمان کو آگ لگا دیں تب بھی ان پر رحم آتا ہے خواہ یہ لوگ ملحد ہوں یا کلیسا جاتے ہوں، ماسکو کے باسی ہوں یا بوسٹن کے، سب کے سب، باپ سے لے کر بیٹے تک، عیسائی ہیں۔ لیکن اب باپ کہاں ہے۔ جبکہ کوئی قاعدہ قانون ہی باقی نہیں رہا۔ چونکہ وہ آزاد ہیں اس لئے انہیں خود ہی ہر صورتِ حال سے نمٹنا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ آزادی یا اس کا فیصلہ پسند نہیں کرتے اس لئے وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سزا کے طور پر ان کی انگلیوں کے جوڑوں پر مارا جائے۔ وہ بڑے خوفناک قوانین بناتے ہیں۔ اور کلیساؤں کی جگہ لینے کے لئے لوہے کے پنجرے تعمیر کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں لیکن ان سب کا پورا اعتماد گناہ میں ہے۔ بخشش میں نہیں۔ گو بخشش کے بارے میں وہ سوچتے ضرور ہیں۔ بخشش کی انہیں تمنا ضرور ہے۔ تسلیم و رضا، سپردگی اور مسرت اور ممکن ہے (کیونکہ وہ جذباتی بھی ہوتے ہیں) منگنی، ایک دوشیزہ دلہن، با کردار مرد اور شادی کے وقت پیانو کی موسیقی کے بھی خواہشمند ہوں۔ مثال کے طور پر مجھی کو لے لیجئے، گو میں جذباتی نہیں ہوں۔ آپ کو پتہ ہے میں کس چیز کے خواب دیکھا کرتا تھا؟ پورے دل و جان کے ساتھ ایک ایسی بھرپور محبت جو شب و روز، بغیر کسی مداخلت کے ایک طویل ہم آغوشی میں، ساری حسّی لذتوں اور ذہنی مسرتوں کے ساتھ کم از کم پانچ سال تک جاری رہے اور اسی عالم میں موت آجائے! لیکن افسوس!

لہذا، چونکہ منگنی اور دوامی محبّت نہیں حاصل ہو سکتیں، ان کی جگہ صرف شادی اور وحشیانہ شادی کی رسم باقی رہے گی جو اقتدار اور کوڑے کے بل پر قائم رکھی جاتی ہے۔ ضروری بات یہ ہے کہ ہر چیز بالکل سادہ ہو جیسے ایک بچّے کیلئے ہر چیز ایک صاف اور سیدھے انداز میں پیش کی جاتی ہے ہر فعل منظّم ہو، نیک و بد علانیہ اور فیصلہ کن طریقے سے بتلا دیئے جائیں۔ میں ان باتوں کی پوری تائید کرتا ہوں۔ گو میں اپنی فطرت میں ایک نسلی یا جادا کے باشندے کی مانند ہوں، اور میں عیسائی بھی قطعاً نہیں ہوں۔ اگرچہ دنیا کے سب سے پہلے عیسائی کے لئے دوستی کا جذبہ محسوس کرتا ہوں۔ لیکن مجھے بھی تو پیرس کے پلوں پر احساس ہوا تھا کہ میں خود بھی آزادی سے گھبراتا ہوں۔ اس لئے خوش آمدید ہے وہ آقا، وہ کوئی بھی ہو، جو آسمانی قانون کی جگہ لے۔ "اے ہمارے باپ، جو عارضی طور پر یہاں ہے، اے ہمارے رہبر، اے ہمارے مسرت بخش طور پر سخت گیر آقا، اے ظالم اور محبوب رہنما! ۔۔۔ ۔۔۔ غرض مختصراً بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان آزاد رہنا چھوڑ دے، اطاعت قبول کرلے اور توبہ کے طور پر اپنے سے زیادہ بدمعاش کی اطاعت اختیار کرلے۔ جب ہم سب مجرم ہوں گے تو پھر جمہوریت قائم ہو جائیگی۔ اس بات کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ہمیں تنہا مرنے کا انتقام ضرور لینا چاہیئے۔ موت تنہا ہوتی ہے۔ اور غلامی اجتماعی چیز۔ دوسروں کو ان کا حصہ ملتا ہے اور اسی وقت جبکہ ہمیں اپنا حصہ مل رہا ہوگا اور یہی اہم بات ہے۔ بالآخر ہم سب ایک ساتھ ہوں گے لیکن اپنے گھٹنوں کے بل اور جھکے ہوئے سروں کے ساتھ۔

کیا یہ اچھی بات نہیں کہ دنیا کی بقیہ مخلوق کی طرح زندگی گذاری جائے اور اس کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ دنیا کی بقیہ مخلوق میرے جیسی بن جائے؟ یہ مماثلت پیدا کرنے کے کچھ مقدس اصول ہیں، دھونس، بے عزتی اور پولیس۔ اگر میں مغموم اور مجبور کر دیا جاؤں، میرا مسلسل تعاقب کیا جائے تو میں اپنی اصلیت پر اتر سکتا ہوں اس طرح میں فطری بن جاتا ہوں اور اس بات پر بغلیں بجا سکتا ہوں کہ میں وہی ہوں جو فی الواقع ہوں۔ انہیں وجوہ کی بنا پر میں نے نجی طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ اس آزادی کو جس کی میں نے کافی پرستش کی ہے، اب ہر اس آدمی کے حوالے کر دوں جو مجھے راہ میں مل جائے۔ چنانچہ جب بھی ممکن ہوتا ہے، میں "میکسیکو سٹی" کے کلیسا میں اپنے مسلک کی تبلیغ کرتا ہوں۔ میں نیک لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کریں اور بڑی عاجزی سے غلامی کی برکات سے فیض یاب ہوں مجھے کبھی کبھی اس چیز کو "حقیقی آزادی" کے نام سے بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔

میں کوئی پاگل نہیں۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ غلامی کا رواج فوری طور پر ممکن نہیں۔ یہ تو مستقبل کی نعمت ہے۔ لیکن اس دوران میں مجھے حال سے گذارہ کرنا ہے اور کم از کم ایک وقتی حل تلاش کرنا ہے۔ اس لئے مجھے ایک

join eBooks Telegram

متبادل حل تلاش کرنا پڑا۔ اور وہ یہ کہ ہر اس فیصلے کو جو میری ذات مجھ پر عاید کرتی ہے، وسعت دے کر دوسروں کو بھی اس فیصلے کی ردیں لے آؤں تاکہ میرے کندھوں پر سے اس کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جائے۔ مجھے اس کے ذرا نُخ بھی مل گئے۔ ذرا کھڑکی تو کھول دیجئے گا۔ بلا کی گرمی ہے، پوری کھڑکی نہ کھول دیجئے گا، مجھے گرمی کے ساتھ سردی بھی ہو رہی ہے۔ ہاں تو میرا حل سادہ بھی ہے اور معنی خیز بھی یعنی کسی طرح ہر ایک کو یوں ملوّث کروں کہ خود اپنے وجود سے باہر اطمینان سے بیٹھنے کا حق حاصل کر سکوں؟ کیا میں بھی اپنے کئی ایک محترز پیشروؤں کی طرح منبر پر چڑھ کر انسانیت کو کوسنا شروع کر دوں؟ یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ ایک دن یا ایک رات کسی اطلاع کے بغیر تہقہہ جاگ اٹھے گا۔ جو فیصلہ آپ دوسروں پر صادر کرتے ہیں وہ انجام کار خود آپ کے منہ پر آ لگتا ہے اور اس میں آپ کا نقصان ہے: تو کیا ہوا؟ آپ کہیں گے۔ اب ذرا میرے ذہن کی اڑان دیکھئے۔ میری دریافت یہ تھی، اپنے آقاؤں کے انتظار میں، عصا برداری کے دوران میں، ہم پورے معاملے کو ہی سرے سے پلٹ دیں۔ جب آدمی دوسروں کو اس وقت تک مطعون نہیں ٹھہرا سکتا جب تک وہ پہلے خود خودی طور پر اپنا محاسبہ نہیں کرے، تو پھر یہ ضروری ہوا کہ وہ دوسروں پر فیصلہ دینے کا حق حاصل کرنے سے پہلے اپنے آپ کو مکمل طور پر مغلوب کرلے۔ ہر منصف کا خاتمہ ایک نہ ایک دن انفعال اور ندامت پر ہی ہوتا ہے تو پھر کیوں نہ دوسرے سرے سے سفر شروع کیا جائے؟ ابتدا ہی میں ندامت اور انفعال کی مشق کی جائے تاکہ خاتمہ منصف کی مسند پر ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے؟ اچھی بات۔ لیکن مزید وضاحت کے لئے میں اپنے طریقِ کار پر روشنی ڈالوں گا۔

پہلے میں نے وکالت کا دفتر بند کیا اور پیرس کو خیرباد کہہ کر باہر نکل گیا۔ در اصل میں کسی ایسی اجنبی جگہ پر دوسرے نام سے پریکٹس کرنا چاہتا تھا جہاں کاروبار کی کمی نہ ہو۔ دنیا میں ایسی کئی جگہیں ہیں۔ لیکن کچھ تو اتفاق اور سہولت کی وجہ سے اور کچھ حالات کی ستم ظریفی اور ایک مخصوص قسم کی نفس کشی کی ضرورت نے مجھ سے ایک ایسے پانی اور کہرے سے معمور شہر کا انتخاب کرایا جو نہروں میں گھرا ہوا اور لوگوں کے ہجوم سے معمور تھا اور جہاں دنیا کے ہر گوشے سے لوگ آتے تھے۔ جہازرانوں کے محلّے میں، ایک شراب خانے میں میں نے اپنا دفتر قائم کر لیا۔ ایک بندرگاہ میں ہر قسم کے موکّل مل جاتے ہیں۔ غرباء کو امیروں کے محلّے میں سکونت کی استطاعت نہیں ہوتی لیکن اکثر شرفاء امتداد زمانہ کے ہاتھوں، کم از کم ایک بار، مجبور ہو کر، جیسا کہ آپ نے خود دیکھا ہے، پست اور معمولی جگہوں پر سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں خاص طور پر بورژوا لوگوں کا متلاشی رہا کرتا تھا۔ اور وہ بھی ایسا بورژوا جو بھٹک رہا ہو۔ اس کے ساتھ مجھے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوتے جس طرح ایک ماہر فنکار ایک نایاب ساز سے نہایت شیریں اور رسیلا نغمہ پیدا کرتا ہے، اسی طرح میں بھی اس قسم کے آدمی سے بڑے لطیف نغمے نکال لیتا ہوں۔

اس طرح میں کچھ عرصے سے یہ فائدہ بخش پیشہ "میکیکوسٹی" میں جاری رکھے ہوئے ہوں۔ اس پیشہ میں

join eBooks Telegram

بنیادی کام (جیسا کہ آپ کو معلوم ہے) یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ بار برسرِ عام اپنے جرائم کا اعتراف کیا جائے۔ میں پوری صفائی سے ہر جگہ اپنے آپ پر الزامات لگاتا ہوں۔ یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں کیونکہ اب میں نے اپنی یادداشت حاصل کرلی ہے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ میں اپنے جرائم کا اقرار عامیانہ انداز میں سینہ کوبی کرتے ہوئے نہیں کرتا۔ بلکہ میں الفاظ کو اس مہارت سے استعمال کرتا ہوں جس مہارت سے ایک تجربہ کار ملاح اپنی کشتی کھیتا ہے۔ کبھی تفصیل اور کبھی اجمال، کبھی صرف حقیقت کا اظہار اور کبھی زیبِ داستاں کے لئے کچھ مرصّع کاری، غرض سارے حربے استعمال کرتا ہوں اور اپنی بات اس طرح واضح کرتا ہوں کہ سننے والا مجھ سے دو قدم آگے بڑھ کر سمجھنے لگتا ہے۔ وہ باتیں جن کا مجھ سے تعلق ہوتا ہے، اور وہ باتیں جن کا تعلق دوسروں سے ہوتا ہے، ان دونوں کے امتزاج سے اپنی گفتگو کو ترتیب دیتا ہوں۔ ایسے پہلوؤں کو موضوع بناتا ہوں جو مجھ میں اور دوسرے سامع میں مشترک ہوں۔ ایسے تجربات جن سے ہم دونوں گذرے ہوں، ایسی کمزوریاں جو ہم دونوں میں موجود ہوں، ایسے لیڈر یا بڑی شخصیت کا ذکر جو اس وقت دنیا کی اہم ہستی سمجھا جاتا ہو، غرض ان سب باتوں کے امتزاج سے میں ایک ایسی تصویر بناتا ہوں جس میں سب کی شبیہہ ہو اور کسی کی بھی شبیہہ نہ ہو۔ یہ ایک قسم کا نقلی چہرہ ہے بالکل ویسا ہی جیسا کہ لوگ کارنیول میں اپنے چہروں پر پہن لیتے ہیں اور جسے دیکھ کر آدمی کہہ اٹھتا ہے! "ارے آپ سے تو میں مل چکا ہوں!" اور جب تصویر مکمل ہو جاتی ہے، جیسا کہ آج شام ہوئی ہے، تو میں سب کو بڑے دکھ سے بتاتا ہوں "افسوس! یہ میں ہوں!" اور یہاں سرکاری وکیل کا الزامی بیان ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن موسیو، اسی لمحہ، اپنی وہ تصویر جو میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں، دیکھنے والوں کے لئے آئینہ بن جاتی ہے۔

گرد میں اٹا ہوا جسم، بال مٹھیوں میں پکڑے ہوئے، چہرے پر ناخنوں کے زخم، لیکن دلوں کے اندر گھس جانے والی تیز نظروں کے ساتھ میں ساری نوعِ انسانی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں اور اپنے شرمناک افعال دہرا رہا ہوں، لیکن میرے الفاظ سننے والوں پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ ان سے میں غافل نہیں ہوں۔ "میں دنیا کا ارذل ترین آدمی ہوں۔" میں کہتا ہوں۔ پھر غیر محسوس طور پر "میں" کو "ہم" میں بدل دیتا ہوں۔ جب میں اس نقطہ پر پہنچتا ہوں "اور یہ ہیں ہم!!" تو سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اور تماشائی رخصت ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کی مانند ہوں۔ ہم سب ایک ساتھ پھنسے ہوئے ہیں۔ مجھے برتری حاصل ہے تو صرف اس بات کی کہ مجھے اس کا علم ہے اور اس کی وجہ سے مجھے اظہار کا حق مل جاتا ہے۔ آپ اس کا فائدہ دیکھ رہے ہیں؟ جتنا میں خود کو ملزم گردانتا ہوں۔ اتنا ہی مجھے آپ پر فیصلہ دینے کا حق مل جاتا ہے۔ بلکہ میں آپ کو ترغیب دیتا ہوں کہ آپ خود اپنا محاسبہ کریں اور اپنی ذات پر فیصلہ صادر کریں۔ اس صورت میں میرا کام اور ہلکا ہو جاتا ہے۔ میرے عزیز دوست، ہم بڑی عجیب اور بڑی خوار مخلوق ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کو پلٹ کر دیکھیں تو ایسے واقعات اور مواقع کی کوئی کمی نہیں ملے گی۔

join eBooks Telegram

جن پر ہمیں حیرت ہو اور ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں۔ ذرا کوشش تو کر دیکھئے۔ یقین رکھیئے میں آپ کے اعترافات بہت ہمدردی اور ایک اخوت کے جذبے کے ساتھ سنوں گا۔

ہنسئے نہیں۔ آپ بڑے ٹیڑھے موکل ہیں۔ یہ تو میں پہلے ہی جان چکا تھا۔ لیکن آخرکار آپ اس نقطہ پر آہی جائیں گے۔ دوسرے موکل ذہین ہونے سے زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ فوراً بوکھلا جاتے ہیں۔ ذہین آدمیوں کو اعتراف کرتے وقت لگتا ہے۔ انہیں تفصیل سے سارا طریقہ سمجھانا ضروری ہوتا ہے۔ وہ کبھراتے نہیں بلکہ مسلسل اس پر غور و خوض کرتے ہیں اور جلد یا بدیر، کچھ تو تفریحاً اور کچھ جذباتی ہیجان سے گھبرا کر وہ ضبط کی حد سے گذر جاتے ہیں اور وہ سب کچھ اگل دیتے ہیں۔ آپ صرف ذہین ہی نہیں بلکہ آپ کی ذہانت مسلسل استعمال سے جلا پا گئی ہے۔ لیکن اتنا تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ آج آپ اپنے آپ سے اتنا خوش نہیں ہیں جتنا آج سے پانچ دن پہلے تھے۔ میں اب اس کا انتظار کروں گا کہ آپ یا تو مجھے خط لکھیں گے یا پھر میرے پاس آئیں گے ـــــ آپ ضرور لوٹ کر آئیں گے مجھے یقین ہے۔ اور آپ مجھے بدلا ہوا نہیں پائیں گے۔ میں آخر کیوں بدلوں جبکہ میں نے وہ مسرت تلاش کر لی ہے جو میرے لئے مناسب ہے! میں نے دوغلے پن سے جھلا جانے کے بجائے دوغلے پن کو قبول کر لیا ہے۔ میں اس دوغلے پن میں پوری طرح رس بس گیا ہوں اور اس میں وہ سکون تلاش کر چکا ہوں جس کی مجھے ساری زندگی ضرورت اور جستجو رہی۔ میں غلطی پر تھا جس وقت میں نے آپ سے کہا تھا کہ "اصل چیز فیصلے سے بچ نکلنا ہے۔" اصل چیز تو یہ ہے کہ انسان خود پر ہر چیز کو روا رکھے، خواہ وقتاً فوقتاً اسے گلا پھاڑ کر اپنی سیاہ کاریوں کا اعلان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ میں ایک بار پھر اپنی ذات پر ہر شئے کو روا رکھتا ہوں اور اب کی بار وہ قہقہہ سنائی نہیں دیتا۔ میں نے اپنا طرز زندگی نہیں بدلا۔ میں اب بھی اپنی ذات سے محبت کرتا ہوں اور دوسروں کو بطور آلہ کار استعمال کرتا ہوں۔ فرق ہے تو اتنا کہ میرے گناہوں کا اعتراف مجھے دوبارہ ایک ہلکے دل کے ساتھ زندگی شروع کرنے میں مدد دیتا ہے اور میں دُہری لذت حاصل کر سکتا ہوں۔ ایک تو اپنی فطرت کی لذت اور دوسری ایک دلکش انفعال کی۔

جب سے میں نے اپنا حل دریافت کیا ہے۔ میں ہر چیز بلا مزاحمت دریافت کر لیتا ہوں، عورت غرور، بوریت، نفرت حتیٰ کہ یہ بخار جو اب مسرت بخش طور پر میرے اندر بڑھ رہا ہے، ان سب کے آگے میں سپر انداز ہو جاتا ہوں۔ میری فتح آخر میں ہوتی ہے لیکن دوامی ہوتی ہے۔ ایک بار پھر میں اس چوٹی پر پہنچ گیا، جسے سر کرنے والا میں واحد شخص ہوں اور جہاں سے میں ہر ایک پر فیصلہ صادر کر سکتا ہوں۔ طویل وقفوں کے بعد، ایک آدھ حسین رات کو، میں فاصلہ پر ایک قہقہہ سنتا ہوں، اور پھر میرے دل میں

join eBooks Telegram

شک پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے میں فوراً اپنی کمزوریوں کے بوجھ کے نیچے ہر ایک کو، انسان اور اشیاء دونوں کو دبا دیتا ہوں اور از سرِ نو چاق و چوبند ہو جاتا ہوں۔

میں "میکسیکو سٹی" میں جب تک ضروری ہے تب تک آپ کے دیدار کا منتظر رہوں گا۔ یہ کمبل ہٹا دیجئے۔ میں ذرا کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔ آپ آئیں گے نا! آیئے۔ میں آپ کو اپنے طریقۂ کار اور تکنیک کی تفصیلات بتاؤں گا کیونکہ مجھے آپ سے ایک انس ہو گیا ہے۔ آپ مجھے ہر رات لوگوں کو یہ بتاتا ہوا دیکھیں گے کہ وہ سب ذلیل اور کمینے ہیں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور نہ میں اپنے آپ کو یہ دیکھنے کی مسرت سے باز رکھ سکتا ہوں کہ میرے سامعین میں سے کوئی ایک کچھ تو میری تلقین کے اثر سے اور کچھ شراب کے نشہ کی وجہ سے میرا شکار ہو جاتا ہے اور سینہ کوٹ کوٹ کر گریہ و زاری کرنے لگ جاتا ہے۔ اس لمحہ میرا قد بڑھ جاتا ہے اور میں آزادی میں سانس لیتا ہوں۔ میں اس وقت پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر متمکن ہوتا ہوں اور میرے آگے میدانوں کی پستیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ احساس کتنا نشہ آور ہے کہ انسان خود کو خداوند خدا مقدس باپ کی طرح محسوس کرے اور لوگوں کو بدکرداری اور بد اطواری کی سندیں تقسیم کرتا پھرے اس ڈچ بندرگاہ کے عرشِ معلیٰ پر میں اپنے بدی کے فرشتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہوں، اور پھر اوپر پانی میں سے نکلتے ہوئے، میری جانب بڑھتے ہوئے اس جمِ غفیر کو دیکھتا ہوں جو یوم حساب کے آخری فیصلے کے لئے آ رہا ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے آگے دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی قبروں سے آہستگی سے اُٹھ رہے ہیں، وہ جو ان سب کے آگے آ رہا ہے اس کے سراسیمہ چہرے پر، جسے اس نے ایک ہاتھ سے آدھا چھپا رکھا ہے۔ عام صورتحال کا کرب اور اداسی اور اس سے فرار میں ناکامی کے آثار ہویدا ہیں۔ میں اسے اس کے گناہوں سے پاک کئے بغیر اس پر رحم کھاتا ہوں، اُسے معاف کئے بغیر سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور سب سے بڑھ کر ـــــ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری پرستش کی جا رہی ہے۔!!

ہاں میں اب چل پھر رہا ہوں۔ ایک اچھے بیمار کی طرح میں آخر کب تک اپنے بستر میں قید رہ سکتا ہوں! مجھے آپ سے بلند ہونا چاہیئے اور میرے خیالات مجھے اُٹھا رہے ہیں۔ ایسی راتوں میں، بلکہ ایسی صبحوں میں، اکثر میں باہر نکل جاتا ہوں اور نہروں کے کنارے تیز قدمی سے چلتا ہوں بے رنگ آسمان پر پروں کے جھنڈ آہستہ آہستہ گھٹنے لگتے ہیں۔ چھتوں کے اوپر سے اُبھرتی ہوئی گلابی روشنی میں میری تخلیق کا ایک نیا دن طلوع ہوتا ہے، ڈمراک پر پہلی ٹرام اس مرطوب ہوا میں اپنی گھنٹی بجاتی ہے اور یورپ کے اس دور دراز گوشہ میں زندگی کی ہماہمی اور ہلچل شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لمحہ، یورپ کے اسی حصہ میں لاکھوں انسان جو میری رعایا ہیں، اپنے منہ میں ایک تلخ ذائقہ لئے ہوئے اپنے بستروں سے بڑی تکلیف کے ساتھ نکلتے ہیں اور اپنے اپنے

join eBooks Telegram

خوشی سے عاری بے رنگ پیٹیوں میں جٹ جاتے ہیں اور اس وقت اس براعظم پر، جو بغیر جانے میرے قبضے میں ہے میں طلوع ہوتے ہوئے دن کی سُرخ روشنی سے سرشار، گندے الفاظ سے مخمور، مسرت کی انتہا کو پہنچ جاتا ہوں۔ واقعی میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں مسرت کی انتہا کو پہنچ جاتا ہوں۔ میں آپ کو کبھی یہ خیال کرنے نہیں دوں گا کہ میں خوش نہیں ہوں۔ میں بے انتہا خوش ہوں۔ شادی مرگ کی حد تک خوش سورج، ساحل، تجارتی ہواؤں کے راستے پر جزیرے، اور نوجوانی جس کی یاد آدمی کو سراسیمہ کر دیتی ہے !!۔

میں پھر بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں، معاف کیجیے۔ مجھے خوف ہے میں نے خود کو بہت ہلکان کر لیا۔ لیکن میں رو نہیں رہا ہوں۔ بعض اوقات اچھی زندگی کے اسرار کو جان لینے کے بعد بھی انسان حقائق پر شک کر کے بھٹکتا پھرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرا حل کوئی مثالی حل نہیں لیکن جب آپ اپنی زندگی کو پسند نہیں کرتے، اور جب آپ جانتے ہیں کہ آپ کو دوسروں کی زندگیاں بدلنی ہیں تو پھر آپ کے سامنے کیا راستہ رہ جاتا ہے؟ ایک آدمی دوسرا بننے کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے؟ اُسے وجود کے ہر رشتہ سے قطع تعلق کر لینا پڑتا ہے، کم از کم ایک بار اُسے اپنے وجود کو دوسروں کے لئے بھلا دینا پڑتا ہے، لیکن کس طرح؟ اب آپ اتنے بھی کٹھور مت بن جائیے۔ میں اس بڈھے فقیر کی مانند ہوں جو ایک دن ہوٹل کی چھت پر میرا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ "حضور بات صرف یہ نہیں" اس نے کہا تھا۔ "کہ میں اچھا آدمی نہیں ہوں بلکہ میرے بجز آپ روشنی کی راہ کھو بیٹھے ہیں۔" ہاں، ہم نے روشنی کی راہ گم کر دی ہے۔ وہ صبح اور وہ ان لوگوں کی مقدس معصومیت جو اپنے آپ کو معاف کر دیتے ہیں، ہم سے چھن چکی ہے۔

دیکھیے برفباری ہو رہی ہے —! مجھے باہر جانا چاہیئے!۔ ایمسٹرڈیم رات کی اجلی چادر میں لپٹا ہوا خوابیدہ ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے پلوں کے نیچے بہتی ہوئی سبز نیلی نہریں، خالی سڑکیں، خاموشی میں گھلی ہوئی میرے قدموں کی چاپ، یہ سب کل صبح تک ایک پاکیزگی کی شکل میں برقرار رہیں گے، خواہ یہ پاکیزگی ایک لمحۂ گزراں کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر بکھرتے ہوئے برف کے گالوں کو دیکھیے یقیناً یہ فاختائیں ہوں گی۔ بے چاریاں آخر کار بستیوں میں اُترنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اب وہ پانی اور چھتوں پر اپنے پروں کی موٹی تہیں جمائے ہوئے براجمان ہوں گی۔ یہ فاختائیں ہر کھڑکی کے پاس پھڑپھڑاتی ہیں۔ کیا حملہ ہے! ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ وہ ہمارے لئے کوئی نوید لا رہی ہوں گی۔ ہر ایک کی سلامتی کی نوید؟ اور صرف مخصوص بندوں کی ہی نہیں بلکہ سب کی۔ ملکیت اور مصائب سب آپس میں بانٹ لئے جائیں گے اور مثال کے طور پر، آپ آج کے بعد ہر آنے والی رات، میرے لئے فرش پر سوئیں گے۔ چلیے اب مان لیجیے کہ اگر اس وقت آسمان سے دفعتاً ایک رتھ زمین پر اُترے اور مجھے اوپر لے جائے یا اچانک برف میں

join eBooks Telegram

آگ لگ جائے تو آپ بوکھلا جائیں گے۔ آپ کو یقین نہیں آتا لیکن پھر بھی مجھے اب باہر جانا ہی چاہیے۔

اچھا، اچھا میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا یوں جذباتی طور پر پھٹ پڑنا اور میرے ان ہذیانات کا آپ بُرا مت مانتے۔ میں نے بڑے ضبط و تحمل سے یہ باتیں کہی ہیں۔ اب چونکہ آپ اپنے متعلق گفتگو کریں گے، مجھے یہ معلوم ہو جائے گا کہ میرے مسحور کن اعترافات کے پسِ پشت جو مقاصد ہیں ان میں سے کوئی ایک حاصل ہوا ہے یا نہیں۔ مجھے تو دراصل ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ میرے اعترافات سننے والا کوئی پولیس کا آدمی نکلے گا۔ جو مجھے "عادل منصفین" کی چوری کی پاداش میں گرفتار کرے گا۔ اس کے علاوہ کیا یہ میرا خیال صحیح نہیں ہے کہ مجھے کسی اور الزام میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔؟ جہاں تک اس تصویر کی چوری کا تعلق ہے وہ ضرور قانون کی گرفت میں آ سکتی ہے۔ اور میں نے خود کو شریکِ جرم ثابت کرنے کے تمام جتن کر ڈالے ہیں۔ میں اس تصویر کو اپنے پاس رکھے ہوئے ہوں اور ہر اس شخص کو دکھاتا ہوں جو اُسے دیکھنے کا خواہشمند ہو۔ تو آپ مجھے گرفتار کر لیں گے؟ تب تو یہ بہت اچھی ابتدا ہو گی۔ اس کے ساتھ بعد کی دوسری باتوں کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ مثلاً ممکن ہے میری گردن اڑا دی جائے اور پھر مجھے موت کا خوف نہیں رہیگا۔ اور میں بچ جاؤں گا۔ مجمع ہجوم کے آگے میرا کٹا ہوا گرم، خون آلود سر بلند کیا جائے گا تاکہ وہ میری شکل میں اپنے آپ کو پہچان سکیں اور میں ایک بار پھر فتح مند رہوں گا۔ میرا کٹا ہوا سر نشانِ راہ ہو گا۔ ہر بات تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ مجھے چاہیئے تھا کہ تنہائی اور ویرانے میں رہنے پر مصر گریہ کناں جھوٹے پیغمبر کی اس اپنی زندگی کو .... ایک ان دیکھی اور انجانی گمنامی میں دفن کر دیتا۔ لیکن آپ پولیس والے تو نہیں۔؟ تب تو معاملہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کیا؟ دیکھا آپ نے، مجھے اس کا شک تھا۔ تو یہی وجہ تھی جو مجھے آپ سے اتنی عجیب یگانگت کا احساس ہو رہا تھا۔ تو آپ بھی پیرس میں وکالت کے شریفانہ پیشہ میں ہیں۔ میں پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ ہم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ کیا ہم سب ایک جیسے نہیں ہیں؟ مسلسل بات کرتے جا رہے ہیں لیکن مخاطب کوئی نہیں، اُنہیں سوالات کے پیچھے سرگرداں ہیں جن کے جوابات کا پہلے سے علم ہے یقیناً ہم سب ایک جیسے ہیں۔ تو براہِ مہربانی بتلائیے گا۔ ایک رات جب آپ دریائے سین کے پشتوں پر جا رہے تھے تو کیا واقعہ پیش آیا تھا اور آپ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے کس طرح بچا لیا؟ آپ خود ان الفاظ کو دہرائیے جن کی نہ ختم ہونے والی بازگشت برسوں سے میری راتوں کے سناٹے میں گونج رہی ہے اور جنہیں میں بالآخر آپ کی زبان سے ادا ہوتے ہوئے سنوں گا۔ "اے نوجوان عورت، ایک بار پھر پانی میں چھلانگ لگا تاکہ تجھے اور خود اپنے آپ کو بچانے کا مجھے دوسری بار موقع مل سکے۔" دوسری بار؟ بڑی

join eBooks Telegram

خطرناک تجویز ہے! ذرا تصور کیجئے، اگر واقعی ہماری یہ آرزو قبول ہوجائے؟ تو پھر پانی میں چھلانگ لگانا پڑیگا۔

سی، سی، سی، اف! پانی کتنا سرد ہے! لیکن ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ اس واقعہ کو گذرے بہت دیر ہو گئی۔ زندگی کے ہر معاملہ میں ہمیشہ ہی دیر ہوتی رہے گی، خوش قسمتی سے!!

بہارِ طفلی

بچوں اور لڑکوں کے لئے

آسان اور سلیس زبان میں نظموں کا باتصویر مجموعہ

حضرت محروم کے اس مجموعہ کے ایک ایک مصرعے میں بچوں کے لئے زندگی کا درس رہتا ہے۔ چونکہ خود ان کی زندگی مختلف تجربات سے ہو کر بیتی ہے اور اس عمر میں جب کہ غور و فکر پختہ اور شاعری گہری ہوتی ہے۔ حضرتِ محروم کا بچوں کے لئے شاعری کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا احسان ہے۔

بچوں کی ذہنی تربیت میں "بہارِ طفلی" صحیح معنوں میں نوید بہار ثابت ہو گی۔ امید ہے کہ اہلِ اردو اس مجموعہ کا شایانِ شان خیر مقدم کرینگے اور یقین ہے کہ بچے اسکو شوق سے پڑھیں گے۔

نہ صرف ہر مدرسے کے کتب خانے میں اس کا موجود رہنا ضروری ہے بلکہ رائے ہے کہ اچھے بچوں کو مدرسوں کی طرف سے جو انعامات دیئے جاتے ہیں ان میں بھی اس کتاب کو شامل رکھنا چاہیے۔

(ڈاکٹر) سید محی الدین قادری زور

قیمت: تین روپے پچاس نئے پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار۔ دھلی

join eBooks Telegram

دیویندر اسر

تخلیق، فن اور جنون

اس مسئلے پر مختلف ادوار میں کافی بحث ہو چکی ہے کہ کیا نابغہ جینیس کی ذہنی ساخت ایک پاگل آدمی کے ذہن سے مماثلت رکھتی ہے یا جیسا کہ عام خیال ہے، نابغہ کے ذہن میں محض ایک نرم سی جھلی کا فاصلہ حائل ہے اور جب یہ جھلی کسی وجہ سے ہٹ جاتی ہے تو نابغہ اور پاگل میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسی لئے شاعر کو اگر پاگل سے نہیں تو "جنونی" کے لقب سے ضرور یاد کیا جاتا ہے۔ درحقیقت اس بحث کا تعلق اس نظریے سے ہے کہ تخلیقی عمل کا سرچشمہ شعور نہیں بلکہ اس سے پرے لاشعور کی پہنائیاں ہیں۔ جن نقادوں کے نزدیک ادیب کے لئے عالم جذب کی شرط ضروری ہے۔ ان کی نظر میں ادیب عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں ادیب کا لاشعور بیک وقت تحت العقل اور فوق العقل ہوتا ہے۔ تاریخ ادب میں اس امر کی کئی شہادتیں ملتی ہیں کہ ادیب کی شراب نوشی یا افیون خوری کا سبب یہ قرار دیا گیا ہے کہ ان سے اس کے شعور کا عمل کمزور پڑ جاتا ہے اس کے تحت الشعور پر فوق النقد نگران کی گرفت اٹھ جاتی ہے جس سے اس کے تحت الشعور کی تخلیقی قوت حرکت میں آ کر محسوسات کی نئی دنیا کو جنم دیتی ہے اور فن کا ظہور ہوتا ہے اس نظریے کی ایک دوسری شکل ہے۔ یعنی ادیب تخلیقی عمل کی خاطر موزوں کیفیت یا موڈ طاری کرنے کے لئے کچھ رسوم کی ادائیگی ضروری سمجھتا ہے۔ مشہور ہے کہ شلر لکھتے وقت اپنے میز کے نیچے سڑا ہوا سیب رکھتا تھا۔ بالزاک پادری کا لباس پہن کر لکھتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ادیب کو اس کیفیت کی خاطر اپنے ماحول میں تبدیلی اور اپنی روزمرہ زندگی سے مختلف ڈھنگ کو اپنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بات بھی مانی جا سکتی ہے کہ اس قسم کے تکلفات کچھ ادیبوں کے تخلیقی عمل کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ تکلفات محض ان کی تخلیقی قوت کو حرکت میں لاتے ہیں۔ تخلیقی عمل کی تکمیل کے لئے تخلیق کی اندرونی لگن کا ہونا ضروری ہے۔ اس اندرونی لگن کے بغیر اس قسم کی چیزیں نہ صرف بے سود ہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی مخصوص دوا یا شے کے زیر اثر تخلیق میں خاص عناصر شامل ہو جاتے ہیں یا ان کا سرچشمہ ادیب کا نیوراتی نفس ہے۔ یہ سوال بھی پیدا ہوتا

join eBooks Telegram

ہے کہ کیا ادیب کا نیوراتی نفس اس کی تخلیقات کے موضوع کو بھی جنم دیتا ہے۔ یا محض ان کی تحریک ہی بنتا ہے اگر اس کی تخلیقات کا موضوع بھی اپنی سے جنم لیتا ہے۔ تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایک ادیب دوسرے سے کیوں کر مختلف ہے۔ اور اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ قاری کس طرح اس ادیب کی تخلیقات سے لطف اندوز ہوتا ہے؟ کیا اس ابلاغ کے لیے لاشعور اور کوائف مرض، (کیس ہسٹری) case history کے علاوہ شعوری عمل اور بے لاگ خارجیت کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ویلک اور وارن نے اس ضمن میں اپنی کتاب "ادب کا نظریہ" میں تحریر کیا ہے:۔

"ان میں بہت سے (ادیب) اپنا علاج نہیں چاہتے اور نہ ہی توازن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر ان کا توازن قائم ہو گیا تو ان کا لکھنا موقوف ہو جائے گا۔ معمول (نورملٹی) یا سماجی ماحول سے مجوزہ ہم آہنگی کو وہ فیلیسٹی یا بورژوا قرار دے کر نامنظور کر دیتے ہیں لہٰذا آڈن نے اس پر زور دیا ہے۔ کہ فن کاروں کو اسی قدر نیوراتی ہونا چاہیے جس کے وہ متحمل ہو سکیں۔"

ارسطو نے جینیس اور جنون کا مسئلہ کھڑا کیا۔ کچھ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جینیس اور جنون میں کوئی نفسی فرق نہیں لیمبوس نے جینیس میں جنون کی تلاش کی۔ اظہاریت اور سرریلزم کے اثر کے تحت ۱۹۲۰ء میں پاگلوں میں جینیس کی تلاش شروع ہو گئی۔ بقول شلنگ جینیس اور جنون دماغ کی دو متضاد کیفیتیں نہیں بلکہ ایک کیفیت کے دو نام ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ لیکن ہر جینیس میں جنون ملتا ہے۔ ہر نیوراسیس اگر ایک طرف جینیس کو جسمانی یا ذہنی مرض میں مبتلا کر دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی خوابیدہ جسمانی یا ذہنی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ جینیس کئی طرح کے دماغی امراض کا شکار ہوتا ہے۔ عام طور پر جو امراض جینیس میں ملتے ہیں ان میں مالی خولیا۔ میگلومینیا۔ پیرانویا۔ مونومینیا۔ شیزوفرینیا اور سام نیمبولزم کافی مشہور ہیں۔ گیٹے، فلابیر، بالزاک، اور وکٹر ہیوگو نے مالیخولیا کے مریض ہونے کا اقبال کیا ہے روسو اور شیلر اس کا شکار اس حد تک ہوئے کہ انہوں نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ یونانی فلاسفر ڈیانیس تو اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ عام طور پر مغموم رہنے کے علاوہ ادیب میگلومینیا کا شکار ہونے کے باعث اپنے آپ کو بڑی اہم شخصیت تصور کرتا ہے۔ جرمن فلسفی ہیگل نے کئی بار اپنے آپ کو عیسیٰ کا لقب دیا ہے۔ جینیس پر اکثر دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔ نیوٹن۔ شوپنہار۔ روسو۔ سوفٹ۔ کامٹے۔ آرشمیدس پاسکل، ڈیوماس، دان گو، موپاساں پر اس کے دورے کئی بار پڑے ہیں اور دیوانگی تو سمبالسٹ شعراء کی قسمت بن چکی تھی۔ جینیس میں بھول جانے کی عادت، خواب یا نیم خوابی میں کام کی صلاحیت، جرائم میں دلچسپی۔ اخلاقی کمزوری اور غیر مفاہمت پسندی اس کے نیوراتی ہونے کی علامتیں ہیں۔

join eBooks Telegram

نسر یٹ نے کہا کہ روسو کے بعد افسردگی اور اضطراب کی کیفیات فن کی تواریخ میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کیفیات کی ادبی روایت بن چکی ہے۔

تحلیل نفسی نے اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ ادیب اپنے میدان سے ہی نیوراتی (اعصابی مریض) ہوتا ہے لیکن فن کار ہونے کے ناطے وہ اس میدان کے حسرتناک انجام سے بچ جاتا ہے اور وہ واپس حقیقت سے اپنا رشتہ از سر نو قائم کر لیتا ہے۔ ایمل زولا نے پندرہ ماہرین نفسیات سے اپنے ذہن کا معائنہ کرایا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جینیس کا سرچشمہ اس کے مزاج کا نیوراتی عنصر ہے۔ ادب اور فن کے شعبے میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ادیب بنیادی طور پر نیوراتی ہوتا ہے۔ ورلین، بودلیر اور راں بو کے بارے میں یہ عام تصور ہے کہ ان کی صلاحیت کا باعث ان کا اعصابی خلل یا نیوراسس تھا۔ البرٹ مورڈیل نے اپنی کتاب "دی ایراٹک موٹیو اِن لٹریچر The Erotic motive in Literature" میں تحریر کیا ہے کہ اذنی تخلیق کا رشتہ اس کے مصنف سے وہی ہے جو کہ ایک خواب کا مریض سے ہوتا ہے۔ ایک تخلیقی جینیس کا سرچشمہ اکثر مصنف کی طفلی جنسی زندگی میں مضمر ہوتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جینیس ایک ایسا آدمی ہے جو نئی صداقت کی کھوج کرتا ہے یا حسن کاری کرتا ہے تو درحقیقت ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے بھی اپنی جبلتوں کو دبایا ہوتا ہے اور وہ اس تجربے سے ایسے نتائج پر پہنچا ہے جسے سماج تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ فرائیڈ نے اپنے مضمون "دستوئسکی اور پدرکشی" میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دستوئسکی کی شخصیت میں چار عناصر کار فرما تھے۔ تخلیقی فنکار، نیوراتی، اخلاق پرست اور گناہ گار۔ دستوئسکی کی تخلیقات اور شخصیت میں انہیں عناصر کے عکس ملتے ہیں۔

جدید ماہرین نفسیات کے قول کے مطابق ادیب محض ایک نیوراتی ہے۔ جو بغیر جانے ہوئے دفاعی عمل کا استعمال کرتا ہے۔ ان ماہرین کے نظریے کے مطابق یہ خیال غلط ہے کہ ادیب بے لاگ خارجیت سے کام لیتا ہے یا وہ اپنے وقت یا تہذیب کا اہم ترین نمائندہ ہے۔ ڈاکٹر برگلر کے خیال میں ہر ادیب خود اذیتی ساویت پرست، خود پرست، نمائش پرست یا تانک جھانک کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ اپنے لئے ناانصافیاں جمع کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ افسردہ رہتا ہے۔ اس کے کردار میں خود اذیتی کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ لیکن ساویت پرست عمل سے یہ میلان چھپ جاتا ہے۔ ادیب مستقل طور پر سماج کا باغی ہوتا ہے وہ بڑا دوں، اخلاق اور تعصبات پر برابر حملے کرتا رہتا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کی مصنوعی حملہ آوری ہے جس میں ادیب پناہ لیتا ہے۔ ادیب کی دوسری نیوراتی علامتوں میں بھی یہی دفاعی عمل کام کرتا ہے اس کے تخیل کی قوت بے پناہ ہوتی ہے اور وہ تخلیق کے ذریعے خود نمائی کے رجحان کی تسکین کرتا ہے۔

join eBooks Telegram

نیوراتی ہونے کے ناطے وہ عشق کا بیان اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا کہ ایک نابینا رنگوں کا۔ وہ اپنی تحریروں میں اب نورمل ردعمل ہی پیش کر سکتا ہے۔ کسی قسم کی شاعری میں بھی نورمل کیفیت کی عکاسی نہیں ہو سکتی۔ کیا نورمل ادیب ممکن ہے۔؟ برگلر کے خیال میں یہ ایسے ہی ناممکن ہے جیسے کہ ہم گرم برف یا انسانیت پرست نازی کی اصطلاح کا استعمال کریں۔ نورمل لوگوں میں تخلیقی قوت ممکن ہی نہیں۔ برگلر نے مزید لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے نیوراتی ہوتے ہیں ان میں ادیبوں کی حالت سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ وہ غریب ہوتے ہیں اور مغموم رہتے ہیں۔ ہر دور میں سچے ادیب کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ لاشعوری طور پر دولت، رتبہ اور مقبولیت وغیرہ کو قربان کر دیتا ہے کیونکہ اس میں خود اذیتی کا میلان بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔

ادیب اپنی تحریروں میں جو کچھ بیان کرتا ہے وہ ان خواہشوں پر مبنی ہوتا ہے جنہیں سماجی پابندیوں کے باعث زیرِ تحریر لانا ممنوع ہے۔ اپنی زندگی میں ان خواہشات کی تکمیل کی تمنا سے جو احساس گناہ یا تردد پیدا ہوتا ہے تخلیق کے ذریعے وہ ان سے نجات پا لیتا ہے۔ عام طور پر وہ یہ جواز پیش کرتا ہے کہ وہ انسپریشن کے تحت یہ سب کچھ تحریر کر رہا ہے۔ تخلیقی قوت غائبانہ ہے جس کے لئے وہ ذمہ دار نہیں اس طرح اس کا احساس گناہ اور تردد ختم ہو جاتا ہے۔ ادیب کا دفاعی عمل ہی تخلیق کی بنیاد ہے یہی عمل شراب نوشی یا دوسری جنسی کجرویوں کی اساس بھی ہے کیونکہ یہ سب ذہنی مراجعت کی ہی قسمیں ہیں۔ اسی لئے عام طور پر یہ سب میلانات اکٹھے ملتے ہیں۔ برگلر نے اسکی تشریح یوں کی ہے ہر ادیب بالغ ہونے کے ناطے اپنے لاشعوری ضمیر کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہو کر اپنی صفائی پیش کرتا ہے۔ اپنے خلاف الزامات کا جواب دینے کے لئے وہ عذر کی تشکیل کرتا ہے یعنی وہ فنی تخلیق کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ اندرونی عذر کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ ماں کے ساتھ خود اذیتی طور پر وابستہ نہیں ماں کا تو وجود تک بھی نہیں۔ ادیب تخلیقی عمل میں ماں اور بچے دونوں کا رول ادا کرتا ہے۔ وہ حسین تصورات اور الفاظ کی تخلیق کرتا ہے۔ الفاظ ادیب کے لئے ماں کے دودھ کی مانند ہیں۔ بقول اے۔ اے۔ برل شاعری عمدہ الفاظ کے چوسنے اور چبانے کے عمل کے ذریعے حسیاتی اور عارفانہ اخراج ہے اور تخلیقات کی اشاعت، ایک طرح کی خود نمائی ہے۔ نقاد بھی نیوروسس کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اپنے سے کم رتبہ والے آدمیوں کیلئے غصے کا جذبہ رکھتا ہے۔ تخیل کی اساس طفلانہ تانک جھانک کرنے کی بدلی ہوئی خواہش ہے۔ ادیب کی فنی صلاحیت اس پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اپنے ضمیر یا برتر انا سے مراعات حاصل کر سکتا ہے تاکہ وہ اپنی تخلیق میں دبی ہوئی خواہشوں کی عکاسی کر سکے۔

بچوں، نیوراتی نفسی مریض اور ابتدائی انسان اور ادیب میں مشترک خصوصیات ہوتی ہیں۔ جب کہ

join eBooks Telegram

مشترک عناصر کا رشتہ ابتدائی انا سے ہے ان میں فرق انا سے پیدا ہوتا ہے۔ تخلیق فن کی خواہش مریضانہ عمل کا حصہ ہے۔ بقول آٹورانک نیوراتی ایک ایسا فن کار ہے جو نسوانی ہو گیا ہے اور فن کار ایسا نیوراتی ہے جو ٹھیک ہو گیا ہے اور جو لاشعوری طور پر اپنا علاج خود کر لیتا ہے۔ فن کار میں نیوراسس کی فراوانی اس کی شدید دو جنسیت، کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اور جس حد تک وہ فنکارانہ ارتفاع کے ذریعے کشمکش پر غلبہ پالیتا ہے اسی حد تک وہ نیوراسس سے نجات پا سکتا ہے۔

ایڈمنڈ ولسن نے "زخم اور کمان" میں کہا ہے کہ ادیب کے لئے کسی نہ کسی جسمانی یا روحانی زخم کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس کی صلاحیت اس کے بغیر بروئے کار نہیں آسکتی

تخلیقی عمل ایک بامعنی واضح اور بامقصد عمل ہے فن کار غلطی کرتا ہے کوشش کرتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے۔ اس کا طرز اظہار اور اسٹائل اس عمل میں بدلتا رہتا ہے۔ جب کہ نفسی مرض کا شکار ادیب حقیقی دنیا میں تبدیلی لانے کے لئے تخلیق کرتا ہے اور جب اس کا مریضانہ عمل خاص شدت اختیار کر لیتا ہے تو وہ قارئین یا ناظرین کی خواہش نہیں کرتا۔ اس کے طرز اظہار اور اسٹائل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ آٹورانک رقم طراز ہے کہ اگر ہم نیوراتی اور تخلیقی فرد کا موازنہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ خوف یا ارادے کے تحت نیوراتی اپنی جبلی زندگی پر شدید دباؤ ڈالتا ہے۔ تخلیقی فرد میں قوت ارادی کا غلبہ رہتا ہے۔ یعنی وہ جبلتوں کو دباتا نہیں بلکہ ان کو ضبط میں لاتا ہے اور خوف کو دور کر کے تخلیق کی لذت پیدا کرتا ہے۔ نیوراتی اپنی انا کی رضا کارانہ تشکیل میں ابتدائی تحتریبی عمل سے پرے نہیں جا سکتا۔ اس لئے وہ سارے تخلیقی عمل کو اپنی ذات سے الگ کرنے اور اسے تصوراتی + تجریدیت کے ساتھ جوڑنے سے قاصر ہے۔ تخلیقی فرد اپنی ذات کو از سر نو تشکیل کرتا ہے جو کہ انا کی تصوراتی تشکیل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ انا تخلیقی قوت ارادی کو اپنی ذات سے الگ کر کے ذات کی تصوراتی عکاسی کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا خارجی پہلو پیدا ہوتا ہے۔

تحلیل نفسی یہ بتانے سے قاصر ہے کہ فن کار کی تخلیقی قوت کا کیا راز ہے درحقیقت نیوراسس اور فن میں کوئی رشتہ نہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ تخلیقی فرد نیوراتی ہوتا ہے۔ اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ شاعر نیوراتی سے برتر صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں اتنی قوت ہے .... کہ وہ اپنے نیوراسس کا استعمال کر سکتا ہے اور اپنی فنیٹسی کو ایک باقاعدہ فارم دیتا ہے۔ یہ سوال تو اہم ہے ہی کہ ایک نیوراتی فنی تخلیق میں کیوں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا ناکام۔ لیکن یہ سوال زیادہ اہم ہے کہ ایک کیوں عظیم فن کار بن جاتا ہے اور دوسرا اوسط درجے کا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی کہ عظیم فنکار کا نیوراسس زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ لائینیل ٹرلنگ اپنے مقالے فن اور نیوراسس

join eBooks Telegram

یں رقم طراز ہے کہ جینیس کے لئے نیوراسس لازمی شرط نہیں۔ کمان کا معاوضہ زخم ہے یا بغیر زخم کے کمان نہیں چل سکتی یا اس کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہ فیلوکٹیس کے قصے سے کہیں بھی واضح نہیں ہوتا۔ زخم کمان حاصل کرنے اور اسکو استعمال کرنے کی صلاحیت کے لئے لازمی نہیں ہے۔ یہ صلاحیت اس کے بغیر بھی ممکن ہے نیوراسس کی موجودگی یا عدم موجودگی محض اتفاقیہ ہے۔ نیوراسس تو موجودہ سماج کی ایک عام علامت ہے۔ اسے فنکاروں تک محدود کر دینا درست نہیں۔ فن کارانہ عمل سے ایسے لوگ بھی گذرتے ہیں جو خود فن کار نہیں۔ بہت سے نیوراتی لوگوں کے اظہار میں تخلیق کے شدید مظہر ملتے ہیں۔ جو دلچسپی اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اظہار فن کارانہ تخلیقات نہیں۔ دان گو نیوراتی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کے علاوہ فنکار بھی تھا ہمارے سماج میں یہ بات عام ہے کہ ایک خاص قسم کے نیوراتی لوگ فنکار کی زندگی، اس کے آدرش اور خواہشات کی نقل کرتے ہیں وہ فن کار کی ہر طرح سے نقل کرتے ہیں۔ سوائے تکمیل یا عدم موجودگی تخلیق کی کامیابی کے۔ آٹو رانک نے ایسے لوگوں کو نیم فن کار کہا ہے۔ اور انہیں فنکاروں سے الگ ٹائپ تسلیم کیا ہے۔ فن کار نیوراسس سے اپنے رشتے میں لاثانی ہے۔ وہ اپنے نیوراسس کا کامیاب خارجی مظہر ہوتا ہے۔ اسے نئی شکل دیتا ہے اور اسے دوسروں تک پہنچاتا ہے اس کا جینیس اس کے ادراک اور اس کی ترجمانی اور تکمیل کی صلاحیت میں پنہاں ہے۔

ہر آدمی چاہے وہ فنکار ہو یا نہ ہو اس میں نیوراتی علامتیں موجود ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہر آدمی میں کئی بیماریوں کے جراثیم موجود رہتے ہیں لیکن وہ اس پر خاص حالات میں ہی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ جینیس کے لئے نیوراتی ہونا ضروری ہے صحیح نہیں۔ جب ایڈمنڈ ولسن زخم اور کمان کا نظریہ پیش کرتا ہے تو وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کیوں ہر نیوراتی تخلیق کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ یا ایک ادیب دوسرے ادیب سے مختلف کیوں ہوتا ہے۔ نیوراتی میں جدوجہد اور عمل کا اثر نہیں ہوتا۔ یونگ کا یہ قول صحیح ہے کہ ہر شے کو نیوراسس کے اصول تک لے جانا شاعرانہ جینیس کے عمل کو ختم کر دینا ہے جو کہ جمالیاتی حظ کے لئے از حد ضروری ہے۔

join eBooks Telegram

سینت جان پرس

کروز و کے لئے چند تصویریں

گھنٹیاں

یہ دیوار

یہ شہر

فرای ڈے

طوطا

کھال کا چھاتا

یہ کمان

ایک دانہ

یہ کتاب

ترجمہ:۔ گریش چندر!

نظرثانی اور تبصرہ۔ باقر مہدی

join eBooks Telegram

گھنٹیاں

او ننگے ہاتھوں والے بوڑھے کردزو!
کیا تو پھر آدمیوں میں آگیا —؟
جب "ایپ ٹاورز" سے گھنٹیوں کی سسکیاں لہروں کی طرح پھیلی ہوں گی
تو ہوا بھاگے! تو ضرور رویا ہوگا۔
وہ سمندر کی لہروں پر چھنکی ہوئی چاندنی! وہ دور بہت دور سے ساحلوں کی آتی ہوئی آواز!
سنکھ کے گرد بل کھاتی ہوئی موجیں جیسے رات کے پنکھ اور ان سمٹے پنکھوں تلے گھٹا گھٹا سا
وہ تازہ انوکھا سنگیت یا سمندر تلے دبے ہوئے شور کا پھیلاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ دیوار

یہ تیرے سامنے پھیلی ہوئی دیوار، تیرے خواب کا دائرہ پاش پاش ہونے کو ہے
لیکن وہ شبیہ آواز دے رہی ہے۔
تیرا سر آرام کرسی کے چکنے بازو پر ڈھلکا پڑا ہے
تو اپنی زبان سے دانتوں کو ٹٹول رہا ہے سالن کی بو اور چکناہٹ تیرے مسوڑھوں میں
رس بس گئی ہے۔
لیکن تو اپنے جزیرے پہ جھکی ہوئی نرم بدلیوں کے سپنوں میں مگن ہے جب ہریالی بھور پر اسرار پانی
کے سینے پر نمودار ہوتی ہے۔
۔ ۔ ۔ یہ تو جلا وطن جوہر دل" کا پسینہ رس رہا ہے، یہ لانبی پھلیوں والے پودوں
کی تلخ رطوبت، سمندری کیچڑ میں اُگے ہوئے پودوں کی رسی لسی کڑواہٹ اور پھلیوں کے
سیاہ مواد کی تیزابی لذت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ تو مردھتنے کی گیلری ہیں کیڑے مکوڑوں کا کڑوا شہد ہے
یہ تو ہرے پکے پھل کی سی ترش بھور کی ہوا جو تو پیتا ہے وہ دودھیا ہوا جس میں
"بادِ مراد" کی نمکینی گھلی ہوئی ہے . . . .
مسرت! آسمان کی بلندیوں پر پھیلی ہوئی آزاد مسرت جیسے خالص کتان کی جگمگاہٹ
ان دیکھے احاطوں میں گھاس اور پتے بکھرے ہوئے ہیں اور گویا دھرتی کے ہرے ہرے فرحت انگیز بہت
بڑے لمبے دن کی ایک پوری صدی رنگی پڑی ہے۔

یہ شہر

دور تک سلیٹ سے پٹی ہوئی چھتیں یا کائی لگی کھپریلیں ہیں
چمنیوں سے ان کی سانسیں نکلتی ہوئی، چکناہٹ!
بھیڑ میں کیلے کی بساندسی آدمیوں کی بو! گھاگھروں تلے عورتوں کے گھٹے جسم،
او آسمان کے آگے پھیلے شہر!
چکناہٹ! اُگلی ہوئی سانسوں کو نگلتی ہوئی یہ مخلوق . . . . .
گندے لوگوں کے گھروں سے نکلتا ہوا دھواں، ہر شہر گویا غلاظت کا ایک حلقہ
شمعی دکان کی شیشہ دار کھڑکی پر — غریبوں کے دروازوں کے پاس پڑے کوڑے کے ڈبوں پر۔
ملاحوں کی بستی میں پھیلی ہوئی کھڑے کی بو پر۔ پولیس کچہری کے صحن میں ہچکیاں بھرتے فوارے پر کائی لگے
پتھروں کے مجسموں اور آوارہ کتوں پر
بھکاری کے پیلے گالوں پر، سیٹی بجاتے بچے پر
بیمار بلی کے ماتھے کی تین شکنوں پر . . . . .
بستی کے دھوئیں میں یہ شام ڈھل رہی ہے
یہ شہر گویا ایک رستا ناسور، ندی کی صورت سمندر کی طرف بہہ رہا ہے۔
گردزد! تیرے جزیرے پر یہ شام، جھکا جھکا آسمان سمندر کے گیت گائے گا۔
اور خاموشی ٹکر ٹکر تکنے تنہا تاروں کی حیرت کو دوچند کردے گی۔
"کھول دو پردے اور چراغ بھی نہ جلاؤ"

join eBooks Telegram

تیرے جزیرے پر شام ہو گئی ہے، یہاں وہاں چاروں طرف جہاں جہاں سمندر کا بلوریں شیشہ خم کھاتا دکھائی دیتا ہے، یہ پلک رنگ شام، آسمان اور سمندر کے تانے بانے سے بُنے راستوں پر پھیلی ہے۔

ہر چیز میں یہاں وہاں ختوں کے "پلڈ زما" کی سی گاڑھی لیس دار نمکینی سی سموئی ہوئی ہے۔
روغنی خوابوں میں مست پرندہ اپنے پروں کے ہنڈولے میں جھولتا ہے اور کھاڑی کے پانی میں گھو کھلا گٹر کھایا گویا بہرا کچل اپنی آواز کو ناپتا ہوا گرتا ہے۔
وسیع سمندر کے دائرے میں سنگین کیچڑ سے لپٹا میٹھی نیند سوتے جزیرے کو "مجھ بیچ" سے آئے گرم سمندری دھارے دھو رہے ہیں۔
پھیلے ہوئے سمندروں کے پودوں کی جڑوں تلے دھیرے دھیرے گھومتی مچھلیاں کیچڑ میں بلبلے چھوڑتی ہیں اور ان سے بھی آہستہ رو چتکبری سانپ سی مچھلیاں تاک میں بیٹھی ہیں۔
کیچڑ میں جان سی پڑ گئی ہے۔ سنو! گھو کھلی سیپیوں میں "کھڑ کھڑ" کرتی ان ننھی سی جانوں کی لرزشوں کو سنو!
دیکھو نیلے آسمان کے ایک ننھے سے گوشے پر اچانک دھوئیں کا گالا لیکن وہ تو آپس میں الجھ کر اڑتے مچھروں کا ایک گچھا ہے۔ پتوں میں چھپے ہوئے جھینگر ایک دوسرے کو ہولے ہولے پکارتے ہیں اور دوسری معصوم جانیں آنے والی رات سے سہمی سی برسات کی پہلی جھڑی سے بھی ترل سروں میں گاتی ہیں۔۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔۔ وہ تو موتی نکلنے سے پھولے ہوئے زرد گل پھڑے ہیں
چکیلے چکر کھاتے پانی کے نوحے! پھولوں کے کٹورے، ریشمیں سیال کٹورے،
وہ اندر وہ جو پھوٹ کر کھل اٹھا ہے۔ یہ بڑے بڑے ملکورے کھاتے مسافر پھول، یہ سدا بہار پھول یہ جو ساری دنیا میں ہمیشہ اگتے ہی رہیں گے
وہ ٹھہرے پانی میں گھمریاں کھاتے پون کا رنگ، وہ تاڑوں کے پتوں کی سرسراہٹ ـــ
اور نہ کوئی دور سے بجھ نکلنے کی آواز یعنی دور وہ جھونپڑی نہیں، وہ جھونپڑی بھی نہیں، شام کا دھواں بھی نہیں، اور وہ مسالے کی بو میں لپے تین پتھر بھی نہیں
لیکن چمگادڑیں اپنی ننھی چیخوں سے شام کا دامن کتر رہی ہیں۔
مسرت! او آسمان کی بلندیوں پر پھیلی آزاد مسرت!
۔۔۔۔ کروڑو! تو وہاں ہے اور تیرا چہرہ کھلی ہتھیلی کی مانند رات کے اشاروں کے

join eBooks Telegram

سامنے ہے . . . . .

"فرائی ڈے"

دھوپ میں تیرا قہقہہ
گویا ہاتھی دانت
وہ تیرا گھبراتے ہوئے دوزانو ہونا
وہ تیرے دونوں ہاتھ مٹی کے برتنوں کو چھوتے ہوئے سے
او فرائی ڈے ! وہ تیرے کتنے سبز پتے اور تیری پرچھائیں بھی کتنی انوکھی اور وہ تیرے لمبے ہاتھ دھرتی کی اور جھکے ہوئے سے، جب کہ اس کم گو آدمی کے آس پاس روشنی میں تو گھومتا تھا اور وہ روشنی میں تیرے انگ انگ کی نیلی دھارائیں !
اب انہوں نے تجھے پرانا لال کوٹ دے دیا ہے تو چراغوں سے
تیل اور مودی خانے سے کھانا چراتا ہے اور اُس موٹی باورچن کے چکٹ گھاگھرے کو للچائی آنکھوں سے گھورتا ہے اور وردی پر لگے چمکتے پیتل کے بٹنوں میں اپنی آنکھوں کی چمکتی عیاری دیکھتا ہے۔
پھر وہ تیرا زہر خند !

طوطا

یہ ایک اور تصویر !
• ایک بگلے ملاح نے اُسے بڑھیا کو دے دیا اور اسنے بیچ دیا
وہ روشندان کے قریب زینے کے پاس پنجرا لٹکا ہوا ہے
وہیں جہاں اندھیرا دن کے غلیظ کپڑے سے لپٹا ہوا ہے جیسے
گلیوں کا رنگ !
کرو ذو ! ۔ وہ رات کو ایک تیز چیخ سے تیرا سواگت کرتا ہے جب تو

join eBooks Telegram

بیت الخلاسے لوٹتے ہوئے، اپنے جھلملاتے چراغ کی لو کو سنبھالے، صحن
کا دروازہ کھولتا ہے۔

پر اوچراغ والے آدمی، اس سے تجھے کیا واسطہ :۔
تو اس کے گول گول دیدوں کے گرد جمے کیچڑ کو دیکھتا ہے اور اس کے
پاس دوسرا حلقہ کتنا بے جان ہے اس کے بیمار پر بیٹ میں لتھڑے
ہوئے ہیں۔
اے بدنصیبی ! اپنا چراغ بجھا دے !! —
پرندہ چیخ اٹھا ! —

کھال کا چھانا

یہ چھانا !
یہ اب تو گرد سے اٹا پھپھوندی لگا اوپر کی کوٹھڑی میں پڑا ہے
تین پاؤں کی لنگڑی میز کے نیچے
بلی کے لئے ریت سے بھرے ڈبے اور ہڑوں سے بھرے ٹوٹے پیپے کے درمیان یہ پڑا ہے۔

"یہ کمان"

تو آتشدان کی بھڑکتی آگ کے پاس، بالکل سُن پھولدار شال میں ملفوف بیٹھا
شعلوں کی لپلپاتی زبانوں کو دیکھ رہا ہے۔
اتنے میں گاتی خاموش تاریکی کو توڑتی ہوئی ایک آواز آئی۔
یہ تو تیری کمان کی تانت ٹوٹنے کی آواز ہے
اور اس کا پراسرار ریشہ ریشہ شق ہو گیا ہے۔
جیسے کسی سورما کے ہاتھوں میں سوکھا ڈونڈا

ایک دانہ

تونے وہ اُدا اُدا دانہ جو تیری کھال کی واسکٹ میں رہ گیا تھا
پھولوں کے گملے میں بو دیا تھا
دیکھ! کوئی کلہ بھی نہیں پھوٹا! —

یہ کتاب

آتشدان کے لبوں پہ ایک نوحہ ہے
اور یہ برستی رات، شہر کی طرف، ایک لمبے سفر پہ روانہ ہورہی ہے
پھر تیرے دل میں وہ ایک مبہم سی بات اظہار کے لئے مچلتی ہے۔

وہ تیرا روشن افروز جلاوطنی کا خیال، جو کہ اس پیچ وتاب کھائے ہوئے طوفان سے کہیں بہت دُور ہے — !
"اے خدا میں کیسے تیری دکھائی ہوئی راہوں پہ چلوں!"
"کیا تو مجھے اس شام کے الجھاوے میں یونہی چھوڑ دے گا"
"اور وہ بھی کتنے لمبے دنوں کے بعد جب کہ میں محض تری ہستی کے سہارے پروان چڑھتا رہا تھا —"
"میں جو کہ تیرے سکوت، تیرے سائے اور تیری آواز کا شاہد رہا تھا —"
• شاید تو یونہی شام کے الجھاوے میں نوحہ کناں تھا

— لیکن تو کھڑکی کے پاس اتنا اُداس بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی اپنی کھوئی ہوئی عظمت پانے میں ناکام رہا ہو۔
اور جیسے تیرے سامنے سڑک پہ ایک دیوار پھیلی ہوئی ہو۔

join eBooks Telegram

پھر تو نے وہ کتاب کھولی ہو گی
اور تیری تھکی ہوئی انگلیاں لکھی ہوئی پیشین گوئیوں پہ بھٹکتی رہی ہوں گی
اور تیری نظر کہیں بہت دور کھوئی ہوئی سی —
اور تو اس رخصتی لمحہ کا منتظر ہو گا جب کہیں سے تیز ہوا کا ایک عظیم جھونکا آکر تجھے یہاں سے اڑا لے جائے گا۔
جیسے تیری منتظر آنکھوں کے آگے بادلوں کو چیرتا ایک بہت بڑا طوفان آجائے گا۔

---

join eBooks Telegram

باقر مہدی

پرس کی طویل نظم

سوغات کے قارئین کے لئے پرس کا نام نیا نہیں رہا ہے اس کے بارے میں جدید نظم نمبر میں والیس فاولی کا مضمون ایک اچھا تعارف تھا۔

بیسویں صدی میں اب تک جن شعراء کا نام جدید شاعری کی عظمت کی نشاندہی کرتا ہے پرس یقیناً ان ممتاز شعراء میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے میرا مطلب ہے کہ دلیری، ایلیٹ، رلکے، ایذرا پاونڈ، میکافسکی، لورکا، پبلو نرودا اور دوسرے چند شاعروں کے ساتھ پرس کا نام بھی دنیا کے اعلیٰ ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔

پرس کا نام الکسس لیجر ہے وہ ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوا تھا، ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۰ء تک وہ فرانس کی وزارت خارجہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہا تھا۔ اس کا یہ خیال ہے اس کے پیشہ اور شاعری میں بڑا بُعد ہے اور اسی لئے اس نے اپنا قلمی نام سینٹ جان پرس رکھا ہے اب تک اس کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۱۹۶۰ء میں اُسے نوبل پرائز بھی دیا گیا، اس موقع پر انتھونی ہارٹلے نے (انکاؤنٹر، نمبر ۸۹) اس کی شاعری پر ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا اس کا خیال ہے کہ پرس ان کلاسیکی المیہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو انسان اور دنیا دونوں کو قابلِ قدر تصوّر کرتے ہیں۔ ان کو "فانی" سمجھتے ہوئے بھی وہ انسانی زندگی کے وجود کو بجید "غنیمت" جانتے ہیں۔ اسی لئے اس کے خاص موضوعات میں، ارضی جنت، جلا وطنی، تخلیق کے سرچشمے، اور شاعر کی اجنبیت کا بار بار ذکر ملتا ہے۔

پرس نے اپنی ایک طویل نظم "ہوائیں" میں شاعر اور اس کے مقام کے بارے میں کہا تھا: "زندگی کی شاہراہ میں شاعر بھی ہمارے ساتھ ہے وہ ہمارے زمانے کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کا مقصد پیغامات کی معنویت کا بیان ہے اور یہ کام وہ اپنے دل کے پرخلوص جذبات کی مدد سے کرتا ہے۔ یہ کوئی دستاویز نہیں ہے بلکہ اصل میں "حقیقی شے" ہے جسے شاعر کا دل صرف محفوظ ہی نہیں رکھتا بلکہ پوری تفصیل سے بیان کرتا ہے۔"

پرس کی اکثر نظموں میں ایک ایسا غمناک اثر ہوتا ہے جس کی شدت اپنے گہرے نقوش ذہن و دل

پر مرتسم کر جاتی ہے۔ ایلیٹ نے اس کی نظم "اینابیس" کا ترجمہ کر کے اس کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا تھا۔ وہ اپنی ایمجری میں بالکل ننھی ننھی سی جاندار اور معمولی چیزوں، یہ نہیں سے واقعات اور بظاہر بے بضاعت انسانی زندگی کو اس طرح پیش کرتا ہے جیسے یہ دنیا بغیر ان کے خالی خالی نظر آئے گی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دوربین کے بجائے خوردبین سے ہر شے کو دیکھتا ہے جبھی تو ایک رنگ میں کئی رنگ اور ایک قطرے میں طوفان دکھائی دیتا ہے۔ ان اجزا کی مدد سے شاعرانہ فضا کی تخلیق کرنا بعید محال معلوم ہوتا ہے مگر پرس اس جزئیاتی مصوری کو ایک غنائی کیفیت بخشتا ہے ایک نقاد کا یہ بھی خیال ہے کہ پرس کے یہاں رزمیہ اور غنائیہ اندازِ بیان پہلو بہ پہلو ملتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے امتزاج سے ایک نیا آہنگ بھی وہ بناتا ہے۔

"کروزو کے لیے چند تصویریں" اس کے پہلے مجموعۂ کلام ELOGES (تعریفیں) میں شامل ہے یہ نظم اس نے بائیس سال کی عمر میں لکھی تھی۔ اس کو لکھے ہوئے تقریباً آدھی صدی گذر چکی ہے مگر اس کی تازگی میں کچھ زیادہ کمی نہیں آئی ہے۔ جن لوگوں نے ڈانئیل ڈیفو کا ناول رابنسن کروزو پڑھا ہے انھیں اس نظم میں اب بھی ایک نئی لذت کا احساس ہوگا۔

کروزو ۲۸ سال تک ایک جزیرہ میں "مقید" رہا اور اپنی زندگی کے بہترین دن اس نے فطرت کی قربت میں گذارے تھے یہ افسانوی کردار تو ایک کلاسیکی درجہ رکھتا ہے جیسا کہ پاسترناک نے کہا تھا کہ "اس نے گھاس کو آہستہ آہستہ اُگتے ہوئے دیکھا ہے اور ہواؤں کے گیت سُنے ہیں۔ پھولوں کو سرگوشیاں کرتے دیکھا ہے"۔ یہ مشاہدہ پرس کے یہاں بالکل دوسرے طریقے سے آیا ہے۔ وہ اپنی روزانہ کی مصروفیات میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود طفلی کی معصومیت، تجسس اور فطرت سے لگاؤ کو پروان چڑھاتا رہا ہے۔ یہ ورڈسورتھ سے بھی بالکل مختلف ہے اس میں مابعد الطبیعاتی موشگافیاں نہیں ہیں بلکہ "حقیقت کا عرفان" حاصل کرنے کی سعی پیہم ہے۔

پرس نے سوچا تھا جب کروزو اتنی طویل جلاوطنی کے بعد واپس آیا ہوگا تو اس کے لیے انسانوں میں رہنا کتنا عجیب معلوم ہوا ہوگا۔ اور "ایبی ٹاور" کی گھنٹیاں وقت کا احساس دلانے کے ساتھ جزیرے پر گذرے ہوئے دنوں کی یاد بے اختیار دلاتی ہوں گی۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہی ہے کہ وہ تہذیب میں آ کر اپنی شخصیت کو پاش پاش ہونے سے نہ بچا سکا۔ اس کا نہ صرف سکون چھن گیا بلکہ وہ شور مچاتی ہوئی دنیا میں اور بھی تنہا نظر آنے لگا۔ اور اس طرح پرس نے "تہذیب کے مسموم" اثر سے کروزو کی شخصیت کو بکھرنے ہوئے پیش کیا ہے اس میں ایک المیہ کا احساس ہے وہ جزیرہ پر اکیلا ہوتے ہوئے بھی اپنے کو کتنوں سے وابستہ سمجھتا تھا اس کی بلی، طوطا، اس کا "غلام" فرائی ڈے اور اس کی ڈائریاں، بائبل، درخت، سمندر، تارے اور بدلتا ہوا موسم، یہ ساری چیزیں اس سے

join eBooks Telegram

مانوس تھیں اور اب اس "جلاوطنی" کے بعد وہ کتنا بے کس، لاچار اور سہما سہما نظر آتا ہے۔

ان تصویروں میں چھوٹے چھوٹے "کلوز اپ" (CLOSE UP) کے ذریعہ کتنی ہی تصویریں بے شمار رنگوں میں پیش کی گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بڑے فلمی کیمرے سے ننھی ننھی اشیاء اور دور تک پھیلے ہوئے شہر کی تصویریں کھینچ رہا ہے یہ اس وقت کی تصویر کشی ہے جبکہ ویلری نے کہا تھا "ابھی سب کچھ نہیں کھو گیا ہے البتہ ہر شئے میں موت سرایت کر گئی ہے" اور یہ وہی زمانہ تھا جس کے بارے میں ژید کا خیال تھا کہ اب بھی دنیا خوبصورت بن رہی ہے۔" یہ پہلی جنگِ عظیم سے فوراً بعد کا زمانہ تھا کروند و کے لئے چند تصویریں ELOGES کے ۲۵ سنہ کی دوسری اشاعت میں شامل کی گئی تھی۔

اس نظم کی امیجری آج بھی ایک تاثر رکھتی ہے یہ شہر گو کہ لندن سے زیادہ پیرس کا "نقشہ" معلوم ہوتا ہے مگر اس شہر میں کتنے ہی آنے والے شہریوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ فرائی ڈے جس کے بارے میں کروند و نے اپنے "سفرنامہ" (کیونکہ ڈائینیل ڈیفو کا ناول کروند و کا سفرنامہ ہے) میں بڑی تعریفیں کی تھیں "تہذیب" میں آکر ایک بید گھٹیا سا شخص بن کر رہ گیا ہے ورنہ کروزو کا خیال تھا کہ وہ بید معصوم، ذہین اور حساس شخص ہے۔ کروزو نے فرائی ڈے کو دوسرے وحشیوں کے چنگل سے بچایا تھا اور اُسے پڑھا کر انسان بننے میں مدد دی تھی۔ کروزو کا سب سے اچھا ساتھی فرائی ڈے ہی ثابت ہوا تھا اور آج وہ "چراغ سے تیل" چراتا ہے۔ وہ کھال کا خوبصورت چھاتا خاک میں اٹا ہوا پڑا ہے۔ کمان ٹوٹ گئی ہے۔ اور کتاب اس کے سفر کی کہانی "راکھ" کی طرح پڑی ہوئی ہے۔ اور اب اس کو ایک ہی امید رہ گئی ہے کہ وہ کیسے "وہاں" تک پہنچ جائے۔ جہاں تنہائی میں بھی وہ خوش تھا، مطمئن تھا اور زندگی میں مستقبل کی روشنی تھی مگر اب ___ کون "طوفان" اُسے وہاں لے جا سکتا ہے۔ اس کا اختتام کافی اندوہ گیں ہے۔

اس نظم کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۴ء میں "لادسے داستے" نے کیا تھا اور یہ نظر ثانی کے بعد ۱۹۵۶ء میں پہلی بار ELOGES میں شامل کر کے انگریزی ایڈیشن میں شائع ہوئی ہے۔

ترجمہ در ترجمہ سے اچھی شاعری گذر کر بھی اپنی "عظمت" کی جھلکیاں نمایاں کر ہی دیتی ہے۔ یہ پرس کی ابتدائی کوششوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کارنامہ "اینا بیسس" اور "سی مارک" سمجھی جاتی ہیں۔ آڈن نے "سی مارک" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"شاعر یہی بیان کرنا چاہتا ہے کہ زندگی کی لامتناہی قوت قدرتی اور انسانی حادثات اور سانحات پر فتح پا ہی لیتی ہے وہ ہر چیز میں زندگی کے وجود کی تقدیس کا متلاشی ہے۔ اور یہی خصوصیت اس کی سب نظموں میں ملے گی۔ سینٹ جان پرس کی شاعری ابتدائی انسانی زندگی کی بازیافت اور تخلیق کے سرچشموں سے منسلک رہنے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔"

join eBooks Telegram

کلکِ موج

عبدالعزیز خالد

پریشاں می نویسد کلکِ موج احوالِ دریا را

join eBooks Telegram

(۱)

وہ شہرِ آرزو ہی رہا نہ شہرِ آرزو کے مکیں

لُٹا ہے جب سے دل کا نگر کہیں دل کو قرار نہیں

اگر شاخِ چنار قلم، گیاہِ نودمیدہ ورق

مدادِ اشکِ چکیدہ بنے تو لکھوں حالِ قلبِ حزیں

جسے میں کھو چکا ہوں، وہ شے حقیقی دائمی ابدی

جو ہے مرہونِ وہم و گماں، معلق بینِ شک و یقیں

بذاتِ خود ہر ایک بشر ہے اک دنیائے بوقلموں

خلل ہے الجنونُ فنوں۔ ہر اک ذرہ ہے مہرِ مبیں

دل لٹائے دل! یہ ہے طعلواِل فریبِ آئینہ و سو لکل

بہت عیدؔ میں یہ حسیں، لُٹا ان پہ نہ دولت و دیں!

(۲)

پیپی رُوس

بہار .. ..

عرصہ ہوا .. ..

عنیزہ .. ..

ل SUNT ALIQUID MANES: LETUM NON OMNIA FINIT
LURIDAQUE EVICTOS EFFUGIT UMBRA ROGOS
PROPERTIUS

۲ PAPYRUS

join eBooks Telegram

(۳)

فاش کیا رند نے رازِ نہانی
سبحانی قال: ما اعظم شانی![1]

جامے سے باہر نہ ہوا ہے گلِ احمر
خوابِ شب ضعیف ہے عہدِ جوانی

بادِ بہاری چلی چھپ گئے تارے
مہ نے کیا زیبِ تن جامہ کتانی

بس گئے دیوار و در عطرِ حنا سے
بسترِ گل سے اٹھی رات کی رانی

ساعتِ ساعات ہے یہ شبِ شبہا
چھیڑ گئے وقت کی کوئی کہانی

شاہد گلچہرہ ساقی و مطرب
کس نے کہا عشرتِ دہر ہے فانی؟

بولی تنک کر تنک آنکھ جو جھپکی
خالدی! تو نے مری قدر نہ جانی

وصل کو جب بھی کہا مرگِ محبت
تجربہ بولا نہ کر کذب بیانی

جام شبانہ ملے نانِ شبینہ
شب ہمہ شب میں کروں زمزمہ خوانی

کشش کشِ بند کمر، بس لبِ بوسہ
قلقلِ مینا و رناتِ اغانی

دخترِ حوا سے ہے رونقِ دنیا
ہائے وہ نعمت جو ہے دآنی و فانی!

بندہ روئے خوش و صورتِ زیبا
اے بنی آدم میں ہوں صیدِ غوانی!

خواہشِ صہبا بھی ہے شوقِ صنم بھی
ہائے یہ رد مان کی ریشہ دوانی

رنگ و بوئے بوستاں رخ سے نمایاں
لفظ کو روشن کرے نورِ معانی

رقعہ ادبار و منشور شقاوت
علم اگر جہلِ نو کا بنے بانی

زندگی دفن کی ہیں گھاٹیاں اوگھٹ
شہرت و عورت کی لت سودہ پرانی

اے سخن آرا، بہل فخر و تعلّی!
عارضہ دق ہے لافِ ہمہ دانی

رقص کے آہنگ سے سیکھ توازن
شعر میں ہو آبجو کی سی روانی!

---

[1] سبحانی سبحانی ما اعظم شانی — بایزید بسطامی

join eBooks Telegram

(۴)

سراپا فغاں ہے مری زندگی
تری یاد میں کس قدر تھک گئی

ترے نقشِ پا کو ہزاروں سلام
مرا نام لانا نہ لب پر کبھی

ہے پیشِ نظر کشفِ سترِ حبیب
زباں نغمہ سنجِ غمِ عاشقی

غمِ یم المنایا، حلیف الہموم
غنی ہو کہ مفلس ہر اک آدمی

فکن موسرا شِئتَ او مُعسرا
یہ اوجھل نہ ہو مقصدِ زندگی

پکارو گئے، لیت لیعود الشباب!
بہارِ جہاں ہے گھڑی کی گھڑی

تو دانی کہ گُل باصنوبر چہ کرد؟
کبھی شہرِ و آفاق کی سیر کی؟

وہ زُہرہ جبیں ذات دلِّ ملیح
مجھے نائے نالاں بنا کر رہی

کہاں ہند و زُلفا و دَعد و رباب
کہاں حسن یا نو کہاں ماردی؟

بثینہ کہاں ہے، کہاں عاتکہ
نہیں طاہرہ قرۃ العین بھی

مئے ارغوانی سے سیراب لب
حنا بستہ کف، سانولی رس بھری

نوا زندہ بلبل کرے گفتگو
گرا زندہ آہو بھبک کر چوکڑی

مزاج اس کا نازک، طبیعت غیور
پری مت کہو، وہ ہے روپا متی!

(۵)

بڑھتی ہے سرِ شام بے قراری
اندوہ نہیں امرِ اختیاری

بھادوں کی بھرن، جاڑوں کی مہاوٹ
دل چاک کو ہر بوند ہے کٹاری

وہ زلفِ سیہ رُخ پہ ہے پریشاں
یا چاند تہِ ابرِ نو بہاری

ہر شخص غمِ ذات میں فنا ہے
غیروں کی کرے کون غمگساری

ہوتا ہے تعصب سے خلط مبحث
آئینِ نجابت ہے بُردباری

join eBooks Telegram

برپا رہے طوفانِ باد و باراں
کرتے رہے میخوارے گساری

خالق کا دیا درجہ آدمی کو
یہ بھی ہے تری شانِ کردگاری

فنکار کریں کارِ بوستانی
لکھی ہے مقدر میں خاکساری

تلوار کی جھنکار، نالۂ نَے
دونوں کو ملانا ہے چتر کاری

ہو فن میں حلیمی بھی سرکشی بھی
دو لخت دکھے تو یہ خامکاری

تخلیق ہے دشوار، شعر آساں
تخلیق ہے ادراک و حسن کاری

(۶)

اے اولوالعزم کوہ پیماؤ!
جبلِ زہرہ کی بھی سیر کرو

بے نیازی میں خطرۂ جاں ہے
نرم چکنی زمیں ہے جسم کے چلو

چھوئی موئی سے ہیں نزاکت میں
حسن والوں کا احترام کرو

طور اُن سے نیاز مندانہ
سینہ تانے چلیں تو چلنے دو

ان کے پہلو میں راحت و لذت
چاہو گر عافیت تو دُور رہو

اُن کی باتوں کا اعتبار نہیں
جو کریں دل لگی تو کرنے دو

ہے یہ مَے خانہ ساز انگوری
نارِ پستاں کو داب کر چوسو

ہیں سراپا یہ کان سونے کی
بیلچہ لے کے رات دن کھودو

تب زرِ داغ دل کے دام چکیں
جب نثارِ رہِ نگار کرو

سنگِ مرمر میں دودھ کے چشمے
دستِ قدرت کے معجزے دیکھو

مخملیں گھاٹیاں طلسماتی
ان کے نیچے نہ دیر تک جھانکو

یہ نشیب و فراز سحر کے ہیں
جب پہ سایہ پڑے وہ پتھر ہو

گفتگو عاج و آبنوس میں ہے
دخل انداز تیسرا کیوں ہو

join eBooks Telegram

یہ چٹانیں جو ہاتھی دانت کی ہیں — بیضئہ الماس کے کہو ان کو
جوگ سادھا ہے کیوں بروگ لیا — کون تھا وہ اتا پتا تو دو؟
یاسمیں پر کھلا ہے سُرخ گلاب[۱] — مطلعِ فجر ہے رُوئے نیکو
میں اسے شادن کمیل کہوں — تم اسے لالۂ بہار کہو
اس جہانِ سرود و صہبا میں — کون نردوش ہے گنہگار دو؟
سرگراں عشق، حُسن رم خوردہ — بوئے گُل کس طرح مقید ہو؟
سوچ لو پہلے آگم اندیشہ — بعدہٗ مستقل مزاج رہو
رقت و سوز ایک نعمت ہے — شکوہ اغیار کی طرح نہ کرو
مہک اٹھیں فضائیں خوشبو سے — گل گلستاں کرو بیاباں کو
مَے پیو عنبریں پیالوں میں — اور لوبان و عود سلگاؤ
وہ مئے ناب جس کا اک جرعہ — جام جمشید و کاسِ کیخسرو
جاں فزا ہے نوائے عود و رباب — ساز چھیڑیں مغنّیوں سے کہو
زیرکی ہے ہر امر میں تعدیل — پاؤں باہر کبھی نہ حد سے دھرو
سرِّ قدرت ہے مخفی و ملفوف[۲] — رمز و تمثیل کی زباں سیکھو
خوفِ مزرع سے شوق معلق ہے — اعلم و اورعِ زمانہ بنو
حالِ تقدیر کا کسے معلوم — زندگی مختصر ہے تیز چلو!

---

[۱] LA ROSE EST LE PARFUM DES DIEUX.
LA ROSE EST L' HONNEUR DES PUCELLES
QUI LEUR SEIN BEAUCOUP AIMENT MIEUX
EVRICHER DE ROSES NONVELLES
QUE D'UN OR, TANT SOIT PRECIEUX.
RONSARD

[۲] AND LIFE IS VEILED AND HIDDEN EVEN
AS YOUR GREATER SELF IS HIDDEN AND VEILED
KHALIL GILERAN

join eBooks Telegram

میں نے کچھ نہیں کہا

محبوب خزاں

رات اُس کو خواب میں دیکھ کر
میں نے کچھ نہیں کہا
چار سال کی تھکن جواں ہوئی
تشنگی، بڑھ کے بیکراں ہوئی

ہاں مگر جب آنسوؤں کی نرم گرم تازگی
آس پاس دلکشی، بکھر گئی
اور ایک سایہ سا سرھانے آکے تھم گیا
میں نے یہ کہا کہ "اے مرے خدا
تو بڑا رحیم ہے
اُس کا دل دو نیم ہے
اُس کے رنگ اُس کے حسن کو نکھار دے
اس کے دل کا بوجھ اتار دے
تو اُسے سکوں دے
تو اُسے سکوں دے، مجھے جنون دے
اُس کے دکھ اُس کے درد چھین لے
اس کے روگ مجھ کو دے
میں گناہگار ہوں"

رات اُس کو خواب میں دیکھ کر
چار سال جیسے پھر اسی طرح گذر گئے
"چار سال کس طرح گذر گئے؟"
دل یہ سوچتا رہا
میں نے کچھ نہیں کہا —

بلراج کومل

یہ میری حسین صورت!

میں چاند کی قاش کھا چکا ہوں
لہو، سلگتے حسین سورج کا پی چکا ہوں۔
سیاہ راتوں کو میں نے دیکھا ہے صبح کی وادیوں میں بہتی ہوا میں گھلتے
دنوں، چمکتے دنوں کو ـــــ دھندلی،
اداس شاموں کے پار جاتے۔
میں ہم سفر تھا
میں ہم سفر ہوں
جو کل تھا اُس کا
جو آج ہے اور کل بھی ہوگا!

مگر یہ میری حسین صورت!
قریب آؤ، قریب آؤ
قریب سے اس کو دیکھ لو ـــــ کل
اسے نہ پہچان پاؤ گے تم
مجھے نہ پہچان پاؤ گے تم!

join eBooks Telegram

شفیق فاطمہ شعریٰ

تارِ رگِ جاں

یہ ڈوبتا دل اس پر تمہاری یاد دل کا پرتو

کیسا سہانا پیارا نظارا، کتنا سہارا

سب نرم لہجے، سب طنز انکے سفاک بیدرد

سب زخم گہرے سب کچھ بھلا دوں تم کو صدا دوں

مجھ سے مری جاں ہلکی سی رنجش بھی ناروا ہے

میری محبت شبنم میں ڈوبی لالی سحر کی

تم کو خبر کیا دنیا میں ہم نے کیسے بسر کی

اکثر تو یہ دل نسیاں کا مارا سب بھول بیٹھا

اکثر صلیب غم ہائے پنہاں تنہا اُٹھالی

مجھ سے مری جاں تم کو نہ چھینے تاروں کی گردش

میں نے تو جو بھی پایا سو کھویا بے آہ و فریاد

میں نے کہا غم اک حال بد ہے احوال دل کا

join eBooks Telegram

اس سے گزرنا اک عمل ہے اور ایفا ہے لازم
میں نے کہا عشق اور زندگانی اور علم وفن سب
راز نشاط دائم نہ پا کر بھٹکے ہوئے ہیں
میں نے کہا دل فتحِ مبیں کے آیات سے ہے
فتح مبیں ہوں میں اور میرا آغاز و انجام

پھر اس کی خاطر کتنی شکستیں میں نے اُٹھائیں
پیکان گزیدہ آہو کی مانند پھرتی رہی ہوں
اور خود مرے خواب میرے شکاری میری طلب میں
آندھی کی صورت محو تعاقب صحرا میں بن میں
زخموں سے میں چور پھرتی رہی ہوں، پھرتی رہوں گی
جب تک گیاہ و گل کے سبو ہوں شبنم سے لبریز
جب تک رگِ تاک ٹوٹے نہ نشے سے جب تک محبت
شبنم میں ڈوبی لالی سحر کی مجھ کو پکارے
ایفا ہے لازم — میری نگاہیں تم پر لگی ہیں
مجھ سے مری جاں تم کو نہ چھینے تاروں کی گردش

———— ❋ ————

join eBooks Telegram

قاضی سلیم

کھلونے

جھن جھنا جھن ناچتی گڑیا
ٹھمکتی تالیوں پر تالیاں دیتی بندریا
گولیاں بڑھ کر تڑاتڑ داغتا انگریز
وحشی ریچھ اچھلتے
مست ہاتھی سر ہلاتے جھومتے

اک نمائش گاہ میں سب محو تھے
روز و شب کے پیچ الٹے گھومتے کھلتے رہے

اور روحیں کل کے گھوڑے پر سوار
آباد ویرانوں سے اڑ کر
اک طلسمی شہر میں پہونچیں
یکایک یوں لگا
جیسے وطن میں لوٹ کر پھر آگئیں

روز و شب کے پیچ الٹے گھومتے کھلتے رہے
نو دمیدہ اور ننھے پھول
اپنی تختیاں بستے اٹھائے بے نیازانہ بڑھے
دیوارِ ماہ و سال کے ہر ایک روزن سے نکل کر
یک بیک اگلی صفوں میں آملے

join eBooks Telegram

شاذ تمکنت

گونج

یاد کے گنبدِ بے در کی اسیری کیا ہے
کوئی آہٹ، کوئی سِسکی، کوئی فریاد تو ہو
آپ اپنے کو پکاروں کہ ذرا جی بہلے
یہ خرابہ کسی عنوان سے آباد تو ہو
لیکن اِک خوف کہ گونجی ہوئی آواز کہیں
اپنی ہی روح کے سنّاٹے کا کہرام نہ ہو
ایک کھوئے ہوئے لہجے میں ترا نام نہ ہو

○

محمود ایاز

حسنِ مطلق

(مارا بہ تو صد حساب باقیست)

تری آرزوؤں کو گذرے ہوئے جن دنوں کا الم ہے،
تری آرزوؤں کو جن آنے والے دنوں کی تمنا ہے،
وہ دن یہیں ہیں۔
ہر اک فاصلہ، روز و شب، قرب و دوری کا ہر رنگ،
یہ دوش و فردا کے سب مرحلے،
ایک قیدِ زماں، و مکاں کے صلے ہیں۔
بہار و خزاں، وصل و ہجراں،
ہمارے ہی اشک و تبسم کے جوڑے ہوئے سلسلے ہیں۔
شب و روز — دو برق پا ساعتیں ہیں
جو اک دوسرے کے تعاقب میں گرداں چلی ہیں
یہ گردش شب و روز کی میرے، تیرے دکھوں کا مداوا نہیں ہے۔
کہ اس گردشِ روز و شب میں کوئی دوشِ و فردا نہیں ہے۔
بس اک حسنِ مطلق، فضاؤں، خلاؤں میں پھیلی ہوئی روشنی ہے،
جو تیری مژہ پر،
مرے رنگ و آواز کے درد میں جاگتی ہے

یہی روشنی زندگی ہے، یہی لمحہ کُل ہے — خدا ہے۔!!

محمود ایاز

اسپتال کا کمرہ

تمام شب کی دکھن، بے کلی، سبک خوابی
نمودِ صبح کو درماں سمجھ کے کاٹی ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی ہر آہٹ
اجل گرفتہ خیالوں کو آس دیتی ہے
مگر وہ آنکھ، جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

افق سے صبح کی پہلی کرن ابھرتی ہے
تمام رات کی فریاد اک سکوت میں چپ
تمام شب کی دکھن، بے کلی، سبک خوابی
حریری پردوں کی خاموش سلوٹوں میں گم
جو آنکھ زندہ تھی، خاموش چھت کو تکتی ہے
مگر وہ آنکھ، جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

نمودِ صبح کی زرتار روشنی کے ساتھ
مہکتے پھول دریچے سے جھانک کر دیکھیں
تو میز و در پہ کسی درد کا نشاں نہ ملے
اگا لدان، دواؤں کی شیشیاں، پنکھا
کنواری ماں کا تبسم، صلیب آویزاں
ہر ایک چیز بدستور اپنی اپنی جگہ
نئے مریض کی آمد کا انتظار کرے
اور ایک آنکھ، جو سب دیکھتی ہے
ہنستی رہے — !!

محمود ایاز

کفّارہ

چمپئی دھوپ میں پکتی ہوئی فصل،
گھر کے آنگن میں مہکتے ہوئے پھول ۔
عالمِ خواب کی بھولی ہوئی تصویریں ہیں

جسم کی آگ، خمِ لب، لغزشِ مشک فشاں،
پردۂ آب کی مٹتی ہوئی تحریریں ہیں۔
گردشِ جام، ہنسی، دورِ طرب، — شورِ فغاں
ایک سناٹے میں ڈھلتی ہوئی آوازیں ہیں

اس سے پہلے کہ یہ ہنستے ہوئے لب،
خاک کا رزق بنیں۔
اس سے پہلے کہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے چراغ،
قبر کی سرد و سیہ رات میں اندھے ہو جائیں،
اس سے پہلے کہ ہم اس خاک کا پیوند بنیں
اپنی آنکھوں سے وہ آنسو مانگو
جس سے دامن کے یہ داغ،
یہ ہاتھوں کا لہو دھو جائیں —!!

join eBooks Telegram

محمود ایاز

نوحہ

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
خروشاں سمندر کی موجیں تجھے ڈھونڈتی ہیں
خروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے

●

سیہ رات اشکوں کی شبنم میں سوئی ہوئی ہے
ہر اک پل، ہر اک لمحہ ماضی کا، زندہ ہے، موجود میں جاگتا ہے۔
مگر تیرا پیکر
تہہِ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے۔
مرا دل، کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے، تجھے ڈھونڈتا ہے

●

میں آسودۂ ریگ، خاموش، اس رات کی جلتی آنکھوں کو دیکھوں
سیہ رات میں ٹمٹماتے ہوئے ان ستاروں سے پوچھوں۔
خروشاں سمندر میں ڈوبا ہوا چاند،

join eBooks Telegram

کس اجنبی سرزمیں پر تبسم کناں ہے۔
نقوشِ کفِ پا کی منزل کہاں ہے؟

●

یمِ زندگی سیل در سیل بہتا ہوا،
ایک لمحے کو رُک کر، پلٹ کر نہ دیکھے
سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
فقط اک شبِ بے صدا جاگتی ہے
شبِ بے صدا پوچھتی ہے
بپھرتی ہوئی موجِ دریا کدھر سے چلی تھی؛
کدھر کو چلی ہے؟
ترا دل، کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے،
کسے ڈھونڈتا ہے ــــ!!

●

محمود ایاز

پرانی بات

دل نے ضرورتوں کے تقاضے سمجھ لئے

دورِ زمانہ دل کا ہر اک چاک سی گیا!

تم گردو بادِ وقت کے طوفاں میں کھو گئیں

میں بھی غمِ حیات کا ہر زہر پی گیا

join eBooks Telegram

محمود ایاز

شبِ چراغ

بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدت
بلند و بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاشِ رزق میں نکلا ہوا یہ جمِّ غفیر
لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیلِ رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں
ہر ایک اپنی ہی آوازِ پا سے رو گرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں۔
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں۔
اور اس ہجوم سرِ راہ سے گذرتے ہوئے،
نہ جانے کیسے تمہاری وفا، کرم کا خیال،
مری جبیں کو کسی دستِ آشنا کی طرح،
جو چھو گیا ہے تو اشکوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔
سموم و ریگ کے صحرا میں اک نفس کے لئے،
چلی ہے بادِ سمنت تو عمر بھر کی تھکن،
سمٹ آئی ہے ایک آنسو میں۔

یہ وہ گہر ہے جو ٹوٹے تو خاکِ پا میں ملے
یہ وہ گہر ہے جو چمکے تو شبِ چراغ بنے!

محمد علوی

گگارین کے نام

چاند پہ جاؤ،
یا تاروں کو چھو آؤ،
"میں کیا ہوں"
"یہ سب کیا ہے"
"یہ سب کیوں ہے"
یہ آوازیں ساتھ ساتھ ہی آئیں گی
آس پاس منڈلائیں گی
دور نہ ہونے پائیں گی !!

٭

join eBooks Telegram

ساقی فاروقی

انہدام

اے ہوائے خوش خبر اب تو نوید سنگ دے
میرے جیب و آستیں میرے خوں کو رنگ دے

میری عمر کج روش مجھ سے کہہ رہی ہے تو،
اک طلسم ہے تجھے ٹوٹنا ضرور ہے
تیری بد سرشت فکر تیرا قیمتی لہو،
کھردری زباں سے چاٹتی چلی گئی
تو، کنارِ بحر کی وہ چٹان ہے جسے
تند و تیز موجِ درد کاٹتی چلی گئی

اس حریصِ جسم کا انہدام ہی سہی
ایک خون کی لکیر تیرے نام بھی سہی

ساقی فاروقی

روتی مٹّی

یہ نرم مٹّی جو میری مُٹھی
میں بند ہے اور مہک رہی ہے
یہ گرم آنسو جو میری آنکھوں
میں قید ہیں اور چمک رہے ہیں
یہ نرم مٹّی یہ گرم آنسو۔
نہ جانے کیسے بچھڑ گئے تھے
اور اب ملے ہیں تو پوچھتے ہیں
وہ درد کے وہ فراق کے دن
جو راستے میں ہمیں ملے تھے
وہ اس طرف تو نہ آئیں گے اب
ہمیں جُدا تو نہیں کریں گے
یہ پوچھتے ہیں تو سوچتا ہوں
وہ بات کہہ دوں۔ نہیں کہوں گا
نہیں کہوں گا، نہیں کہوں گا
میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں
ابھی یہ مٹّی مہک رہی ہے
ابھی یہ آنسو چمک رہے ہیں

join eBooks Telegram

مغنی تبسّم

خاک نژاد

اک خود سپارِ حرفِ تمنا کہاں کہاں
پھرتا رہا متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

اس وادیٔ خموشی میں اترا ہے کارواں
آہوں کا، آنسوؤں کا۔ گریباں کی دھجیاں
ہیں لکۂ ہائے ابرِ پریشاں۔ ستارہ جو،
میں پا بہ گِل کھڑا ہوں کسی پیڑ کی طرح
اِک دشتِ انتظار میں، چشمے سے کچھ پرے۔
غلطیدہ اپنے خوں میں ہے سرِ آفتاب کا۔
تنہائیوں کی آگ میں جلتا ہے سب جہاں
ہر چیز گر رہی ہے سیاہی کے غار میں
دل بجھ گیا کہ سارے در و بام سو گئے؟
حدِّ فراز۔ حدِّ نظر ہے۔ خبر نہیں
آگے، ادھر نشیب میں جنگل ہے؟ گاؤں ہے؟
صحرا ہے؟ سبزہ زار ہے؟، یا عرصۂ خلا؟

میں پا بہ گِل کھڑا ہوں کسی پیڑ کی طرح
شوریدہ حال، سر بگریبان و مضمحل
واماندگی کی راہ سے آئی ہوئی حیات
سستالے گیسوؤں کی گھنی چھاؤں میں ذرا۔
پھر کیا خبر کہ غم کی مکافات ہو، نہ ہو
پھر کیا پتہ کہ صبح نہ ہو رات ہی رہے۔

join eBooks Telegram

مُغنی تبسّم

حرفِ ناشنیدہ

کوئی آواز جیسے قطرہ قطرہِ نغمگی ٹپکے
کوئی آواز کوئل کی صدائے مضطرب، افسردہ، آوارہ
کوئی آواز لمحاتِ طرب کا ڈوبتا سایہ
کسی آواز میں ساری لگاوٹ تاجرانہ، عجز سرتاسر گدایانہ

مرے اطراف چہروں کا سمندر ہے۔
ہر اک چہرہ ہے اک لمحہ شب و روزِ تمنّا کا۔
ہر اک لمحہ صدا دیتا ہے۔
ہر آواز کرتی ہے تعاقب دوسری آواز کا
بازیچۂ اصوات ہے دنیا۔

یہ سب چہرے کسی سازِ شکستہ کی صدائیں ہیں،
ازل کا نغمۂ جاں بخش چھیڑا جس کے تاروں نے۔
اسی کی آرزو ہے آج بھی ذوقِ سماعت کو
جو آوازوں کے اس محشر میں حرفِ ناشنیدہ ہے:
زمانہ ہے، شمارِ روز و شب میں جو نہیں آتا۔

٭

join eBooks Telegram

مُغنی تبسّم

چہرے

میں نے کتنے چہرے دیکھے

شہروں میں اور دیہاتوں میں

بازاروں میں اور میلوں میں

نزہت گاہوں میں باغوں میں

کچی کلیاں، کھلتے غنچے، پھول کئی رنگوں کے دیکھے

روپ انوپ آنکھوں میں بسے ہیں:
گیسو — اندھیارے کی لتائیں،

پیشانی — مہتاب،
کجیلے نینوں میں جھیلوں کی ٹھنڈک،

ابرو کی محرابیں — سجدہ گاہیں زمان و مکاں کی،
پلکیں — جن کے سائے میں سستائیں پل دو پل آشائیں من کی

ستواں ناک،

لبوں پر جیسے صبح شفق گوں انگڑائی لے،

join eBooks Telegram

رخساروں کی آنچ میں دامن ایمانوں کے جلتے دیکھے

گھر کے چھوٹے سے آنگن میں
پھلواری کی رسیا نظریں کیاری کیاری منڈلاتی ہیں
ایک اک پھول مہک اٹھتا ہے —
چمپا، جوہی، رات کی رانی
کرشن کمل، بیلا، گل، نسریں
عیسیٰ کا گہوارہ، چمیلی!

پی کے درس کی پیاسی نظریں جب ناکام پلٹ آتی ہیں
بیتے لمحوں کی یادوں کے ایون میں آہوں کی نسیمیں چلتی ہیں
اشکوں کی شبنم کلی کلی کا منہ دھوتی ہے
ایک اک پھول مہک اٹھتا ہے۔
ایک اک چہرہ یاد آتا ہے۔

join eBooks Telegram

نذیر احمد ناجی

ایک نظم

ہوا چلی، ہوا چلی۔
گھنے طویل جنگلوں کو نیند سے جگا چلی۔
اُداس خامشی کو گدگدا چلی۔
خزاں کی زرد سیج سے کسی کی یاد،
آنکھیں ملتی اُٹھ کھڑی۔
چراغِ درد لے کے سرد ہاتھ پر،
بھٹک کے پات پات پر،
تھکی تھکی سی روشنی لُٹا چلی۔

میں اجنبی، کہ جس کے سر پہ دھوپ کا کڑا سفر
گرا ہوں راہ بھول کر،
گئے زمانے کے مہیب کنڈ میں
پھنسا پڑا ہوں ہچکیوں اشکوں کے پیاسے جھنڈ میں
یہ بے بسی تو کھا چلی۔
بساطِ دل پہ نقشۂ شکستِ دم بچھا چلی

مگر وہ مند مند مسکراتی موت،
بھرے گی جام زندگی،
مجھے نہ اب بلائے گی۔
مجھے نہ اب بلائے گی۔
کہ آج اس کی یاد بھی،
چہار سمت دوریوں کی تیرگی بچھا چلی۔
ہر اک نشان مٹا چلی
ہوا چلی۔

join eBooks Telegram

اسلم انصاری

فاؤسٹ

(علم مطلق کے متلاشی کے روپ میں)

میں علم و حکمت کی وادیوں میں بھٹکنے والا، زمانے بھر کی
بصیرتوں کو لرزتے دامن میں بھر کے اب سوچتا ہوں، منزل
کہاں ہے میری ــــ نہ کوئی ورجل، نہ کوئی رومی

جو رہنما ہو
جہانِ عرفان و آگہی کے لہو بھی رستوں کی کہکشاں تک۔
یہ لفظ و معنی کے دھندلکے ہیں، یہ شعر و نغمہ کی وادیاں ہیں،
یہاں سے واں تک عظیم "کل" ہے؛ وہ "کل" کہ جس میں
طویل صدیوں کی داستاں ہے، وہ ایک سایہ
کہ جس کے دامن میں کتنے لمحوں کے کارواں چھپ کے سو گئے ہیں
وہ بخ کدہ ساعتوں کا جس میں ہر ایک آواز سرمدی ہے۔
وہ نے جو اپنی ہی گونج ہے ــــ میں اُسی کی رتھ پر سوار ہو کر
اِس ایک لمحے سے پوچھتا ہوں ــ جو "اب" ہے یعنی،
جو آنے والی مسافتوں کو بہا کے نزدیک لا رہا ہے۔
عظیم لمحے! (ابد کنارِ "اب!")
وہ کون تھا جس نے ہر زمانے میں ہم کو عرفاں کی سزا دی؟
وہ کس کی "تعظیم" لازمی تھی؟ وہ کس کی "تکریم" ناروا تھی؟
وہ کون تھا جس نے آگہی کا صلہ ہمیں زہر سے دیا تھا؟
وہ کس کی چاہت تھی جس میں ہم نے صلیب کی نوکِ خار چومی؟
عظیم ساعت! میں پوچھتا ہوں، وہ کب تلک ہم سے خوں بہا لے گا؟
کب تک عرفان و آگہی کے
لہو بھی رستوں کی کہکشاں خونچکاں رہے گی؟

join eBooks Telegram

گوہر نوشاہی

سفر درد

ہاں!
مجھے جب ہوا کے لبادے میں دیکھو تو کہہ دو کہ ——
معصوم ہے، گناہوں سے آگ اور پانی کے شر سے حفاظت میں ہے
سبز پتوں میں چھپتا ہوا دیکھ کر یوں کہو ——
کتنا بے کس تھا، مجبور تھا، زہر نے نیلے پانی کی آغوش میں لے لیا ہے
مگر جان لو!
سبز پتوں میں چھپ کر بھی میرے لئے زندگی کی ہر اک آرزو
روشنی پر سیاہی کے دھبے کی مانند ہے
میں فرشتوں کے ملبوس میں اجنبی تھا
مگر اس سے ہٹ کر
مجھے آگ، مٹی، ہوا، نیلے پانی نے تن ڈھانکنے کو اگر کچھ دیا ہے تو
وہ ذہن اور آنکھ کے واسطے ایک تاریک پردہ ہے
جس پر ہزاروں بھٹکتی ہوئی آرزوؤں کے چہرے بنے ہیں

———

join eBooks Telegram

چاند کی سوغات

کاوش بدری

زرد رو چاند گھٹاؤں کے تموج میں اسیر
اپنے ماتھے پہ لئے کاکلِ پیچاں کی لٹیں

دیر سے سوچ میں ہے
اِک مصوّر کی طرح، ایک مغنّی کی طرح!
زیرِ لب بادۂ گلگونِ تمنا کا خروش
چشمِ پرآب میں یخ بستہ خیالات کی لو
دور آفاق میں بکھرے ہیں منوّر آنسو
چوُر ہیں دستِ گہربار کے کنگن ہر سو
جیسے پگھلے ہوئے احساس کے انگارے ہیں
جیسے دامانِ افق زار میں غم کی کلیاں

. . . .

چاندنی زرد خلاؤں کی تہوں میں گم سم
اپنی رخشندہ صباحت کو چھپائے

دیر سے سوچ میں ہے
رات آئینہ بکف دیر سے حیراں حیراں
محوِ نظارہ ہے اس بزم میں کب کیا ہوگا؟

. . . .

چند دھنکے ہوئے بادل کے حسیں گوشوں سے
ایک نغمہ کی کرن دیر سے دھندلائی ہوئی
جھیل کی سمت رواں ہے کسی آہٹ کے بغیر
شاخساروں میں مہکتی ہوئی کلیوں کی قطار
جھیل کی سطح کو گُریز کئے
اس کرن کو رگِ پنہاں میں بسا لیتی ہے
کسی نادیدہ حسینہ کے لئے !!

join eBooks Telegram

وحید اختر

عدم سے عدم تک

بہت دنوں سے خیال کا خواب سے کوئی سلسلہ نہیں ہے
خموش راتوں کی ہولناکی میں نغمگی کا پتہ نہیں ہے
درِ تخیل پہ کوئی دستک، نہ کوئی پرتو، نہ کوئی آہٹ
جو وقت گذرے ہزاروں سانپوں کی صاف سن لیجیے سرسراہٹ
زماں کی گدلی سیاہ گہرائیوں میں یوں رات ڈوبتی ہے
پھسل پھسل کر ہر ایک لمحے کی لاش دریا میں گر رہی ہے
کوئی صدا ہے تو تیز سیٹی کی تلملاتی ہوئی فغاں ہے
پولیس کی موٹروں کی آواز خامشی کی نگاہ باں ہے
حسین یادوں کا کوئی جھرمٹ اگر حدودِ نظر تک آئے
تو سرسراہٹ بھی آنچلوں کی فضا کا عفریت سن نہ پائے

○

ہمارے دل کی اداس بستی میں اس سے پہلے بھی کب سکوں تھا
جو یاد بھی تھی تو سر بہ زانو، خیال بھی تھا تو سرنگوں تھا
ہماری راتوں کو یوں بھی کب تھی حسین خوابوں کی سیج حاصل
نہ نیند آتی، نہ چین ملتا، جنوں ہی رہتا شریکِ محفل

خرد کا پہرہ کہیں ہو لیکن، ہماری بستی میں کب اثر تھا
جنوں ہی شیرازہ بندِ غم ہے، جنوں ہی برہم زنِ خبر تھا
یہ ہم نے مانا کہ زندگانی خود اپنی آتش میں تپ رہی تھی
مگر شکستہ فگار امیدوں کے خوں کی مالا تو جپ رہی تھی
وہ خوں کی مالا کچھ ایسی ٹوٹی کہ دانہ دانہ بکھر گیا ہے
انہیں اٹھا کر خموش لمحوں کا قافلہ بھی گذر گیا ہے

چلو کہ اب کس کو ڈھونڈتے ہو
کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے
افق کے اُس پار دیکھنا کیا
زمیں کہیں، آسماں کہیں ہے
جو تم نے دیکھا، جو تم نے سوچا
خیال تھا وہ سراب کا سا
جو تم نے چاہا، جو تم نے مانگا
سوال تھا وہ حباب کا سا
زمیں کے اس گھومتے کرے پر
قدم کسی کے جمے نہیں ہیں
عدم کی ظلمت سے جو چلے تھے
کہیں وہ اب تک تھمے نہیں ہیں
جسے سمجھتے ہو رات اپنی
وہ نصف دنیا کا روزِ روشن
جسے سمجھتے ہو دن کی ہلچل
وہ نصف دنیا کی شب کا مدفن
اخوت و حریت کے لب پر
سوال حیرت سے تھم گیا ہے
جبیں پہ انسانی دوستی کے
لہو لومبا کا جم گیا ہے

○

بہت دنوں سے خیال کا خواب ہے کوئی سلسلہ نہیں ہے
خموش راتوں کی ہولناکی میں نغمگی کا پتہ نہیں ہے

join eBooks Telegram

کتابیں کہتی ہیں یا زندگانی حسین خوابوں کا مدعا ہے
پیمبروں نے دیا ہے مژدہ زمیں کا بھی کوئی خدا ہے
ہے قولِ شعر و ادب محبت سے آسمان و زمیں ہیں قائم
ہے رقص و نغمہ کا حکم سرشاریٔ تمنا جہانِ دایم
اٹھو، ہم اپنے غموں کی لاشوں کو گہری قبروں میں دفن کر دیں
جہاں اندھیروں کے ناگ بیٹھے ہیں ان دراڑوں کو ضو سے بھر دیں
چلو کہ اک قافلہ مہ و مہر کے سفر پر روانہ ہو گا
مکاں کی نارسا حدوں تک قدم قدم پر اک فاتحانہ ہو گا

○

مگر یہ کیا ہے، جہاں بھی جاؤ | زمین ہی مرکزِ نظر ہے
زمین زائیدہ آرزو ہی | کہیں ستارہ، کہیں قمر ہے
یہی وہ معشوقِ بے وفا ہے | جسے کہیں بھی نہ بھول پائیں
جو دُور ہو کر بھی کھینچتی ہے | ہزار شیوے، ہزار ادائیں
یہی ہے مولد، یہی ہے مقتل | یہی ہے دریا، یہی ہے ساحل
یہی وطن ہے، یہی سفر ہے | یہی ہے جادہ یہی ہے منزل

چلو کہ پھر اپنے اس حقیر و عظیم مرکز کی سمت لوٹیں
خیال کا رشتۂ شکستہ تصوّرِ گمشدہ سے جوڑیں!
کتابِ ماضی کو حافظے کے نہاں کدے سے اٹھا کے دیکھیں
غلافِ شام و سحر ہٹائیں، غبارِ نیرنگِ وقت جھاڑیں

join eBooks Telegram

نہ جانے کتنے ہی موسموں کے قدم نے روندا سطر سطر کو
مٹے مٹے سے حروف بخشے گئے ہیں یادوں کے اس نگر کو
ابھی ہیں کچھ سرخیاں ہیں ایسی جو دل کے خوں سی چمک رہی ہیں
کچھ ایسے عنوان بھی ہیں جن میں ابھی تک آنکھیں چھلک رہی ہیں
یہ ایک چہرہ جو یاد آتا نہیں ہے دیکھا تھا کب، کہاں، کیوں
یہ اک تبسم کی جگمگاہٹ لکھی ہوئی ہے بھلا یہاں کیوں
یہ اک نشترِ نہ جانے کس کے تغافلِ ظلم کا نشاں ہے
یہ ایک غنچہ نہ جانے کس بے زبان لمحے کی داستاں ہے
یہ ایک گرمی کی دوپہر اس جگہ ابھی تک کھڑی ہوئی ہے
یہ ایک بارش کی شام کس کے فراق میں اب بھی رو رہی ہے
یہ ایک جاڑے کی صبح کس کے لبوں کے شعلے کی منتظر ہے
یہ ایک تنہا اداس شب کیوں کسی سے ملنے کو یوں مصر ہے
یہ ایک چہرہ، یہ اک تبسم ہزاروں چہروں کی انجمن ہے
یہ ایک غنچہ، یہ ایک نشتر سکوت کے ساز کا سخن ہے
یہ صبح، یہ شام یہ دھند لکے عبارت ایسے کتابِ ماضی
یہ انتظار اور ناامیدی، یہ زندگی ہے خرابِ ماضی
جنہیں نہ پایا، جو مل گئے تھے، ہیں سب ہی گم گشتہ ورمیدہ
ہر آرزو ہے خزاں چشیدہ، جو یاد ہے وہ اجل رسیدہ
ہر ایک پل آفرینشِ یک جہانِ نوادر ازل کا پیماں
مگر وہی پل قیامتِ یک جہانِ کہنہ کا بھی ہے عنواں

join eBooks Telegram

ہر اک نفس خود وجود سے منزلِ عدم تک کی رہ گذر ہے
ہر ایک پل پر یہ جینا مرنا نئے جہانوں کا خود سفر ہے
جو لوگ بھی اس سفر میں ملتے ہیں، مل چکے ہیں کبھی ملینگے
وہ سب ہی ماضی کے ساتھ تاریکیوں ہیں اک روز جا بسیں گے
ہر اک نفس کی حیات میں بھی قضا کے پیکاں چھپے ہوئے ہیں
ہر ایک موجِ زماں کی تہہ میں اجل کے عفریت ہنس رہے ہیں
جسے سمجھتے ہو زندگی تم، ہے اڑتے طائر کا اڑتا سایہ
جسے ازل اور ابد کہیں وہ عدم ہے یا ہے عدم کا سایہ
حیات خود موت کے سمندر میں ایک ننھا سا لہے سفینہ
اُسی اندھیرے میں ڈوبتا ہے، یہ چیر دیتا ہے جس کا سینہ

سُنو کہ انفاس کا جرس منزلِ قضا کا پیام بر ہے
یہ زندگی زندگی ہے کوئی کہ مرگ ہی مقصدِ سفر ہے
کتاب بھی حافظے کی ہے مُردہ گھر، جہاں میتیں بھری ہیں
ذرا سی بھی روشنی ملے تو نکل کے قبروں سے ناچتی ہیں
بہ حکمِ اربابِ دین و دنیا جو یادیں زندہ چُنی گئی ہیں
جو حسرتیں نا امیدیوں کی چتا میں جل کر ستی ہوئی ہیں
بغیر ہم سے کہے سُنے کچھ، جو پیارے چھپ کر بچھڑ گئے ہیں
مسرتِ قتلِ عام میں جو بھرے پُرے شہر اُجڑ گئے ہیں

join eBooks Telegram

وہ دل کی خلوت میں حافظے سے اُبھر اُبھر کر پکارتے ہیں
غم و خوشی، مرگ و زندگی کے نئے نئے روپ دھارتے ہیں
یہ چاہِ کنعانِ خود گشی میں جو ایک چہرہ چمک رہا ہے
جو زندگانی کے زہرِ قاتل کا جام پی کر دمک رہا ہے
یہ آج سے چند سال پہلے ہماری دنیا کا ہم نفس تھا
یہ گوشت اور پوست تھا ہمارا، مسرت و غم میں ہم قفس تھا
لگا ہیں ڈھونڈیں تو اسکو پاتی نہیں ہیں زندانِ آرزو میں
کہیں نہیں ہے سُراغ اُس کا رگوں کے بہتے ہوئے لہو میں
ابھی تو گذرے ہیں چند موسم کہ نام اُس کا بھی زندگی تھا
گواہ ہیں یہ رُتیں خزاں کی کہ وہ بھی اک دن شگفتگی تھا
مگر اب اُس کا خیال اپنے وجود پر ہے قضا کا سایہ
چھینتی یادیں بھی چھین لیتی ہیں خواب آنکھوں سے کیوں خدایا
ہم اپنی بے خواب جلتی آنکھوں میں زندگی کی چِتا جلائے
جہاں بھی زندہ وجود ڈھونڈیں، ملیں وہاں موت ہی کے سائے
کروڑوں لمحوں کی لاش اٹھائے ہر ایک دن تھک کے ڈوبتا ہے
اسی جلوسِ قضا کو لوگوں نے زندگی کا لقب دیا ہے

○

join eBooks Telegram

عزیز حامد مدنی

غزل

سیارہ نفس رات جواں ہے کہ نہیں ہے
اک قافلۂ تیز رواں ہے کہ نہیں ہے

نازک ہیں بہت اس کے خد و خال کی باتیں
محضر بھی کوئی پردگیاں ہے کہ نہیں ہے

احوال بھی پوچھا تو حریفانِ جنوں نے
اب دادِ طلب وحشتِ جاں ہے کہ نہیں ہے

ویسے تو یہ فردِ غمِ جاں جل نہ سکے گی!
شعلہ کوئی نوخیز و جواں ہے کہ نہیں ہے

مجھ کو تو ہے بے خواب ہواؤں کو پرکھنا
آپ اپنی جگہ یہ غمِ جاں ہے کہ نہیں ہے

خوابِ در و دیوار لئے تیز ہوا میں
جاتی ہوئی شب، عمرِ رواں ہے کہ نہیں ہے

ٹوٹا ہوا دل جادۂ دریافت پہ رکھنا
بنیادِ تغیر، مری جاں ہے کہ نہیں ہے

جی سن سے ہوا بادہ کشو مے کی طلب سے
اس میں بھی کوئی شرطِ دکاں ہے کہ نہیں ہے

ویسے تو محبت میں بہت جی کا زیاں ہے
بے دورِ محبت بھی زیاں ہے کہ نہیں ہے

خلیل الرحمن اعظمی

غزل

ترتیب دے رہا ہوں دیوانِ عاشقی کو
لکھ لکھ کے کاٹتا ہوں عنوانِ زندگی کو

تو ساتھ چل سکے گی اے گردشِ زمانہ؟
اب اک نئے سفر پر جانا ہے آدمی کو

گمراہ ہو کے ہم نے ڈھونڈی ہیں اپنی راہیں
ایماں دعائیں دیتا ہے میری کافری کو

گھر سے نکل پڑے ہیں اب کس کی جستجو میں
پہچانتے نہیں ہیں ہم آج سے کسی کو

در پے رہا ہے جن کے انبوہِ کم سواداں
وہ خوب جانتے ہیں آشوبِ آگہی کو

کیا دیکھ کر کروگے یہ دامنِ دریدہ
ہے دیکھنا تو دیکھو دل کی شکستگی کو

برسوں پھرے ہیں ہم بھی مثلِ غزالِ وحشی
پہلو میں لیکے تیری خوشبوئے دلبری کو

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں اک ایک پنکھڑی کو

کل بٹ رہا تھا انکی محفل میں آبِ حیواں
ہم لوٹ آئے لے کر ناموس تشنگی کو

ہے آج کونسا دن، آنکھوں کو کیا ہوا ہے
آواز دے رہی ہیں ہر سمت روشنی کو

join eBooks Telegram

بشیر بدر

غزل

میری یادوں کی اک اک گلی سو گئی، میرے خوابوں کے سارے مکاں سو گئے
دل شبِ تار کی سلطنت ہو گیا، جب سے اشکوں کے شہزادگاں سو گئے

پتھروں کی زمیں۔ پتھروں کے شجر۔ پتھروں کے مکاں۔ پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا، ہم کدھر کو چلے، کس گلی شام آئی۔ کہاں سو گئے

کیا ہوا۔ آج کیوں خیمۂ زخم سے کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے
ہم تو سمجھے تھے اب شہرِ دل مٹ چکا، تھک گئے درد کے کارواں سو گئے

اُس کی آمد پہ دل کی تمناؤں نے روشنی کے گھروندے بنائے بہت
ایک وہ کیا گیا، سب دیئے بجھ گئے، آرزوں کے سارے مکاں سو گئے

نفرتوں کے الاؤ میں جلتے بدن۔ زیست کی دوپہر میں سلگتے چمن
عہدِ دانش کے مارے یہ انساں نما۔ پیار کی چھاؤں پائی جہاں سو گئے

عقل کی لشکری آہنی آہٹیں۔ جیسے پتھرا گئیں خوشبوؤں کی دکاں
دل کے بازار میں خاک اڑنے لگی، ڈر کے یادوں کے سوداگراں سو گئے

آج کی رات اتنی اندھیری ہے کیوں آج کی رات اتنی اکیلی ہے کیوں
جو سرِ شام ہم کو جگا بیٹھے تھے ایک آواز دے کر کہاں سو گئے

فکر نو کا ترجمان

سہ ماہی **سیپ** کراچی

شائع ہو گیا

جسکو پاک و ہند کے ممتاز ترین ادیبوں کا تعاون حاصل ہے

تنقید ۔ افسانے ۔ تراجم ۔ نظمیں ۔ ڈرامے
گیت ۔ دوہے ۔ طنز و مزاح اور تبصرے
وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔

صفحات :- ۳۰۰

اپنے شہر کے ہر بک اسٹال سے حاصل کیجئے۔

منیجر :- **حلقۂ فکرِ نو**

وزیر مینشن ۔ بلاک ڈی ۔ شیر شاہ کالونی ۔ کراچی

تبصرے

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

join eBooks Telegram

میگھ ملہار (افسانے)

مصنف :- ممتاز شیریں

ضخامت :- ۳۲۸ صفحات

قیمت :- چھ روپے

ناشر :- لارک پبلشرز۔ کراچی

افسانوں کے اس مجموعے پر تبصرہ کرنے میں دو دقتیں درپیش ہیں۔ پہلی دقت اس مجموعہ کی مصنفہ، دوسری دقت اس کا خود نوشت دیباچہ۔

کتاب کے گرد پوش کے فلیپ پر مخصوص انداز کی تصویر کے نیچے ایک پیر و مرشد کا سرٹیفکیٹ درج ہے جس کا پہلا جملہ ہے: "ممتاز شیریں اُردو کے ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں جن کی تاریخ ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔" میں اس جملے کو یوں بدلنے کی اجازت چاہتا ہوں: "ممتاز شیریں اُردو کے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جن کی تاریخ ہی شہرت کی خاطر منصوبہ بندی سے شروع ہوتی ہے۔" آپ چاہیں تو تاریخ کی جگہ ادبی زندگی اور شہرت کی جگہ خود نمائی بھی رکھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے یہ رائے صرف میگھ ملہار پڑھ کر نہیں قائم کی ہے بلکہ ان کا پورا ادبی "کیریر" میرے پیشِ نظر ہے۔ لیکن یہاں میں صرف ان شواہد کی بات کروں گا جو میگھ ملہار کے صفحات پر ملتے ہیں۔

شہرت کی خواہش اور اس کے حصول کی کوشش شاید کوئی قابلِ مواخذہ جرم نہیں لیکن اس مقصد کے لئے جو طریقے اور ذرائع استعمال ہوتے ہیں ان کا لحاظ افادیت پرستی کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے زیادہ اہم نہ سمجھا جائے لیکن اخلاقی نقطۂ نظر سے ضرور اہم ہے۔ اخلاقی یا غیر اخلاقی کی اصطلاحات اگر آج کل بے معنی

join eBooks Telegram

ہوگئی ہوں تو ہم معیوب اور غیر معیوب کے الفاظ بھی استعمال کر سکتے ہیں حالانکہ کسی چیز کو معیوب یا غیر معیوب قرار دینے کی تہہ میں بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی قدر ہی کارفرما ہوتی ہے۔ ممتاز شیریں نے ادب میں یا ادب کے ذریعے، شہرت اور مقام حاصل کرنے کے لئے جو منصوبہ بندی کی ہے اس کی روداد خاصی تفصیل طلب ہے افسانوں کے سالانہ جائزے، سرقہ، ترجمہ، تحریف، تقلید عسکری، پاکستانی ادب کا نعرہ، "روحانی وطن کا پُر جوش خیر مقدم" "ترسلمانی" کا جا و بے جا مظاہرہ، تعلقات اور "تعلقاتِ عامہ" کا استعمال و استحصال، "آزاد دنیا" کی حمایت، غرض زینوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جن پر سے گذر کر ممتاز شیریں آگے بڑھی ہیں۔ لیکن اس سارے عمل میں بظاہر کسی غیر اخلاقی یا معیوب طریقۂ کار کا استعمال اگر نظر نہیں آتا تو یہ صرف ان کی کامیاب سیاست اور ہوشیار منصوبہ بندی کا ثبوت ہے۔ اور اس کی داد ان سے زیادہ اُن کے ادبی منیجر کو دینی چاہیئے بشرطیکہ وہ یہ سہرا اپنے سر لینا چاہیں۔ منصوبہ بندی کے تحت ادبی پیداوار کی مخالفت کرنے والوں کا اپنی شہرت کی تکمیل و تعمیر میں اتنی دور رس منصوبہ بندی سے کام لینا ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے اور عبرتناک سانحہ بھی۔ دلچسپ ان کے لئے جن کی حیثیت ادب میں تماشائی کی ہے اور عبرتناک ان کے لئے جو "تہذیبی مسائل اور شطرنج کے مہروں کو الگ الگ چیزیں" سمجھتے ہیں۔

"میگھ ملہار" میں کل چھ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کو سمجھانے اور اپنے فنی ارتقا اور اپنی ذات اور فن کے رشتے پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک چالیس صفحات کا دیباچہ لکھا گیا ہے۔ تخلیقی عمل اور فنکار اور تخلیق کے درمیان تعلق کی ایک عمومی تشریح اور تفسیر کے باوصف اس دیباچہ کا نفسِ موضوع مصنفہ کی اپنی ذات ہے۔ ایک لکھنے والے کو اپنے اور اپنے فن کے بارے میں کچھ کہنے کا حق مزید پہنچتا ہے، لیکن سوال طریقۂ اظہار کا بھی ہے اور لکھنے والے کی ادبی حیثیت کا بھی۔ جس ادیب کی کل کائنات دو چار اچھے افسانے اور چند ایک حوالہ جاتی، نیم ترجمہ اور نیم مستعار خیالات پر مشتمل مضامین ہوں، اُسے اپنے آپ کو اتنی بے باکی کے ساتھ "فنکار" اور پھر "وقیع فنکار" کہنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے۔ صرف اس ایک دیباچہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ممتاز شیریں اپنے بارے میں کتنی خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ انہیں اپنے کسی افسانے میں گہرائی نظر آتی ہے، کوئی اُردو میں اپنی نوعیت کا پہلا افسانہ ہوتا ہے، کسی میں تازگی، شگفتگی اور فطری بے ساختگی ہوتی ہے، کوئی افسانہ اپنے انداز میں ایک نیا تجربہ ہے، کسی افسانے میں انسان کا وہ تصور ہے جو بڑے ادب میں ہوتا ہے۔ اور جہاں اپنا کوئی افسانہ انہیں کمزور نظر آتا ہے وہاں انہیں فوراً اس بات پر حیرت کا اظہار بھی کرنا ہوتا ہے کہ یہ افسانہ ایک آسٹریلین انتھولوجی میں کیسے شامل ہو گیا! خیر، اطلاع رسانی یا خود مشتہری کا کام حیرت سے بھی چلتا رہے تو کیا برائی ہے۔ ویسے فٹ نوٹ میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس انتھولوجی میں "پاکستان سے صرف دو افسانوں کا انتخاب ہوا ہے، منٹو اور ممتاز شیریں کا"! جہاں اپنے ابتدائی دور کے افسانوں کی ایک کمزوری کا بیان کرتی ہیں وہاں فوراً یہ بھی واضح کر دیتی ہیں کہ "مجھے اس سے اس بات کا اعتراف مقصود

join eBooks Telegram

نہیں کہ ان افسانوں سے میں غیر مطمئن ہوں —"! کہیں یہ اطلاع دیتی ہیں "چونکہ اب میں میلانِ ہم جنسی کے موضوع پر ماہرین نفسیات، مثلاً (مثلاً "داد سے مستغنی ہے!!) ہیولاک ایلیس اور اسٹیکل وغیرہ کو پڑھ چکی ہوں" کہیں پہلے یہ بتاتی ہیں کہ "بیشتر ادیب اور بڑے ادیب بھی اس دور سے ضرور گذرے ہیں جب ان کی نگارشات میں یہ نیم خود نوشت سوانح عمری کی سی کیفیت ہوتی ہے" اور اس کے فوراً بعد کہتی ہیں! "اپنی تحریروں کے بیشتر افسانے میرے اس ابتدائی دور کے نمائندہ تھے" خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے، کس صفائی اور معصومی سے اپنے آپ کو بڑے ادیبوں میں شامل کر لیا ہے اور پھر جو اہم نکتہ بیان فرمایا ہے وہ بھی غور کے قابل ہے — ڈی۔پی۔مکرجی صاحب کی ایک برسبیلِ ملاقات رائے کا ذکر ہے اور فرماتی ہیں، "ڈی۔پی۔مکرجی صاحب نے میرے دو افسانوں کے انگریزی ترجمے پڑھ کر خاصی پتے کی بات کہی تھی: لفظ "خاصی" پر غور کیجئے، مرحوم ڈی پی مکرجی کی کیا عزت افزائی کی ہے!! آگے چل کر کہتی ہیں: "مکرجی صاحب کی یہ رائے بڑی حد تک درست ہے"! میں یہ نہیں کہتا مکرجی صاحب کی رائے کو حرفِ آخر سمجھا جائے، لیکن جس آدمی کا ذکر ہو رہا ہے اس کی حیثیت کے ساتھ ذکر کرنے والے کو اپنی حیثیت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ ایک "فنکار" میں کم از کم اتنا تو "عرفانِ ذات" ہونا چاہیئے۔! یہ احساسِ کمتری یا مرعوب ذہنیت کی بات نہیں بلکہ "اپنی مشرقی تہذیب" اور اخلاق کی بات ہے۔ بچے بڑوں کا ذکر مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں نہیں کرتے۔ شاید یہ وضاحت ضروری نہیں ہے کہ بچوں اور بڑوں کی بات میں عمر کے معیار سے نہیں کر رہا ہوں۔ مکرجی صاحب کی رائے کے سلسلے میں ایک فٹ نوٹ بھی دیا گیا ہے! "ڈی۔پی۔مکرجی سنہ ۵۴ء میں ہالینڈ آئے ہوئے تھے اور اس وقت انہوں نے میرے ان دونوں افسانوں کے انگریزی ترجمے پڑھ کر یہ بات کہی تھی"۔ ہالینڈ آنے کی اطلاع سے قطع نظر کیا "انگریزی ترجمے پڑھ کر بات کہنے" اور "انگریزی ترجمے پڑھوا کر رائے مانگنے" میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟؟

ایک جگہ لکھتی ہیں: "میرے چند افسانوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں، چنانچہ انگریزی، فرانسیسی، ڈچ، عربی، ہندی، گجراتی اور بنگالی میں —" اس "چنانچہ" کو پڑھ کر مجھ پر پہروں وجد کی کیفیت طاری رہی۔ وجد تو خیر وہ لوگ بھی کریں گے جنہیں موصوفہ "اہلِ ذوق" پکارتی ہیں، لیکن یہاں وجد کے علاوہ غور کرنے کا بھی مقام ہے۔ موصوفہ کے چند ایک افسانے اتنی زبانوں میں ترجمہ ہوئے ہیں تو ظاہر ہے اسے محض اتفاق سے تو تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً یہ افسانے اتنے غیر معمولی ہوں گے کہ ان تمام زبانوں کے ترجمہ کرنے والوں کی نظرِ انتخاب ان افسانوں پر پڑی۔ اگر یہ وجہ ٹھیک ہے تو پھر انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، ہاجرہ مسرور، ضمیر الدین احمد وغیرہ کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اگر یہ وجہ نہیں ہے تو پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چند افسانے "خود" "سعیِ بلیغ" سے مختلف زبانوں میں ترجمے کیلئے مہیا کئے گئے ہوں؟؟ کاش خود نمائی اور خود مشتہری کا جذبہ اتنا اندھا نہ ہوتا!!

دیباچہ میں ایک جگہ فرماتی ہیں، "مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں دیوی دیوتاؤں پر عقیدہ اور ایمان

join eBooks Telegram

نہیں ہوسکتا۔ خواہ یہ دیویاں ہندو ہوں یا یونانی یا مصری۔ لیکن ایک فنکار کی حیثیت سے ان پر لکھتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو اس کیفیت میں جذب کر لیا تھا جسے WILLING SUSPENSION OF DISBELIEF کہتے ہیں۔ "مسلمان ہونا اور اس پر فخر کرنا بُری بات نہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح کسی کا اپنے ہندو، عیسائی، یا یہودی ہونے یا ان پر فخر کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے یہاں اس کا کیا محل تھا؟ کیا اسے NEOPHYTE کا احمقانہ جوش کہیں گے یا منصوبہ بندی کا ایک حصہ؟ "نہیں" پر غور کیجئے اور پھر "نہیں ہو سکتا" کی قطعیت کے سامنے ترینگ اور DEPTH PSYCHOLOGY دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بیگم ملہار (افسانے کے آخری حصہ "شیریں فرہاد" میں مرکزی کردار کی زبان سے یہ جملے کہلوائے ہیں: "میں اپنے موسیقی کے اس جنون کو مذہب کے منافی نہیں سمجھتا۔ مجھے مذہب سے گہرا لگاؤ ہے۔ مانا کہ موسیقی ایک فطریت کا تقاضہ کرتی ہے۔ لیکن روحانی جذبات بھی بیدار کرتی ہے۔ موسیقی میں ایک روحانی عرفان ہے۔ . . ." یہاں اس بات کی چھوٹ دی جا سکتی ہے کہ یہ خیالات مصنف کے نہیں بلکہ کردار کے اپنے ہیں لیکن اگر انہیں مصنف کے خیالات سمجھا جائے۔ (جو کہ یقیناً ہیں، کم از کم اظہار کی حد تک!) تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "موسیقی ایک فطریت کا تقاضہ کرتی ہے" کے کیا معانی ہوتے ہیں؟ اگر موسیقی کا فطریت کے تقاضے کے باوجود چونکہ روحانی عرفان کا ذریعہ بھی ہے اس لئے مذہب کے منافی نہیں، یا کم از کم قابلِ قبول ہے، تو کیا یہ فیصلہ شرِ قلیل اور خیرِ کثیر کے معیار پر کیا گیا ہے؟ - یا "بر اہلِ حال حلال است و بر اہلِ قال حرام است" کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے؟؟ اگر روحانی عرفان کا ذریعہ ہونا ہی وجہِ جواز بن سکتا ہے تو پھر دیوی دیوتاؤں سے ایسی کد کیوں؟ آخر یہ بھی تو ممکن ہے،

یہ بجا کہ خلوتِ دل میں تو، ہے ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر آ کے سامنے بیٹھ جا کہ نظر کو خوئے مجاز ہے (سہا مجدّدی)

"مقامِ نفی میں یوں کھو یا جانا کہ مقامِ اثبات کا ہوش نہ رہے" اور لا الٰہ پر رک جانا بھی تو روحانی عرفان کی ایک منزل ہے۔!

اسی افسانے میں شیرازی صاحب بحید تھیٹریکل انداز میں تقریر جھاڑتے ہیں: "عرب نے عجم پر فتح پائی۔ جب وہ نورِ مشرق ہویدا ہوا اور ایک سادہ پاکیزہ مذہب نے، جس نے خدا کے وجودِ مطلق سے ایک سیدھا، براہِ راست رشتہ قائم کیا ـــ" لیکن محض روحانی عرفان تو سالک اور تصوّرِ شیخ کے ذریعہ بھی ممکن ہے پھر وجودِ مطلق سے سیدھے اور براہِ راست رشتے پر اصرار کیوں؟ اور پھر کیا عرب نے واقعی عجم پر فتح پائی تھی؟

میں یہاں تصوّف کی حمایت یا طریقت اور شریعت کے معرکوں کی بات نہیں کر رہا ہوں اور نہ میں اس بات کی اہمیت کا منکر ہوں کہ ہیئت اجتماعی اور قومی زندگی کے شیرازے کو سالم، منظم اور منضبط رکھنے

join eBooks Telegram

کے لئے شریعت اور اس کے سختی سے نفاذ کی ضرورت ناگزیر ہے۔ لیکن مذہب کی ایک باطنی حقیقت بھی ہوتی ہے اور اس حقیقت کا ادراک نہ رکھنے والوں کی نہ کوئی کمی ہے اور نہ ان سے شکایت کی کوئی وجہ لیکن فن وادب میں ایسی باتیں ایسے جاہلانہ انداز میں نہیں ہونی چاہئیں۔ میں یہ بات اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ اس قسم کی باتیں خواہ وہ دیباچہ میں آئی ہوں یا افسانے میں صاف اوپر سے لادی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بات خلوص کی بھٹی میں تپ کر نکلے تو اختلاف یا اتفاق سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی احترام کی مستحق ہوتی ہے۔ لیکن ممتاز شیریں جہاں جہاں ایسی باتیں کرتی ہیں وہاں ریاکاری بے نقاب نظر آتی ہے۔ میں خود مسلمان ہوں اور اپنے خالق سے براہِ راست رشتے یا دیوی دیوتاؤں پر ایمان نہ رکھنے کی بات ممتاز شیریں تو خیر، ان کے معنوی مرشدوں سے بہتر جانتا ہوں لیکن یہ دل سے نکلنے کی باتیں ہیں۔ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کا حصہ بن کر جب سامنے آتی ہیں تو اس میں وہی NEOPHYTE کا احمقانہ جوش نظر آتا ہے یا پھر ریاکاری جو اپنی ہر صورت میں قابلِ نفرین ہوتی ہے۔

○

ہاجرہ مسرور پر ایک مضمون میں جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے، ایک جگہ ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

"ہاجرہ مسرور ہر لحاظ سے ایک نارمل عورت ہیں۔ وہ اپنی عنفوانِ شباب کی بلوغیت کے ماحول کی گھٹن سے باہر نکل آئی ہیں اور اب ایک نسبتاً آزاد، نارمل، متوازن اور خاصی خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مناسب عمر میں انہوں نے شادی کی، شوہر، گھر اور بچے جن کے بغیر عورت کی زندگی تشنہ اور ادھوری رہ جاتی ہے، یہ لوازمات انہیں میسر ہیں۔ یہ باتیں ادب پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہاجرہ مسرور کے ہاں شخصی ناآسودگی، فرسٹریشن اور کسی قسم کا OBSESSION نہیں ہے۔ وہ بڑے مطمئن انداز میں معروضیت اور علیحدگی کے ساتھ مختلف موضوعات اور زندگی کے کئی ایک پہلوؤں کو تیز نظروں سے جانچتی ہیں اور انہیں پورے قابو اور توازن کے ساتھ پیش کر سکتی ہیں۔"

یہ طویل اقتباس میں نے اس لئے دیا ہے کہ میگھ ملہار کے دیباچے سے کہیں زیادہ یہ اقتباس اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ ممتاز شیریں کے نزدیک فن اور تخلیق کی شرائط کیا ہیں۔ دراصل یہ نظریہ کہ فنی تخلیق کے لئے شخصی آسودگی ضروری ہے، اور یہ کہ کسی قسم کا فرسٹریشن یا OBSESSION تخلیق کے لئے مضر ہے۔ اس پیوست اور "آورد" کا سبب بتاتا ہے جس سے ممتاز شیریں کے افسانے بھرے ہوئے ہیں: "نارمل" کے تصور کی بھی انہوں نے خوب وضاحت کی ہے! پہلے تو کوئی ایسا انسانی وجود نہیں مل سکتا جسے "نارمل" کہا جاسکے۔ اور پھر انہوں نے جن چیزوں کو اس کا معیار بنایا ہے مثلاً:

join eBooks Telegram

"مناسب عمر میں شادی، شوہر، گھر اور بچے" وہ بہت گمراہ کن ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فن اور تخلیقی عمل کے بارے میں چپے جانے نوالوں کی بجائے جب خود سے کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہیں تو کتنی سطحی باتیں کرتی ہیں۔

کیا OBSESSION اور فرسٹریشن کے بغیر فن اور آرٹ کی تخلیق ممکن ہوتی ہے؟ OBSESSION اور فرسٹریشن کو وہ کس سطح پر آ سی ہیں اس کی وضاحت ہونی چاہیئے۔ کیا تخلیقی عمل خود ایک OBSESSION نہیں ہے؟ کیا تخلیق کی ہذیانی یا نیم ہذیانی کیفیت کا عام (نارمل نہیں) ذہنی کیفیت سے کوئی تعلق ہے؟ کیا ذات اور کائنات کے درمیان تنہائی کی خلیج کا احساس فرسٹریشن نہیں پیدا کرتا؟ اور کیا اس تنہائی کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش OBSESSION نہیں بن جاتی؟ فرسٹریشن کے بغیر نہ عرفانِ نفس ممکن ہے اور نہ عرفانِ کائنات۔ کیا اپنے ارادوں کی شکست اور اپنے رب کو پہچاننے کے عمل کے درمیانی وقفے میں فرسٹریشن نہیں آتا؟ فرسٹریشن کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اپنی ہیچ مقداری کے احساس سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ "فن موت پر فتح پانے کی کوشش ہے۔" اور موت پر فتح پانے کی کوشش اسی فرسٹریشن سے پیدا ہوتی ہے جو انسان موت کو زندگی کے مکمل خاتمے کے طور پر دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ فرسٹریشن کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے، اُسے محسوس کرنے کی سطحیں الگ الگ ہو سکتی ہیں، اس کا عرصہ قلیل یا طویل ہو سکتا ہے لیکن ہر حال میں، ہر سطح پر، فرسٹریشن کسی نہ کسی معنی میں تخمی ہوتا ہے۔ فرسٹریشن تخلیقی عمل کا محرک بھی ہے اور منبع بھی۔ فرسٹریشن غیر صحتمند یا MORBID اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی منزل خود بن جاتا ہے۔

وجدان کی پرواز ــــ "ڈریک پ راگ" کا پانچواں افسانہ ــــ ہیں جس ناآسودگی اور تڑپ کا فقدان آرٹسٹ کی تصویروں کو بے رنگ اور پھیکی بنا دیتا ہے وہی کمی ممتاز شیریں کے افسانوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ادب سے ان کا تعلق ریاضت اور محنت کا ہے دل کی آگ اور تڑپ کا نہیں۔ وہ بڑی محنت سے پلاٹ بناتی ہیں، کہانی کا آغاز، تعمیر، تشکیل، ارتقار اور اختتام کا خاکہ بناتی ہیں۔ جن خیالات و نظریات کا اظہار کرنا چاہتی ہیں انہیں پہلے سے چن چن کر افسانے میں داخل کرنے کے لئے، الگ کر لیتی ہیں۔ اور اتنی ساری دوڑ دھوپ کے بعد جب افسانہ "بن" کر آتا ہے تو وہ ایک ایسا منقش چوکھٹا ہوتا ہے جس کے اندر موقلم سے بنی ہوئی تصویر کی بجائے پاسپورٹ فوٹو لگی ہوتی ہے۔ ان کے کردار گراموفون کے ریکارڈ ہیں۔ ان کی زبان میں کوشش اور اظہار کی جدوجہد ہے بے اختیار بہاؤ اور کاٹ نہیں ہے۔ کسی اسلوب یا طرز کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ یہ بہت بعد کی چیزیں ہیں جبکہ ان کے ہاں ابھی ابتدائی چیزوں کا ہی فقدان ہے۔ "صحیح" اور "غلط" زبان پر میں زیادہ زور دینے کا قائل نہیں ہوں لیکن زبان کم از کم ٹھیک تو ہونی چاہیئے۔ "اظہاریت" اور زور تو ہونا چاہیئے۔ سست، بے جان، اور تصنع جملے جیسے سوچ سوچ کر لفظ کے ساتھ لفظ جوڑا گیا ہو۔ الفاظ کو ممتاز شیریں نے آج تک کبھی جاندار سمجھ کر استعمال نہیں کیا۔ ان کے لئے وہ ایک مخصوص مفہوم رکھنے والے بے جان مہرے ہیں۔ عام طور پر بیدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

join eBooks Telegram

ان کی زبان ٹھیک نہیں ہوتی ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کر بیدی زبان صحیح نہیں لکھتے لیکن ان کے ہاں اظہار کی وہ قوت ہے جس کے بغیر ادب ادب نہیں بنتا۔ دیپک راگ کا پہلا حصہ "نوکس ٹراٹ" "بھارت ناٹیہ" اور پلے کا پورا میگھ ملہار (سوائے آرفیوس والے حصے کے) زبان و بیان کی کمزوریوں اور غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں زبان و بیان کی کمزوریوں اور غلطیوں کے علاوہ الفاظ کا ایسا مضحکہ خیز استعمال وہ کرتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ انہیں اُردو کا ادیب اور نقاد کیسے سمجھا جائے۔ اس کے نمونے خاص طور پر "شیریں فرہاد" میں جابجا دیکھے جا سکتے ہیں۔

ممتاز شیریں کے ہاں تخلیقی قوت کی بہت کمی ہے۔ فن اور تخلیقی عمل کے بارے میں عالمانہ باتیں کرنا آسان ہے کیونکہ اس میں صرف ایک بٹا چار فہم اور تین بٹا چار محنت لگتی ہے۔ لیکن تخلیق کے لئے فہم اور محنت کے علاوہ بھی ایک شئے دیگر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی وہ ماورائے سخن والی بات ممتاز شیریں کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ اپنے افسانوں کے بارے میں غیر ضروری تفصیلات میں جاتی ہیں، خود نمائی اور خود شہری کا ہر ممکن حربہ (اپنی تصویروں سمیت!) استعمال کرتی ہیں، خیر و شر کے تصور کی بات کرتی ہیں، بڑا انسان، فطری انسان اور نامکمل انسان کے بکھیڑوں میں پڑتی ہیں، ناسیست کے مختلف مدارج اور معانی سمجھاتی ہیں لیکن افسانہ بالعموم ایسا لکھتی ہیں کہ صرف بطور سزا پڑھا جاسکے۔ کہیں کہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ان میں کوئی چھوٹی سی چنگاری موجود رہی ہو جسے شعلہ بننے نہیں دیا گیا اور جو شاید اب بھی کہیں کسی گوشے میں باقی ہو۔ ادھر ادھر کبھی کبھار کوئی چھوٹ پڑتی ہوئی نظر آکر غائب ہو جاتی ہے۔ میں کبھی کبھی واقعی بہت خلوص سے سوچتا ہوں کہ اگر ان پر کتابوں کا اتنا بوجھ نہ لاد دیا گیا ہوتا، انہیں اتنی پلاننگ (ادبی اور ادبی سیاست کی، دونوں) کے تحت کام نہ کرنا پڑا ہوتا تو شاید ــــ مگر بدقسمتی سے یہی تو زبان و قلم کے انتہائی دردناک الفاظ ہیں ــــ اگر ــــ کاش ــــ

مظفر علی سید نے نصرت میں "میگھ ملہار" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "ان کی (ممتاز شیریں) شادی بھی ایک بہت ہی پڑھے لکھے آدمی سے ہو گئی جو بمبئی جاتا تو یوں کتابیں خرید کر لاتا جیسے جہیز خریدا جاتا ہو۔" یہ بات پتہ نہیں انہوں نے تعریفاً لکھی ہے یا طنزاً کیونکہ ان کے مضمون کا بیشتر حصہ ہجو ملیح میں لکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں شاید یہی "بہت ہی پڑھے لکھے" آدمی سے شادی ان کی تخلیقی قوت کو لے ڈوبی۔ اور پھر بصیرت نہ بمبئی کی دکانوں میں ملتی ہے اور نہ کراچی کی دکانوں میں۔

میگھ ملہار میں مجھے صرف دو افسانے ایسے نظر آئے جن میں کسی تخلیقی قوت کا ثبوت ملتا ہے "آندھی میں چراغ" اور "کفارہ"۔ "آزادنگارستان" اپنے انداز کی کافی اچھی چیز ہے اور مزے دار۔ "آندھی میں چراغ" مظفر علی سید کو علاوہ اور وجوہ کے، اس لئے بھی پسند نہیں آیا کہ "ممکن ہے میرا یہ تاثر درد و دل کی اس کمی کے باعث ہو جو کہا جاتا ہے کہ نقادوں میں پائی جاتی ہے۔" (یعنی اب مظفر علی سید بھی خود کو "نقادوں" میں

join eBooks Telegram

شمار کرنے لگے ہیں۔ ایں ماتم سخت است کہ — ! جواں مرد !) "آندھی میں چراغ" بڑا صاف ستھرا، بے داغ اور سجل افسانہ ہے۔ کسی ہیر پھیر یا "تیکنیکی تجربے" کے بغیر ایک نچلے متوسط طبقے کے میاں بیوی کی گھریلو زندگی کی تصویر چند ایک جھلکیوں میں خوبصورتی سے پیش ہوئی ہے اور زچگی کے دوران میں بیوی کی موت اچھا خاصا تاثر پیدا کرتی ہے البتہ اگر بیوی کی موت کے سلسلے میں مفلسی کو ذمہ دار ٹھہرانے کی زیادہ کوشش نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ شاید اسی چیز کو مظفر علی سید نے REACT کیا ہے۔ ترقی پسندی کے ڈھلے ڈھلائے موضوعات سے بیزارگی قابلِ فہم ہے لیکن اس قسم کے موضوعات کا زندگی میں "ترقی پسندی" سے آزاد ہو کر بھی اپنا وجود رہتا ہے ان سے یوں ALLERGIC ہو جانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ "کفارہ" کا موضوع ہر اعتبار سے "آندھی میں چراغ" کے موضوع سے مختلف ہے۔ "آندھی میں چراغ" میں صرف REPRESENTATION ہے۔ اس کے برعکس "کفارہ" تمثیلی (ALLEGORICAL) افسانہ ہے۔ یہ زچگی کے بارے میں لکھا ہوا افسانہ نہیں بلکہ اس کا موضوع "احساس گناہ" ہے۔ حالانکہ ممتاز شیریں نے مظفر علی سید کے تبصرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے نصرت (مئی ۱۹۶۳ء) میں لکھا ہے کہ "کفارہ" کا موضوع موت ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے "بہر حال کفارہ میں موت کی اس نہایت غیر رومانی تصویر پر بہت سے اہلِ ذوق پھڑک اُٹھے تھے۔" بدقسمتی سے "کفارہ" پر پھڑک اٹھنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ بدقسمتی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اب ممتاز شیریں نے ان لوگوں کو اہلِ ذوق قرار دے دیا ہے اور اس سے میرے لئے بڑی مشکل صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال میں اپنی طرف سے اس گروہ سے باہر ہوں کیونکہ میرے نزدیک موت کو "کفارہ" کا موضوع ٹھہرانا اتنی ہی بدذوقی اور کم فہمی کی بات ہے جتنا اسے زچگی کے بارے میں لکھا ہوا افسانہ قرار دینا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر موت اس کا موضوع ہے تو عنوان کفارہ کیوں رکھا جائے؟ یہ افسانہ پہلے ممتاز شیریں نے مجھے انگریزی میں سُنایا تھا اور اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو اس کا عنوان ATONEMENT تھا۔ افسانہ مجھے اتنا پسند آیا کہ ان دنوں میری بجید مصروفیات کے باوجود میں نے اس کا اُردو میں ترجمہ کرنا قبول کر لیا اور یہی ترجمہ پہلی بار "کفارہ" کی شکل میں سوغات میں چھپا اور اب میگھ ملہار میں شامل کیا گیا ہے۔

"کفارہ" تلاشِ نجات کا افسانہ ہے۔ ایک ایسی روح کا سفر جو شہادت یا آخری دید کی آرزو مند نہیں بلکہ نفسِ مطمئنہ کی متلاشی ہے۔ اور "کفارہ" اس روح کے سفر کی تین منزلوں پر محیط ہے۔ اذیت اور درد کے ساتھ نیم بیہوشی کی کیفیت میں موت کے قرب کا احساس — پہلی منزل ہے جہاں احساس گناہ کے تحت اپنی بے مصرف اور بے معنی زندگی کا جواز تلاش کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے BLOOD-TRANSFUSION ایک نئے احساس، ایک نئے وجود سے آشنا ہونے کی علامت ہے۔ ANAESTHESIA کے زیر اثر لاشعور کی پرواز۔

join eBooks Telegram

"ساری زمین اُجاڑ اور بنجر تھی۔ ایک ویران خرابہ۔ میرے چاروں طرف تنہائی اور سنسان ویرانی تھی میں اس ویران خرابے کی وسعتوں میں بچھڑی ہوئی بے مقصد گھومتی رہی۔" موت کے سائے میں احساس گناہ کے بعد ویرانی اور اجاڑپن کا یہ احساس دوسری منزل ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ علم ہوتا ہے کہ زندگی نے موت کو جنم دیا تھا اور ۔۔۔" ویرانی اور اجاڑپن کا کائناتی احساس سمٹ کر ایک شدید ذاتی المیہ میں ڈھل جاتا ہے۔" اور خود فریبی سمجھاتی ہے کہ شاید یہ کفارہ تھا۔ لیکن آدمی احساس گناہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس گناہ کا کوئی شخصی یا ذاتی کفارہ ممکن نہیں اور اسی لئے، "میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔" یہ روح کے سفر کی آخری منزل ہے۔ یہاں افسانے میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانے کا اختتام اس سطر پر ہونا چاہیئے تھا "میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔" اور یہ سطر کاٹ دینی چاہیئے "آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔" کیونکہ اس سے مرکزی خیال مجروح ہوتا ہے۔ افسانے کی تھیم کے مطابق تو صرف ندامت اور غم کا احساس ہی ذریعۂ نجات ہے۔

ظاہر ہے یہ تصور سراسر عیسوی ہے اور مغربی ادب سے قربت نے یہ تصور ممتاز شیریں کے لاشعور تک میں اس طرح اتار دیا ہے کہ انہیں خود پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کیا لکھ رہی تھیں۔ چونکہ اس تجربے سے جو بات پیدا ہوتی ہے وہ بہت ساری وجوہات کی بنا پر انہیں پسند نہیں آسکتی تھی۔ لہذا ایک گہرے، تہہ دار افسانے کو "بے ضرر" بنانے کی خاطر موت کو اس کا موضوع ٹھہرا دیا گیا۔ یہ بھی منصوبہ بندی کے حسن کرشمہ ساز کی کارستانی ہے۔

اس افسانے کے بارے میں میں نے سوغات میں لکھا تھا۔" اس افسانے کی نیم روشن، نیم دھندلی فضا، کافکائی کہانیوں کے نیم حقیقی اور نیم مافوق الحقیقی ماحول سے زیادہ دور نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "کفارہ" کی علامات زیادہ واضح، معین اور ٹھوس ہیں۔ موت کے سائے میں تخلیق کا کرب اور مُردہ بچے کی پیدائش کا خالص ذاتی تجربہ ایک وسیع تر مفہوم کا حامل ہو گیا ہے۔ اس افسانے میں ایک ذاتی المیہ کو تاریخی اور اساطیری تلمیحات کے تانے بانے میں پھیلا کر گناہ اور کفارے کے مذہبی احساس پر منتج کیا گیا ہے۔ ANAESTHESIA کے زیر اثر مریضہ کے لاشعور کی پرواز افسانہ نگاری کا پینترا نہیں بلکہ اصل اور حقیقی شئے بن گئی ہے۔ افسانے کی ابتدا، تعمیر، خیال کا تدریجی ارتقاء اور تکمیل اتنے فنکارانہ دروبست سے ہوئی ہے کہ فنی اعتبار سے بھی "کفارہ" مکمل ترین مختصر افسانہ ہے۔ اس افسانے کی ایک اور بڑی خوبی "وقت" کا تجربہ ہے۔ حال کے SUSPENSION اور تلمیحات و اساطیر کے ذریعہ ماضی کی بازآفرینی کے عمل میں جس طرح وقت کو "پھلانگنے" کا تجربہ کیا گیا ہے اس کی اتنی کامیاب مثال اردو میں کم ملے گی۔ "کفارہ" اپنی معنویت فنی تکمیل، گہرائی اور تاثر کے اعتبار سے جدید اردو افسانے میں ایک سنگ میل ہے۔" اس رائے سے ممتاز شیریں کو بھی اتفاق تھا اور انہوں نے میگھ ملہار کے دیباچے میں اس کی سطریں کی

join eBooks Telegram

سطریں نقل کی ہیں۔ ایک ذاتی خط میں بھی انہوں نے لکھا: "کفارہ" کی پیش کش کے ذمہ دار آپ ہیں۔ اس افسانے کو آپ نے جس طرح سمجھا ہے اور جن موزوں الفاظ میں اس کی شرح و بسط کی ہے وہ آپ ہی کا حصّہ ہے" لیکن حیرت ہے وہ مجھ سے اتفاق بھی کرتی ہیں اور پھر اس افسانہ کا موضوع "موت" قرار دیتی ہیں!!

مجھے میگھ ملہار میں، بس یہ دو افسانے پسند آئے ہیں۔ رہا وہ افسانہ جسے ممتاز شیریں اپنی بہترین تخلیق سمجھتی ہیں، اس کے بارے میں بھی میں نے دو ڈھائی سال پیشتر سوغات کے اداریے میں (شمارہ ۵) محمد حسن کی اس افسانے پر رائے کے متعلق لکھتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس میں آج بھی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ میں نے لکھا تھا۔

"ممتاز شیریں کے افسانے میگھ ملہار کی محمد حسن نے اتنی تعریف کی ہے کہ مجھے اپنے مذاق اور معیار پر شبہہ ہونے لگا ہے۔ میرے نزدیک اس افسانے میں صرف آرفیوس والا حصّہ قابلِ مطالعہ ہے، پہلے اور آخری حصّہ میں زبان اتنی پُر تصنع ہو گئی ہے کہ پڑھتے ہوئے کوفت ہوتی ہے۔ ممتاز شیریں نے ماحول اور فضا کے خیال سے پہلے حصّے میں ہندی اور دوسرے حصّے میں فارسی اسلوب استعمال کیا ہے لیکن دونوں میں وہ بڑی طرح ناکام رہی ہیں۔ اس افسانے کی کئی باتیں قابلِ گرفت ہیں۔ مثلاً آخری حصّے میں شیرازی کی زبان سے اسلامی فلسفہ پر جو "بصیرت افروز" باتیں کہلائی گئی ہیں وہ کچھ اس طرح اوپر سے لادی گئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے افسانے کی پارکھ خود اتنی مبتدیانہ لغزشوں کا شکار کیسے ہو گئیں۔ ممتاز شیریں کا یہ افسانہ ایک بڑی کوشش سہی مگر اس کو نہ تو نئی یا منفرد کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ اس کوشش میں کامیاب رہی ہیں۔ افسانے کے دائرے میں مختلف تہذیبوں کے اساطیری قصوں کو استعمال کرنے کا تجربہ برسوں پہلے عزیز احمد نے "مدن سینا اور صدیاں" میں کیا تھا"

محمود ایاز

تاثرات و تعصبات

مصنف:۔ نظیر صدیقی، ۵ + ۲۹۲ صفحے۔ قیمت سات روپے پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ پاک کتاب گھر ۳۹ پٹواٹلی ڈھاکا ۱

تاثرات و تعصبات نظیر صدیقی کے دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ شروع میں "اعترافات" کے عنوان سے چند پتے کی باتیں کہی گئی ہیں جو مصنف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان مضامین میں ہمیں کسی خاص تنقیدی نظریئے کی ترجمانی نہیں ملتی، ہاں قدر شناسی کی ایک مخلصانہ کوشش ملتی ہے۔

join eBooks Telegram

یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، ابتہی رضوی، جگر مرادآبادی، ناسخ، اور رشید احمد صدیقی پر جو مضامین ہیں ان میں قدرے تفصیل سے ان حضرات کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جمیل الدین عالی اور گنجے فرشتے پر تبصرے سرسری ہیں۔ آخر میں "کچھ اپنی صفائی میں" کہا گیا ہے۔ جو مصنف کے انشائیوں کے ایک مجموعے "شہرت کی خاطر" پر کچھ تبصروں کا جواب ہے۔

نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اور ذوق پاکیزہ۔ گو ان کی بعض رایوں سے اختلاف ناگزیر ہے، مگر اس کے باوجود انہیں طرفداروں کے بجائے سخن فہموں کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایمانداری سے قدر شناسی Appreciation کی کوشش کرتے ہیں، یہ حسن و قبح کو پرکھتے ہیں اور اس کے بعد ایک فیصلہ بھی صادر کرتے ہیں۔ فیصلے سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن ان کے طریقۂ کار سے اختلاف کی کم ہی گنجائش ہے۔ انہیں اپنے خیالات کو صاف ستھری زبان میں پیش کرنے کا گر آتا ہے اور زبان کی اس دلکشی کی وجہ سے ان کی تحریروں کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

یگانہ پر انہوں نے بڑے مزے کا مضمون لکھا ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ وہ اقبال کی فطانت کے اور یگانہ کی صلاحیت کے قایل ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال اور یگانہ کا یہ موازنہ گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے یگانہ مجذوب ہیں اور اقبال سالک۔ مجذوب کی بڑ میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے مگر راہ و رسم منزل سے سالک ہی باخبر ہوتا ہے۔ یگانہ کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ اقبال تو بہر حال ایک بڑے نصب العین کے عاشق تھے۔ یگانہ اپنے عاشق ہیں۔ ان کی فکر بہت گہری نہیں، ہاں ان کا لہجہ بڑا تیکھا اور ان کے تیور بڑے بانکے ہیں۔ نظیر صدیقی نے یہ غلط کہا کہ یگانہ کے اشعار یاد نہیں ہوتے۔ ان کے یہ شعر تو بھلائے نہیں جا سکتے۔

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش	دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا	چال پر تو ظالم کی سادگی برستی ہے
کیمیائے دل کیا ہے، خاک ہے	لیجئے تو ہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے
تنگ محفل مرا زندہ، مرا مردہ بھاری	کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

یگانہ کے محاوروں پر بھی اعتراض صحیح نہیں۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے محاورے برتے ہیں اور انہیں کی بدولت یگانہ کے کلام میں ایک ایسا زور ہے جو کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ یگانہ یقیناً ہمارے ممتاز منفرد شعراء میں سے ہیں گو ان کے یہاں میر، غالب و اقبال کی سی "قوت شفا" نہیں۔

یہی حال فراق پر مضمون کا ہے۔ فراق کی شاعری کی خوبیاں اور خامیاں نظیر صدیقی پر روشن ہیں۔ ان کی یہ خواہش بھی درست ہے کہ کاش اُردو شعراء کی ابھرتی ہوئی نسل فراق سے مرعوب ہونے کے بجائے صرف (ان سے) متاثر ہونے

join eBooks Telegram

پر ہی اکتفا کرتی، مگر عشقیہ شاعری اور غزل کے متعلق فراق کے خیالات سے اس مضمون میں انصاف نہیں کیا گیا۔ نظیر صدیقی صاحب نے اس پر غور نہیں کیا کہ غزل جو حدیث دلبری ہے، اگر بادۂ تصوف کیلئے موزوں ہے تو سیاسی و سماجی خیالات کے اظہار کے لئے کیوں موزوں نہیں اور جسطرح عاشق صرف ہمہ وقت عاشق ہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی سپاہی بھی ہو سکتا ہے اسی طرح حسن کا اداشناس، زندگی کے اسرار و رموز کا ذکر کیوں نہیں چھیڑ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کو صرف حکایت لب و رخسار سمجھنے ہی سے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے ورنہ جہاں بھی گہرا جذبہ، شدید احساس اور ایک مقصد سے ہم آہنگ ہونیکا تصور (Identy-fication) پایا جائے وہ عشقیہ شاعری کہلائے گی۔

فیض پر مضمون میں تاثرات سے زیادہ تعصبات کی جھلک نظر آئی۔ فیض کے یہاں زبان کی خامیاں ہیں لیکن اسکے یہاں جو جادو ہے اس کے مقابلے میں ان خامیوں کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ فیض کی مقبولیت کا راز نظیر صدیقی کے نزدیک ان کے تغزل میں ہے۔ یہاں تغزل سے زیادہ غنائیت کی اصطلاح موزوں معلوم ہوتی ہے۔ نیاز صاحب کی سند کی نظیر صدیقی کو ضرورت نہ ہونی چاہیئے تھی کیونکہ قدیم شاعری کے متعلق ان کی رائے مستند ہو تو ہو مگر جدید شاعری کی روح کو وہ پا نہیں سکے ہیں۔

نظم ملاقات پر ان کے عمل جراحی کو دیکھ کر حیرت ہوئی انہیں یہ نظم اس طرح پڑھنی چاہیئے تاکہ وہ اس سے پورا لطف لے سکیں۔

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں
لاکھ مشعل بکف ستاروں کے کارواں
گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے میں
اپنا سب نور رو گئے ہیں
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں کے گلستاں میں
سلگ رہا ہے
الم نصیبوں، جگر فگاروں کی صبح،
افلاک پر نہیں ہے

فیض کی زبان پر اعتراض کرتے وقت ایک بات نہیں بھولنا چاہیے۔ فیض جس نسل کے شاعر ہیں وہ اپنے کلاسیکل سرمائے سے واقف ہے مگر اس کے گرد وپیش کی زبان خاصی بدل گئی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فیض کی غلطیاں غلطیاں نہیں، مگر یہ معنی ضرور ہیں کہ یہ غلطیاں ایسی اہم نہیں کہ نیاز صاحب کی طرح، نظیر صدیقی ان کی اصلاح کی زحمت

join eBooks Telegram

کریں۔ کیونکہ جگر یا فیض کی اصلاح کرنے سے ممکن ہے انکی غلطیاں دور ہو جائیں مگر غلطیوں کے ساتھ انکے اشعار کی وہ کیفیت بھی جاتی رہتی ہے۔

مجتبیٰ رضوی اور جگر کے کلام پر تبصرہ مجموعی حیثیت سے بہت خوب ہے ہاں اطلاعاً یہ عرض ہے کہ شعلۂ طور پر اُردو ادب میں اس مجموعے کی اشاعت کے بعد ہی تبصرہ ہوا تھا۔

نظیر صدیقی نے ناسخ پر مضمون میں اس رجحان کو تقویت دی ہے جو ناسخ کو سرے سے نظر انداز نہیں کرتا۔ عمومی طور پر یہ رجحان صحت مند ہے کیونکہ ناسخ کی خوبیوں سے یکسر انکار کرنا اس اثر سے انکار کرنا ہے جو ناسخ کے فکر و فن کی وجہ سے ان کے ہم عصروں پر پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناسخ اپنے دور کی ایک بڑی شخصیت تھے اور فن کی برگزیدگی اور عظمت کو انہوں نے بڑے بڑوں سے منوایا، لیکن چونکہ ان کے یہاں کسی گہرے عقیدے یا جذبہ کا سایہ نہیں ملتا اس لئے ان کا کلام پختگی، مشاقی، ہمواری، آرائش و زیبائش، ترصیع بلکہ صناعی کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ تاثیر، جادو، کیفیت کے لحاظ سے اسکی اہمیت زیادہ نہیں، ان کے یہاں آتش سے زیادہ چستی اور ہمواری ہے مگر ان سے کم تاثیر اور کیفیت۔ حالی کے اثر سے نقادوں نے انہیں یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اب ان کی اہمیت کا اعتراف غلط نہیں ہے، مگر ناسخ شاعر سے زیادہ استادِ فن ہیں۔ امیر اسی لئے ان کی غزل پر غزل کہتے ہچکچاتے تھے۔

نظیر صدیقی رشید احمد صدیقی کے بڑے مداح ہیں اور انہوں نے اپنے ممدوح کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دی ہے، مگر اس مضمون کے شروع میں ایک بنیادی غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اردو نثر میں اگر کسی نے غزل گوئی کی ہے تو وہ رشید صاحب ہیں" ان کا خیال یہ ہے کہ یہ پتے کی بات ہے اور اچھی بات ہے۔ حالانکہ نثر میں غزل گوئی کر کے کوئی اچھا نثار نہیں ہو سکتا۔ دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ یہ مسلّمہ ہے کہ رشید صاحب بہت اچھے نثر نگار ہیں، اس لئے ان کی خوبی نثر میں غزل گوئی میں نہیں، نثر میں غزل گوئی کے باوجود ہے۔ بنیادی طور پر رشید صاحب مضمون نگار اور انشا پرداز ہیں۔ مضمون میں شخصی نقطۂ نظر سب سے اہم ہے اور اس کی کارفرمائی میں اس منطقی تسلسل اور ربط بیان کی ضرورت نہیں جو کسی علمی مضمون میں ہوتا ہے یہی ان کے بہکنے کا جواز ہے مگر لغزش کو سلامت روی کہنا صحت نظر کی دلیل نہیں یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ رشید صاحب کے یہاں فن سے بے پروائی ہے۔ رشید صاحب اپنی تحریروں پر خاصی توجہ کرتے ہیں اور آخر تک اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے لیکن اسے ان کی خوبی سمجھنا چاہئے۔ بے ساختگی کو ہر حال میں سراہنے والے فطرت اور فن کے فرق سے ناواقف ہیں۔ نظیر صدیقی نے رشید احمد صدیقی کے لاجواب فقروں کو صحیح داد دی ہے لیکن ان فقروں پر وہ غور کرتے تو یہ راز بھی کھل جاتا کہ رشید صاحب کیوں جتنے بڑے مضمون نگار اور انشا پرداز ہیں اُتنے بڑے نقاد نہیں ہیں تنقید میں کھڑکی اور گرم پانی کی بوتل دونوں میں توازن ضروری ہے۔ رشید صدیقی کے یہاں گرم پانی کی بوتل اپنی بھرپور

صلاحیت دکھاتی ہے۔ ان کی کھڑکی پوری کھلی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے مزاحیہ مضامین اور ان کے خاکوں کا درجہ جتنا بلند ہے، انکی تنقیدوں کا نہیں۔

رشید صدیقی کے اسلوب کا اثر ہم سب پر پڑا ہے۔ نظیر صدیقی بھی اس سے بچ نہیں سکے ہیں۔ تنقید میں یہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اس کا اندازہ نظیر صدیقی کے اس جملے سے کیجئے کہ "اردو ادب میں رشید صاحب پہلے اور تنہا شخص ہیں جس نے طنز و مزاح کو فلسفہ اور فلسفے کو آرٹ بنایا۔" مزاح نہ فلسفہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ اس سے اس کی عظمت کم ہوتی ہے۔ مزاح نگار افراط و تفریط، نشیب و فراز کی طرف اشارہ کر کے ہمیں ایک ذہنی توازن کی طرف لے جاتا ہے۔ رشید صاحب کو فلسفی قرار دینا ان پر تہمت لگانا ہے۔ اگر رشید صاحب فلسفی ہیں تو اکبر بھی فلسفی ہیں۔ دراصل دونوں صاحب نظر ہیں۔ دونوں کی نظر ہمہ گیر نہیں، مگر اپنے دائرے میں گہری ہے اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔

رشید صدیقی کی مرقع نگاری پر بعض باتیں بڑے پتے کی کہی گئی ہیں لیکن مصنف نے راقم الحروف کے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ کیوں ذاکر صاحب کا خاکہ سلیمان اشرف کے خاکے کی طرح جاندار نہیں ہے۔ رشید صاحب کے یہاں ذاکر صاحب کی شخصیت کی دلکشی آگئی ہے۔ ان کے کردار کی روشنی اور گرمی کا حق ادا نہیں ہوا۔ سلیمان اشرف کی کردار نگاری جو کچھ چاہتی تھی وہ رشید صاحب نے فراہم کر دیا۔ ذاکر صاحب کی سیرت کا موقع چیزے دگر کا مطالبہ کرتا ہے۔

"کچھ اپنی صفائی میں" بہت دلچسپ مضمون ہے اور اس سے نظیر صدیقی کی نظر کی صحت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ شہرت کی خاطر، میں مضمون نگاری (آج کل کی چلتی ہوئی اصطلاح انشائیہ) کا معیار کیا ہے اور نظیر صدیقی کا اس صنف میں کیا کارنامہ ہے۔ وہ مضمون نگاری کی روح، اس کے دائرے اور اس کے فن سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں اور ان کے معترضوں کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مضمون نگار نہیں ہیں۔ افسوس ہے کہ کچھ لوگ کسی کی طنز نگاری کی بنا پر اسے مضمون نگار ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، اور کسی کی تنقید کی خوبی کی وجہ سے اُسے مضمون نگاروں کی برادری سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس مضمون میں مضمون نگاری کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ ذوق سلیم کی اچھی مثال ہے۔

"تاثرات و تعصبات" مجموعی طور پر نہایت قابل قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہاں تنقیدی صلاحیت، اگر تاثر، حسن و قبح پر نظر ڈالنے کی کوشش اور ان سب کے ساتھ ایک پاکیزہ اور دلکش اسلوب مل جاتا ہے۔ مصنف کی رایوں سے اختلاف تو کیا ہی جائے گا، مگر ان کے سنجیدہ خیالات کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ان کی مسترقیمت کی طرف سے ضرور خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کچھ اور وسعت اور لچک آجائے تو تنقید کی دنیا میں ان کے لئے روشن مستقبل ہوگا۔

آل احمد سرور

join eBooks Telegram

زخمِ تمنّا

مصنف :- مظہر امام - صفحات :- ۱۷۶ - قیمت :- تین روپے
ناشر :- اُردو پبلشرز - دیوان بازار - کٹک ۱

ادب اور شاعری کے بارے میں ذاتی تاثر اور معروضی رائے کا فرق مجھے زیادہ پریشان نہیں کرتا۔ ممکن ہے بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگ ان دونوں چیزوں میں کوئی ایسا اہم فرق دیکھتے ہوں جو میری نظر سے پوشیدہ ہے اگر حقیقتاً ایسا ہے بھی تو ظاہر ہے میری مجبوری اس صورت میں بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ لہذا پہلے میں آپ کو "زخمِ تمنّا" کے بارے میں اپنا ذاتی تاثر بتا دوں گا۔ لیکن چونکہ مجھے "زخمِ تمنّا" پر تبصرے کے لئے کہا گیا ہے اس لئے شاید یہ ضروری ہے کہ اس ذاتی تاثر کا کچھ علمی ادبی جواز بھی پیش کیا جائے۔ آخر فتویٰ دینے اور تبصرہ کرنے میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہیئے۔ ! ویسے دونوں میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہوتا ہے (!)

"زخمِ تمنّا" میرے نزدیک بہت معمولی درجہ کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں کوئی چالیس کے قریب نظمیں ہیں اور پچاس سے کچھ زائد غزلیں۔ نظموں میں تین چار نظمیں آزاد نظم کی صنف میں کہی گئی ہیں اور دو ایک نظم معریٰ کی صنف میں۔ ایک خود نوشت دیباچہ بھی شامل ہے۔

ان نظموں اور غزلوں کو آپ خواہ الگ الگ پڑھیے یا ایک ساتھ، دونوں صورتوں میں پوری شدت کے ساتھ دو باتوں کا احساس ہوگا۔ ایک تو یہ کہ ان میں جن تجربات (کثرتِ استعمال سے جو الفاظ اپنا مفہوم کھو بیٹھے ہیں ان میں یہ بدنصیب لفظ بھی شامل ہے) کا اظہار ہے وہ تجربات، ان کی نوعیت، اور اس کے محسوس کئے جانے کی سطح، تینوں بیحد MEDIOCRE ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس MEDIOCRITY کا اظہار اور بھی زیادہ MEDIOCRE طور پر ہوا ہے۔ پورے مجموعہ میں کہیں بھی کوئی ایک آدھ، ہلکی سی جھلک بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ یہاں، کسی خیال میں، کسی مصرعہ میں، کسی ترکیب میں، کسی احساس میں، شاعر سینکڑوں ہزاروں نام نہاد عام شاعروں سے بلند یا مختلف ہو سکا ہے ممکن ہے اس جمہوری اور عوامی دور میں بلند یا مختلف ہونے کی بات بعض طبائع کو ناگوار گذرے لیکن شاعری اور ادب میں یہ مجبوری ہے کہ اگر آپ اپنے "ریوڑ" سے مختلف اور ممتاز نہیں ہیں تو پھر کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو — مظہر امام کی شاعری میں بیس سال کے طویل عرصے کے بعد کوئی مخصوص رنگ، آہنگ اور انداز نہیں ملتا عام طور پر آئے دن فلمی نیم فلمی اور کاروباری قسم کے رسالوں میں جس معیار کی شاعری ہوتی ہے (اب آپ مجھے بتائیں گے کہ ان رسالوں میں عصمت اور فراق لکھتے ہیں !) مظہر امام کی شاعری اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ویسے ضمناً یہ بھی بتاتا چلوں کہ وہ خود بھی ان رسائل میں لکھتے رہے ہیں۔ نمونتاً چند ایک نظموں کے کچھ بند دیکھتے چلئے۔ یہاں میں نے اس بات کا التزام رکھا

ہے کہ نمونے ان کی ابتدائی دور کی نظموں سے نہ دیئے جائیں بلکہ اس دور سے انتخاب کیا جائے جب انہیں ان کے اپنے الفاظ میں "فن اور زبان کی معمولی شدبد کے ساتھ اپنے جذبات اور محسوسات کے اظہار کا تھوڑا سا سلیقہ بھی پیدا ہو چلا تھا۔"

"انتظار":-

تو مرے انتظار میں ہوگی

میری یادوں کے نرم و نازک لب — تیرے خوابوں کو چومتے ہوں گے
میری باتوں کے میگھ دوت اکثر — دل کی وادی میں گھومتے ہوں گے
تو خیالوں میں ڈھونڈتی ہوگی — میرے ہونٹوں کی گم شدہ لذت
پلکیں آنسو سے بھیگتے ہوں گے — بھیجتی ہوگی دل پہ تو لعنت

"نگار شہر":-

جو بارِ خاطرِ نازک نہ ہو تو عرض کروں — تمہاری راہ ہے مسدود، میری نامسدود
قدم قدم پہ ہے احساسِ خستگی تم کو — ابھی ہے دور بہت دور منزلِ مقصود
دلوں کے ساز میں آہنگ کیسے پیدا ہو — تمہاری فکر ہے محدود، میری لامحدود

یہ بزمِ نازنگارانِ شہر ہے جس میں
مرے کلام، مری شاعری کا چرچا ہے

"تحفہ":-

وہ بھی دن تھے کہ سزاوارِ محبت تھا میں
جگمگاتے ہوئے فردوس کی زینت تھا میں
اپنی دنیائے مجازی میں حقیقت تھا میں

اب پلٹ آئیں وہ لمحات کہاں ممکن ہے؟

پالکی کاہکشاں کی مرے گھر آتی تھی
چاندنی رات بہ اندازِ دگر آتی تھی
ساعتِ وصل سے پہلے نہ سحر آتی تھی

پہلے جو بات تھی وہ بات کہاں ممکن ہے؟

یہ بند میں نے بغیر کسی کدوکاوش کے لئے ہیں۔ اب غزل بھی دیکھ لیجئے۔ آنکھ بند کرکے صفحات کھولتا ہوں لیجئے یہ غزل سامنے آتی ہے:-

join eBooks Telegram

کیا خبر عشق میں اے دیدۂ تر کیا ہوگا
اب ہے یہ رنگ تو پھر رنگِ دگر کیا ہوگا

رہنماؤں کو ہے پھر راہبری کا سودا
دیکھنا یہ ہے کہ انجامِ سفر کیا ہوگا

آج کی رات خیالِ لبِ لعلیں ہی سہی
کس کو معلوم کہ کل رنگِ سحر کیا ہوگا

غیریت جو سرِ محفل ہے، رہے گی باقی
ان کی خلوت سے تو ہو آئیں مگر کیا ہوگا

ہر گھڑی آگ سی سینے میں لگی رہتی ہے
دل کا یہ حال اِدھر ہے تو اُدھر کیا ہوگا

غمِ جاناں کے عوض تو نے لیا رنجِ حیات
گر یہی نفع ہے اے دل! تو ضرر کیا ہوگا

زندگی شورشِ طوفانِ حوادث ہے امامؔ
میں کہ اک شمع سرِ راہگذر، کیا ہوگا

"زخمِ تمنا" کی نظموں اور غزلوں کا لب و لہجہ اور پیرایۂ اظہار مجموعی طور پر اسی نوعیت کا ہے۔ یہ سیدھی سادھی نہایت بے ضرر قسم کی شاعری ہے۔ بے ضرر ان معنوں میں کہ اس کے مطالعہ سے کسی قسم کی خفگی، برہمی، غم و غصہ اور لطیف و نازک حسیات کے مجروح ہونے کا قطعاً احتمال نہیں پیدا ہوتا۔ اب یہ اور بات کہ یہ شاعری ایک بلند سطح پر کوئی فکری اور جمالیاتی آسودگی بھی نہیں بخشتی۔ بلند سطح شاید مبہم سی بات معلوم ہو لیکن اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ آپ ساحرؔ صاحب کی نظم تاج محل پڑھ کر اقبالؔ کی مسجد قرطبہ پڑھ لیں یا دوسری سطح پر اخترؔ شیرانی کی "آ بھی جا سلمیٰ" پڑھ کر فیضؔ کی نظم "انتظار" پڑھ لیجئے۔ شاعری محض فکر یا محض فلسفہ تو یقیناً نہیں لیکن تفکّر اور تھوڑی بہت فلسفیانہ رنگ آمیزی کے بغیر اس کا کام بھی نہیں چلتا۔ دوسری طرف اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ہے حضرات نے شاعری کو کافی نقصان بھی پہنچایا۔ کیونکہ ان سمجھدار لوگوں نے باقاعدہ نظریات و افکار کی سرپرستی میں شاعری کا پروڈکشن شروع کر دیا تھا۔ زندگی کو برت کر، انفرادی دکھ سکھ کی کھیتی سے گذر کر حادثات اور سانحات کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کا سلیقہ، اپنے دور کی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے وسیع تر اسرار پر غور و فکر کی عادت آدمی کو وہ دولت بخشتی ہے جسے اقبالؔ نے خونِ جگر سے لکھا ہوا فلسفہ کہا ہے۔ اور اس کے بغیر شاعری یا ادب میں وہ تہہ داری، وزن اور عمق نہیں پیدا ہوتا جو ADULT شاعری کے لئے ضروری ہے۔ شاعری میں ان چیزوں کا فقدان شاعر کی شخصیت کے خام اور ادھورے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

اس مجموعے کے مطالعے سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ آج کل جدید شاعری کا جو نیا دور شروع ہوا ہے وہ اگر زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کا مستحق نہیں بھی ہے تو کم از کم اس کی ضرورت اور وجود کا کافی جواز موجود ہے۔ "زخمِ تمنا" میں جو آزاد یا معرّا نظمیں شامل ہیں وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ آزاد اور معرّا نظم صرف ارکان

join eBooks Telegram

اور قافیہ کی حسبِ مرضی ترتیب سے وجود میں نہیں آتیں۔ اور زخمِ تمنا کی پابند نظمیں یہ بتاتی ہیں کہ زبان، اسالیب، عروض اور تشبیہات و استعارات سے انحراف اور استعمال میں کسی قدر بے راہروی کے باوجود جدید شاعری میں فکر احساس اور اظہار کی ایک نئی جہت کی تلاش کا جو عنصر ملتا ہے وہ زیادہ قابلِ قدر ہے یہ نسبت اس COMPLACENCY کے احساس کے جو "زخمِ تمنا" کی نظموں میں بالخصوص اور اس نوعیت کی تمام "بے ضرر" نظموں میں بالعموم ملتا ہے۔ ممکن ہے اسے آپ LESSER EVIL والی بات سمجھیں۔ لیکن کیا یہ بات بھی غنیمت نہیں ہے ؟

محمود سعید

گلِ نغمہ :-

مصنف :- ٹیگور - ترجمہ :- عبدالعزیز خالدؔ - ناشر :- مطبوعاتِ مشرق - کراچی ۱

قیمت :- چار روپے - دبیز کاغذ پر ٹائپ میں خوبصورت چھپی ہے -

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش۔ ہم اس کو پہچان ہی لیتے ہیں۔ ہمارے ادبی ترجمان کا اندازِ قد۔ وہ ہے بھی تو خاصا قد آور۔ خود ہی ایک دم اس کی غمازی کر دیتا ہے۔ عبدالعزیز خالدؔ جس نے کتنے ہی شرقی و غربی ہم نفسوں کو اپنایا ہے اور خود بھی اپنایا گیا ہے۔ اس ایک بات میں سبھی باتیں ہیں۔ ہر ترجمہ کرنے والا دوسروں کو اپنا تا بھی ہے اور خود بھی اپنایا جاتا ہے، اپنے مزاج یا صلاحیتوں کے مطابق کوئی کم کوئی زیادہ۔ ایک عجیب دو طرفہ دو گونہ عمل۔ داد و ستد کا سلسلہ۔ خالدؔ اپنانے کے پردہ میں ہتیاتا اور اپنے آپ کو بھی ہتیانے دیتا ہے۔ جس کے معنی ہیں اپنا ملمع دوسروں پر چڑھانا اور خود کو بھی اپنانا۔ بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم! اس لین دین میں کچھ سیفوؔ ہی خود کو لئے دیئے رہی ہے۔ جس کا ساز بڑی حد تک اس کا اپنا ہی ساز رہا ہے۔ خیر نہیں اس میں ہمارے جیالے شاعر کے صنفِ نازک سے طبعی گریز اور خوئے حجاب کو کس قدر دخل ہے۔ کیونکہ جس قدر گوشت پوست کے رومانوی پیکروں سے آہوئے دشتی کی طرح وہ خو کردہ رم ہے۔ اسی قدر تخیل کے شیش محل میں دیکھی ان دیکھی، حاضر و غائب، دیویں، دیو داسیوں اور اپسراؤں کے بہشتِ نظرِ رومانوی، ناشنیدہ، ہوش ربا جلوؤں کا سودائی ہے۔ شاید اسلئے کہ تخیل کو جنس و جسمانیت سے دور، لاتعلق، بے آمیز جمالیاتی سحر کاریوں سے سروکار ہے۔ جن کی حیثیت انتہا درجہ ارفع و اعلیٰ اور لطیف ہے۔ سیفوؔ کی حد تک شاید وہ اس تاریخی شعلۂ جوالہ کے نفسِ آتشیں سے گھبراتا اور کسمساتا بھی ہو۔ اس آتش نفس مغنیہ کے ہم سرشت و ہم زبان ہونے کا حق کوئی لاابالی بائرنؔ ہی ادا کر سکتا تھا۔ خالدؔ کے یہاں یہ خلا ملا سیفوؔ اور کئی اور ادبی رتنوں سے ہوتا ہوا ٹیگورؔ جیسے گن کار اور اس کی گیت انجلی تک

join eBooks Telegram

پر بلکہ شاعر کے اپنے چمکتے دمکتے، طرحدار پرِ طاؤس ہیں۔ خالد کے انداز سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی اور حیثیت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بنابریں ہمارا سروکار ٹیگور سے اتنا نہیں ہوگا جتنا خالد سے۔

ایک بڑی بات یہ ہے کہ خیالات بڑی حد تک وہی ہیں تاوقتیکہ ان کے فہم یا اندازِ بیان سے فرق نہ پیدا ہو گیا ہو۔ الفاظ بھی اصل کے لگ بھگ ہیں یا زیبِ داستان کے حامل۔ ہیئت اور پیرائے بڑی حد تک خالد کے اپنے ہیں۔ وہ گیت انجلی کے تمام نذرانہ ہائے عقیدت کو ایک نیا روپ عطا کرتا ہے۔ زیادہ زیبِ داستاں کی حد تک ہم اس کا ساتھ نہ دیں تو نہ دیں۔ اس کے معنی یہی ہوں گے کہ اس کے یہاں بیان یا الفاظ ادق ہو گئے ہیں۔ اور کبر و بطر، زنجیر نحلہ، رائق و فائق کی جگہ مانوس الفاظ ہوتے تو بہت بہتر ہوتا خالد میں کچھ وہ بھی ہے جو ٹیگور ہے اور کچھ وہ بھی جو ٹیگور کی ممد ہے۔ نصف سے زیادہ نظموں میں وہ پہلے ٹیگور کو اپنانے میں کامیاب رہا ہے۔

خالد، ٹیگور اور اس کی شاعری کی طرف شاعری کی راہ سے آیا ہے۔ نثر یا محض ترجمہ کی راہ سے نہیں۔ اس سے زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیں اصلی بنگلا گیت انجلی کا علم نہیں کہ وہ کیسی ہے۔ اردو میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ انگریزی ہی سے پیش کیا گیا ہے۔ اور فراق کی ترجمہ کی ہوئی "ایک سو ایک نظمیں" بھی اسی سے معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ انگریزی اصل کا زیادہ صحیح چربہ ہے۔ رواں دواں قسم کی آزاد نظم ایک یا زیادہ استانزے۔ غالباً بے عنوان۔ بحر لمبی، ہموار، ٹھہری ٹھہری، انگریزی ترجمہ کی اٹھان خاصی بلند اور لب و لہجہ متین۔ اکثر اردو ترجمے اسی نقل کی نقل ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر نثر میں۔ جس میں شعریت اور آہنگ کی عدم موجودگی پہلے ہی کچھ روکھی پھیکی وضع اور تشنگی پیدا کر دیتی ہے۔ بجنوری نے، جو بقول خود دس پندرہ مقامات ترجمے کئے ہیں، ان میں نثر کا عنصر غالب ہے۔ منظوم ترجمے گنتی ہی کے ہیں۔ نثر کے ترجمے محض عبارت ہی کو ادھر سے ادھر کر پاتے ہیں۔ جس میں اس کی انشائے لطیف اور فارسیت جا بجا اپنے نقش چھوڑ جاتی ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی کم نما کیوں نہ ہوں۔ سادگی و پرکاری کا خلا ملا ان میں بے جوڑ پیوند کی وہ صورت پیدا کر دیتا ہے جو نیاز فتحپوری کے یہاں ایک بارِ دِہ تکلف و تصنع کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اور ایسی صحبت ناجنس کی سب سے ناپسندیدہ صورت ہے۔ بجنوری ہے اور وہی "محاسنِ کلامِ غالب" کی انشا پرداز کنار بعید، پر پیچ عمق، ذی حیات حس تمام اعضا پر محیط، حیات کا لمحۂ خوش کامی، عالمِ امکان ترانۂ حرمت ہے سلطان الاذکار۔ ان میں ادق ہونے کے ساتھ ساتھ عبارت آرائی اور لفظ بہ لفظ ترجمانی کی کوشش بھی نمایاں ہے۔ نظم میں جو بے ساختگی، سپردگی اور بہاؤ ہونا چاہیئے اس کے برعکس بناوٹ ہے۔ جیسے نثر کو کھینچ تان کر نظم کا جامہ پہنانے اور وزن میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔

join eBooks Telegram

پہنچاہے۔ یہاں بھی اس گیت کار سے زیادہ اپنی چھاپ لیتے ہوئے ــ نام میں بھی (جو نغمہ کی نذر، نیاز، پیش کش، ہدیہ نہیں بلکہ گل نغمہ کی پُرکار شکل میں ہے جس میں بیک وقت غالبؔ بھی ہے اور خالدؔ بھی۔ اور وہ تمام شاعر بھی جن کا ان کے ساتھ "نقش ہم طرحی" درست ہے) اور پیش کش میں بھی۔

یہ ایک بڑی بنیادی بات ہے۔ اخذ و استفادہ کی کوئی بھی صورت ہو۔ من و عن یا آزاد۔ دو طرفین کا آمیزہ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں خالدؔ کی ایک ہی شرط ہے، کھیل بڑی حد تک اس ہی کا کھیل ہوگا۔ اور جو بھی کرتب برتے جائیں زیادہ تر اسی ہی کے کرتب ہوں گے۔ دوسرے کا ذوق، مزاج، مراج ــ وہ ان کے پاس آجائے تو آجائے۔ ان کو پا جائے تو پا جائے جس سے نقشِ ثانی پر پہلے نقش کی چھوٹ پڑے، ورنہ وہ تو نرگس وار آئینہ میں اپنے ہی خد و خال دیکھے گا۔ ممکن ہے یہ ترجمہ یا اخذ و استفادہ کی اس بنیادی شرط کے منافی ہو کہ اصل کو اپنا یا اور ابھارا جائے۔ وہ مقدم ہو اور اس کو اپنی زبان میں اجاگر کرنے والا موخر، لیکن خالدؔ اس شرط کو الٹ دیتا ہے۔ ہر چند وہ بت شکنی میں سبک دست ہو ــ مگر وہ ہے تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور ــ

ٹیگورؔ جیسے شاعر میں یہ بات کچھ اور بھی عجیب ہو جاتی ہے۔ ٹیگور سادگی اور محض سادگی کا شاعر ہے بڑی ہی اُبھری، بڑی ہی کھری، بڑی ہی عنصری قسم کی شاعری کا رسیا۔ جس میں نکھار ہی نکھار نظر آتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑے ہلکے پھلکے لفظ، ہاتھی دانت کے پیارے پیارے، نفیس نفیس کھلونوں کی طرح۔ اور ایسے ہی ہلکے پھلکے پیرایوں سے کام لیتا ہے۔ وہ ہم انسانوں کے بھولے بھالے بچپن کا شاعر ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے ساتھ خود بھی بھولا بھالا بن جانا پڑتا ہے تب کہیں اس کے لب و لہجہ اور اس بہاؤ کو پا سکتے ہیں۔ ورنہ دو انمل بے جوڑ چیزوں کے ٹکراؤ سے ایک نامانوس گنگا جمنی وضع پیدا ہو جائے گی۔ بعض اوقات بوجھل، بے ہنگم اور ناہموار۔ کبھی ہوبہو ٹیگور کبھی اس کے عین برعکس۔ خالدؔ نے ٹیگور کے ساتھ جو شرط باندھی ہے۔ اس سے یہ، یعنی سادگی اور وہ، یعنی پُرکاری بھی ہاتھ آتی ہے۔

این کہ مے گویند آں بہتر ز حسن   یار ما ایں دارد و آں نیز ہم !

ان دونوں کے ہونے میں کوئی برائی نہیں بشرطیکہ وہ ایک مناسب حد تک الگ تھلگ ہوں۔ اور سلیس بھی ہوں تو اس حد تک کہ وہ خوشگوار معلوم ہوں۔ اگر پُرکاری زیادہ پُرکار ہو جائے تو اس کے لئے یہی مناسب ہوگا کہ وہ بیدلؔ یا غالبؔ کی طرح بجائے خود محلِ توجہ ہو۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم کھوئے کھوئے، اصل نقل کی بات بھول ہی جائیں۔ اور اس کی تعمیر میں جو اک صورت خرابی کی ہے، اُسے نظر انداز کر کے پیش کش کو بمنزلہ طبع زاد تصور کریں۔ یعنی خواہ یہ کیسے ہی رنگ کا آئی ہو ہم اسے خالدؔ ہی کی تخلیق سمجھیں اور اس پر اس ہی حیثیت سے نظر ڈالیں۔ ایک مدغم تخلیق "گل نغمہ" کوئی مستعار چیز نہیں۔ ہنس کے اڑائے ہوئے

join eBooks Telegram

خوشی تیری اسی میں ہے، بنا اک جام گل مجھ کو
بھرے خالی کرے ہر دم زلال زندگانی سے
مبارک ہاتھ لافانی ترے چھوتے ہیں دل میرا
خوشی سے ہو کے بے قابو میں کیا تقریر کرتا ہوں
کرم تیرا ہے بے پایاں سدا کوتاہ پیمانہ
بھرے، خالی کرے ہر دم ہنوز اس میں ہے جا باقی

یہ شاعری کی سرخوشی سے بے قابو ہو کر تقریر نہیں بلکہ نثر کی بے کیفی کو زبردستی نظم کے سانچے میں ڈھکیلنے کی کھینچا تانی ہے۔ نثر میں بھی اسی طرح فارسی عربی کی تراشش خراشش اور طمطراق اس پر سایہ انداز۔ "ایک جام سفال ہوں جس کو وہ رند حقیقی رنگارنگ! سے معمور کرتا ہے، توڑ دیتا ہے، اور اعجاز کوزہ گری سے وجود میں لاکر الوانِ شراب سے لبریز کر دیتا ہے۔ نہ میرا کوتاہ پیمانہ بھرتا ہے نہ وہ میکش سیر ہوتا ہے، یہ ہماری ازلی اور ابدی لب تشنگی ہے۔"

نیاز فتحپوری کی عرض نغمہ کی ہر کوشش اس سے بھی سوا ہے۔ حمار الحطب نہ مترجم خیال کی نفاست اور باریکی کو پاسکا ہے اور نہ اس کے لئے برجستہ شعریت سے بھرپور الفاظ تلاش کر سکا ہے۔ جام گل کی جگہ کوزہ ظرف یعنی اسم بامسمیٰ ہے۔ "بھرے، خالی کرے" میں ڈرامائی عمل کی بجائے بار بار خالی کرتا ہے کا سیٹھا پن ہے۔ زلال زندگانی محض تازہ زندگی بن گیا ہے۔ معمور۔ اس قدر ٹھوس! اور سب سے بڑھ کر دائم الحدت جس کے بارے میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ اس کا اس سے بہتر روپ ممکن نہیں! سوال جوں توں کر کے لغوی اور بے حس و حرکت مرادفات تلاش کرنے کا نہیں بلکہ بیان میں جان اور کیف و رنگ پیدا کرنے کا ہے۔

فراق شاعر بھی ہے اور ہندی داں بھی۔ اس لئے توقع تھی کہ وہ ٹیگور کے گونا کو اردو میں بڑے گن اور گمبھیرتا سے سموئے گا۔ لیکن وہ بھی بہت ہی ناپ تول کر بات کہنے پر قناعت کرتا ہے۔ وہ نہ اونچائیوں میں جا سکا ہے نہ گہرائیوں میں۔ جھاگ سطح ہی سطح پر کھیلتا چھپلتا ہے۔ اور لوٹ پھر کر بات وہی چھاپ کی ہے۔ کسی اور کی بات، کسی اور کی چھاپ۔ فراق کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اصل لکیر کو جوں کا توں پیٹے جاتا ہے۔ "اگر میں جنم لیتا کالیداس کے زمانے میں ـــ" سوال ہے، "اگر میں کالیداس کے زمانے میں ہوتا" کیوں نہ ہو؟ کیا اس سے بات بگڑتی ہے یا سنورتی؟ یہی وجہ ہے کہ پیر مدرسہ، نیاز کی طرح اسے بھی جا بجا توسین میں الفاظ دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کوئی آزاد رو کبھی اس طرح اصلی کی پرچھائیں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ وہ بڑی بے باکی سے غزالانِ رم خو کو اپنے تخلیق کئے ہوئے الفاظ کی کمند میں گرفتار کرتا ہے۔ اور قادر الکلام ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک ہی نظم کو مختلف

join eBooks Telegram

قلم کاروں کے ہاتھ میں دیکھئے۔

جہاں قلب بے خوف ہے اور سر بلند رہتا ہے۔
جہاں علم آزاد ہے۔
جہاں دنیا خانگی دیواروں کے جھگڑوں! میں ٹوٹ کر پرزے پرزے نہیں ہوگی۔۔ (دنیا ز)
جہاں دل خوف سے خالی ہے، جہاں سر اونچا ہے۔
گیان جہاں آزاد ہے، جہاں گھر کی چاردیواری نے دن رات اپنے آنگن میں دھرتی کو چھوٹا بنا کے نہیں رکھا ہے۔ (فراق)

آنگن اور دھرتی پھر بھی اس محل پر گوارا ہیں، لیکن گیان! یا ٹھیٹھ ہندی ہو یا اردو خط کشیدہ حصے میں خیال کسی انجانی چاردیواری میں گھر کر کچھ کا کچھ بن گیا ہے۔

اس ہی نظم کو ڈاکٹر خالد نے بھی عرصہ ہوا اردو کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس کے چند اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

جس جگہ سر منتِ تسلیم سے آزاد ہو
دل کا آئینہ غبارِ بیم سے آزاد ہو
تنگیٔ دیوار ہائے خانگی کے ہاتھ سے
ٹکڑے ٹکڑے ہوں نہ جس جا عالمِ ایجاد کے
ہے تمنا یہ بہشتِ حریت آباد ہو
اے مرے آقا! جہاں میرا وطن آزاد ہو

"گل نغمہ" میں اس کا انداز یہ ہے۔

جہاں ذہنِ بے خوف سر ہے بلند
جہاں علم کی دولتِ ارجمند
ہوا کی طرح مفت و آزاد ہے
جہاں خانگی تنگ تقسیم سے
نہیں ریزہ ریزہ قوامِ جہاں!
ہیں پردردۂ صدق تہ لفظیں جہاں

بیشک اس نقش کی حد تک خالد پہلے خالد کا حریف نہیں ہو سکا۔ مگر گیا خود ٹیگور بھی اس کا حریف

join eBooks Telegram
ہے؛ غالباً اصل نظم ہی بیان سادگی سے بڑھ کر شگفتگی اور شکوہ کی حد تک نہیں پہنچا۔ اُردو شاعر نے اصل پر نمایاں ترقی کی ہے۔ جہاں تک آخری نمونہ کا تعلق ہے یہ دوسروں سے بلند تر نہیں تو کم تر بھی نہیں۔

خالد کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے تراجم کو شعریت دی ہے، ان میں اپنا پن پیدا کیا ہے۔ کتنے ہی مقامات پر اصل کو بہت کچھ چمکایا اور بڑھایا ہے۔ اس نے وہی ایک آہنگ مسلسل اور یکساں وضع و ہیئت ہی برقرار نہیں رکھی بلکہ اس میں بے حد رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ اس نے گنتی کی عام طور پر مروج بحریں ہی نہیں برتیں بلکہ ۶۰ بحریں برتنے کی مثال قائم کر دی ہے۔ اور ان میں سے اکثر بحریں خاصی کامیابی سے نئے امکانات کے نئے راہیں وا کر کے برتی گئی ہیں بعض بحروں کا آہنگ ترنمی ہے، نظم و نثر کے بین بین۔ وزن کی جکڑ بند اور کڑے ناپ تول سے آزاد۔ یہ بات ہمیں گائیتری جیسے بھجنوں اور ڈرامہ میں کام آنے والی بحروں کا راستہ بتاتے ہوئے اُس مسئلہ کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے جو ڈرامائی، رزمیہ اور طویل بیانیہ نظموں کی صنف اور بحر سے وابستہ ہے۔

"گل نغمہ" کا حقیقی مایۂ امتیاز اس کی بھرپور شعریت ہے۔ ایک سیلان جو ہر کہیں وضع و اسلوب اور شوخی فکر کے نت نئے سجل جزیرے ہی جزیرے تراشتے چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں خالد کا نابغہ اور علمی پس منظر دونوں مل کر کار نمایاں کرتے ہیں۔ اور ہر قدم پر یادگار نقوش چھوڑ آتے ہیں۔ دوسرے ہمراہیوں کو پُر معنی تکنکھیوں سے دیکھتے ہوئے۔

بہار آفرینا! ترے فیض نے
کہ ہے گلشن آرائے کون و مکاں

یہاں گلشن آرائے کون و مکاں ٹیگور نہیں خالد ہے اور بہار آفرینا میں خالد کے ساتھ غالب بھی ہے۔ گو غالب کا شریک ہمیشہ شریک غالب ہی ہوتا ہے۔ اس سے ضمناً خالد کا علمی و وجدانی پس منظر بھی جھلکتا ہے۔ پیشکش کی ایک نئی بُعد۔ کوزۂ ظرف، جام گل۔ جام سفال، سبوئے سفالینہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ مگر پہلی دو میں شاعری کی مے سُرخ نہیں ہے۔ سبوئے سفالینہ زندگی اور شاعری دونوں کی مے سُرخ سے لبریز ہے۔ ذرا اور آگے بڑھیے۔

ہے پت جھڑ کے پردے میں گویا بہار!
میں اک عُودِ نالندہ ہوں اور تُو
مغنّی کہ آتش نوا جس کا نام!
مدام اک نیا زمزمہ چھیڑتا
خیاباں وادی میں محوِ خرام

یہاں ذوق ہی ذوق ہی ذوق ہے۔ اور شاعری کی مخصوص علامات شدت سے نمایاں۔ اگر شاعر کی

join eBooks Telegram

بات کے تو نئے ایسے ہی کہنی چاہیئے۔ کیونکہ شاعری کا فیشن پیرایہ یہی ہے۔ اس سے حسن و جمال کی بوجا حسن تسکین ہوتی ہے۔ ایک باذوق قاری کو یقیناً ایسی پیشکش کا آرزومند ہونا چاہیئے۔ ایک اور مصرع ہے۔ تو دریا نوال اور میں کوزہ دست۔ یہاں اوک کی تصویر بڑی اچھوتی بھی ہے اور دلنشین بھی۔ اور پھر رہٹ کے کوزوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ دونوں صورتوں میں تخلیق اور جدت نمایاں ہیں۔ بڑے اونچے پیمانے پر۔ یاد کیجئے نیاز فتحپوری کی دائم الجدت اور اس کا موازنہ "مدام اک نیا زہر سر چھوڑتا" سے کیجئے۔ یہ تمام تر پرانے اور نئے ذوق کا فرق بر فراق کہتے ہے۔

بارہ مہینے محنت کرتا ہے دھوپ اور بارش میں

اس کے برعکس

لو چلے، دھوپ پڑے، مینہ برسے

اتنی زندگی، اس قدر حرکت! چند اور جستہ جستہ پارے:-

صبحدم پہلی کرن کے سفری رتھ پر سوار

اے حبیب ستارہ نظر

پتوں میں تھی سنساہٹ

انجانی ظلمت سے کوئل

چنتا بھری لے میں بولی

"گل نغمہ" کا دامن ایسے گل پاروں سے بہار اندر بہار ہے۔ جن میں فن کا قوام اور تخلیقی عمل زیادہ نادر ہے۔

توڑے شاخ سے یہ ننھا پھول

مجھے ڈر ہے کہیں یہ آتشِ تر !

بجھ نہ جائے ہوائے صرصر سے

یہ مہکتا گہر یہ خرمن زر

ہو نہ جائے بکھر کے، مرجھا کر

جز گرد و غبار و خاکستر !

تلازمات بجائے خود اس کی ندرت کا ثبوت ہیں۔ ننھا پھول، آتش تر۔ ہوائے صرصر سے بجھ جانا۔ پھول مہکتا گہر بھی اور خرمن زر بھی۔ تینوں۔ آگ، گہر اور خرمن کا انجام۔ گرد اور راکھ۔ ہوائے صرصر کا دوہرا

join eBooks Telegram

عمل۔ آگ کو بجھانا اور پھول کو مرجھانا۔

اس سے بھی زیادہ تخلیق کی نمود اس تیم پارے میں ہے۔

خورشید بافیدہ پیلی تیرگی
کی نرم شیریں حریری خستگی

کیونکہ اس میں تصور و بیان دونوں تمثیل روپی ہیں۔ یہ بات اردو میں فی الحال شاذ و نادر ہے۔ خورشید بافیدہ۔ پیلی تیرگی۔ نرم شیریں حریری خستگی۔ یہ سب نکرے بالکل اچھوتے انجانے مگر کڑے موڑ کی خبر دیتے ہیں۔ ویسے ہر نوع کی شگفتہ اور اعلیٰ پایہ کی حسن کاریں۔ الفاظ، ترکیبیں، تمثیلیں، تیور، اشارے، باریکیاں، بحریں۔ کی بہتات اس مجموعہ سے گزر کر خود اردو شاعری کو بھی ادی انت حد تک شاداب رنگ کرتی ہے۔

تیرے آہنگ کا نوریں جھرنا
گل و لالہ کے احمریں شہر میں
جب گل سرخ بنا غنچۂ نیلوفر صبح
اور زرپوش ہوا جادۂ بیراہ کویر
کف صندلیں سے نگار صبا
دن ڈھلا ہاٹ ہو گیا سونا
چھا گیا کنج کنج سناٹا
شہپر نوا لیں گے
تن گیا ہے سدا جاگتے نیلگوں چرخ پر
بادلے کا نقاب
بن میں بجتا نہیں
آبنوسی رباب
اور گونجے میرے سپنے مدھ بھری گونجار سے
کیا کیا براتیں، جلوس کیسے
گل بازیاں کرتے، غل مچاتے
شادی کی شہنائیاں بجاتے

join eBooks Telegram

چھم چھم گزرتے ہیں سامنے سے !
وہ کیف کے لمحات ارغوانی
اقلیم مسرت کے کاروانی
وعدے کے تعطر سے شیریں
میگوں ، بسنتی
خوشبو سے بوجھل
روشن دنوں میں
جنگل کی ٹیڑھی
پگڈنڈیوں سے
وہ آرہا ہے
وہ آرہا ہے
نت آرہا ہے
اس کے قدم کا
لمس طلائی
اس سرخوشی کو
کرتا ہے صیقل !
سیلاب صبح سکوت آلودہ میں
موج نوائے فسوں پرور اٹھی
دور کوئی کڑکتی ہے بجلی
ہڑبڑا کر زمیں تھرتھرائی
اور دیوار و در زلزلائے
نیند میں بعض یوں بڑبڑائے
یہ تو پہیوں کی ہے گڑگڑاہٹ

روشنی یہ روشنی میری ذاتی روشنی
انفس و آفاق میں تھرتھراتی روشنی

join eBooks Telegram

پتلیوں کو چومتی چھپاتی روشنی!
دل میں شکر گھولتی گنگناتی روشنی

جب کبھی میں چومتا ہوں تجھ کو دلارے
تاکہ نکلیں گدگدی سے غنچے لبوں کے
تب میں سمجھتا ہوں نیل زار افق پر
رہگذر آسماں سے بہتی ہے کیسی
نور بھری چھپاتی جوئے مسرت!
تو اپنے ابگینہ سینے پہ کہریلی چادر
ہزاروں پیچ و خم سے گونہ گوں طرز و ادا سے
ہے ترکیب اس سحابی شال کی قوس قزح کی

ہے یہی نغمہ، لچکتی ڈالیوں
سرسرانے پات کا
جب سنکتی ہے ہوا
بھیگے ساون کے اندھیرے صحن میں!

کوئی چیز طبع زاد ہو یا ترجمہ، دونوں میں ایک بڑا سوال یہ ہے کہ شاعری تاثر روپی ہو یا بیان روپی۔ خود ٹیگور کی بانی بعض اوقات بیان روپی ہوتی ہے۔ جس سے لازماً شاعری کی کسک اور کلپنا ابھر کر گن روپی نہیں بن پاتی۔ اور یہ بات کچھ خود ہی اور کچھ دوسرے ہاتھوں آنے سے اور بھی سوا ہو جاتی ہے۔

ہوئی تاخیر و التواء اتنی
اے خداوند رازق و فائق
مجھ سے سرزد ہوئیں خطائیں بھی
جوق در جوق لوگ آتے ہیں

ظاہر ہے کہ ایسے مقامات پر اظہار کے ڈانڈے نظم و نثر سے جا ملتے ہیں۔ اور فن کی خلائی پرواز زمیں گیر ہو جاتی ہے — نہ سوز و گداز، نہ کیف و رنگ — اور نہ شاعری۔ تاثر کو تو ابلکہ

join eBooks Telegram

شہپرِ نوا دینے کے امکانات اتنے ہی ہیں جتنے خود شاعری کے امکانات۔ "گل نغمہ" میں یہ امکانات کسی حد تک روشن ہوئے ہیں، یہ اس سلسلہ میں آخری سوال ہے۔

"صاحب غزلیات" — غالؔد اور ہم راہِ سخن وا کر چکے ہیں۔ دیکھیں دوسرے رندانِ خرابات نشین اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

رفیق خاور

○

مکتبۂ خوشتر نگ کی تین مطبوعات

ادب اور کلچر
مصنف: شش اختر
ادبی سماجی اور ثقافتی مسئلوں پر تنقیدی مضامین کا ایک خوبصورت مجموعہ۔

درد کا رشتہ
شش اختر کے مختصر افسانوں کا دلکش انتخاب جو انگریزی، بنگالی، سندھی اور ملیالم زبانوں میں چھپ کر داد حاصل کر چکے ہیں۔

کہاسے اور کلیسا
چھوٹا ناگپور کے آدی باسی قبیلوں پر لکھا گیا اردو کا پہلا ناول۔

ملنے کا پتہ: مکتبۂ خوشتر نگ۔ ۳۔ ڈورنڈا اردو بازار۔ رانچی۔

join eBooks Telegram

"آپ کے رسالے کی امتیازی حیثیت بہت واضح ہے۔ اردو میں سوغات سے زیادہ ماڈرن لٹریچر کا نمائندہ اور کوئی نہیں۔ آپ جو چیزیں پیش کر رہے ہیں ان میں سے بہتوں کا اب تک ہم نے صرف ذکر ہی سنا تھا۔ براہِ کرم یہ بتائیے کہ "سوغات" کے پہلے شمارے کے ملنے کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔ میں 'اڈون میور' کے مضمون کو پڑھنے کا نہایت مشتاق ہوں۔"

نظیر صدیقی

"اب کے سوغات مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ باقر کا مضمون اچھا ہے۔ خاص طور پر وہ مقامات جہاں وہ خالد کی تعریف کرتے کرتے تھوڑا رکتے ہیں یا تنقید کرتے کرتے صبر سے کام لینے لگتے ہیں۔ "زیادہ لکھ جانے" والی بات بہت پتے کی تھی جس سے مجھے بھی استفادہ کرنے کا خیال آیا کیونکہ ہم لکھتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ افسانوی ادب میں تو ان کہی بات کہی ہوئی بات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

یہ صحیح بات ہے کہ پرانے اور کلاسیکی ادب سے ہمارا ربط ہونا چاہیئے اور اس سلسلے میں خالد کا ادب ایک Contribution سہی لیکن انہیں پڑھکر نہ جانے کیوں مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ دنیا بھر کا علم خالد کا پس منظر ہے اور وہ خالص طبعزاد چیزیں لکھیں۔ یہ بات میں اپنی طرف سے بہت سوچ سمجھ کے کہہ رہا ہوں۔

'اُونا موو' کی کہانی میں ڈان مینوئل کے کردار نے مجھے اس طرح متاثر و مسحور کیا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ 'اُونا موو' پر آپ کے مضمون اور باقر کی تنقید کے بعد "میں؟" ایک جملۂ معترضہ لگا۔ آپ نے اپنے خط میں میرے اس مضمون کی تعریف کی ہے اس لئے اخلاقاً اسے بُرا بھی نہیں کہہ سکتا۔ "جی، میں تو کچھ بھی نہیں"، کے سلسلے میں آپ نے بھی مجھ سے اتفاق کر لیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟"

راجندر سنگھ بیدی

"اس شمارے کی تمام چیزیں پرمغز اور فکر انگیز ہیں۔ سوغات کے گزشتہ شماروں میں اور تازہ شمارے

join eBooks Telegram

میں بھی یہ چیز واضح طور پر نظر آتی ہے کہ سوغات کی ترتیب میں ایسا انتخابی شعور موجود ہے جس کے تحت رسالے میں قدیم و جدید طرزِ فکر کا ایک دلفریب امتزاج نظر آتا ہے۔ اس شمارے کی غزلیں سوائے دو تین کے تمام کلاسیکی مزاج کی حامل ہیں۔ ناصر شہزاد اور بشیر بدر کی غزلوں میں کچھ نیا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ ناصر شہزاد کی غزل منٹگمری کے اُس مخصوص رنگ کی نمائندگی کرتی ہے جو منیر نیازی کی شاعری سے متاثر ہے۔ ان غزلوں میں جاذب نظر امیجری تو موجود ہے لیکن احساس کی گہرائی مفقود ہے۔ بشیر بدر کی غزل میں شاعری کم الفاظ کی کاریگری زیادہ ہے۔

نظموں میں سرِ فہرست محمد اسد خان کی تین خوبصورت نظمیں ہیں۔ جہاں تک انہیں میں سمجھ سکا ہوں تینوں نظمیں موضوع اور موڈ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس کے علاوہ "جلائی کا گیت" "نیل کا سیلاب" "نروان" اور "دھرتی ماتا" بھی اعلیٰ درجے کی چیزیں ہیں — یہ نظمیں قاری میں جمالیاتی احساس بھی پیدا کرتی ہیں اور اُسے دعوتِ فکر بھی دیتی ہیں۔"

گوہر نوشاھی

"سوغات کے نئے شمارے کی تمام چیزیں پڑھیں اور جی لگا کر پڑھیں۔ آپ کا اداریہ بہت بھرپور ہے۔ اُدنا مونو کے تصورات اور فکر کے تمام پہلوؤں کو اور اُس کی عظیم کہانی "سینٹ مینوئل بونو شہید" کی خوبیوں کو جس وضاحت خلوص اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ آپ نے اُجاگر کیا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے۔ سب سے اہم بات آپ کی نثر کی پاکیزگی اور خوبصورتی ہے جو ہمارے بہت سے مشہور نقادوں کو نصیب نہیں۔ مثال کے طور پر اسی شمارے میں ممتاز حسین کا مضمون پیش کیا جا سکتا ہے۔ خیال ذہن میں واضح نہ ہو تو اسی قسم کے "الجھاؤ" پیدا ہوتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد پر باقر مہدی نے جس محنت سے مضمون لکھا ہے وہ محنت مجھے رائگاں جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ عبدالعزیز خالد کے کلام میں فکری و ڈرامائی عناصر تو بعد کی چیزیں ہیں دور دور تک شاعری کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ بیدی صاحب کا "میں" اُن کے افسانوں کی طرح سادہ پُرکار ہے کسی نے سچ کہا ہے کہ ادیب جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے اُس کا "میں" چھوٹا ہوتا جاتا ہے اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ "میں" بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ بیدی صاحب کی زندگی میں وہ دن تقریباً آ چکا ہے"۔

شہریار

"سوغات کا ہر شمارہ پڑھنے کے بعد ذہن میں ایک لمبا چوڑا خط اُبھرتا ہے کبھی اس کو کاغذ پر اُتار دیتا ہوں کبھی نہیں اتارتا۔ تازہ ترین شمارے میں اونا مونو کی کہانی۔ نے مجھے بہت دنوں تک اپنی گرفت میں رکھا۔ نظم، غزل، تنقید، کہانی ہر لحاظ سے موجودہ شمارہ بھرپور ہے۔ پھر بھی اونا مونو کی کہانی اُسی خصوصی توجہ کی مستحق

join eBooks Telegram

تھی جو آپ سے اُس کو ملی۔ مجھ کو اس کہانی سے اتنا تعلق نہیں رہا جتنا اُس کے پڑھنے کے بعد ایک فکری ردِعمل سے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں نے سوچا اس میں آپ کو شریک کروں۔

"یارب! یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" یہ جملہ ہمیشہ سے مجھے کھٹکتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ یہ جملہ "اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ" کے تصور سے جا ٹکرایا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح آپ اونامونو کی کہانی کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال سے جا ٹکرائے ہیں۔

ڈان مینوئل کی تنہائی اپنے شبنمی حسن کے باوجود ایک مہیب چیز ہے۔ اس تنہائی کو عہدِ گذشتہ کے متصوفین اور ہمارے عہد کے ذہین افراد بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ تنہائی گناہِ پیدائش کا کفارہ یا بے حجاب حقیقت کی دین، جو کچھ بھی ہو، اس کو جس چیز نے نمودار کیا ہے وہ "میرے ریوڑ" کا تصور ہے۔ اپنے علاوہ سب کو "میرا ریوڑ" کہہ دینے کے بعد یہ تنہائی فرد کا مقدر ہے۔ اس تنہائی کے خلا کو لانگھنے کے لئے "کلکم راع وکلکم مسئول فی رعیتہ" میں چھپی بصیرت شاید کچھ مدد کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بلندی پر پہونچ کر پستی والوں کو ہمدردی سے دیکھنے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ ان کے ساتھ بلند ہوگا چاہے اس میں دیر لگے یہ دائمی رفتار کا عمل ہے راعی جو رعیت بھی ہوگا اس کے راز میں، رعیت، جس کا ہر فرد راعی بھی ہے، بالقوۃ اور بالفعل شریکِ سہیم ہوگی۔ یہ رفاقت کا فلسفہ ہے جو تنہائی کے لئے جگہ نہیں چھوڑتا۔ اس رفاقت کی بنیاد اس فکر پر بھی ہے جو شبنمی شعریت کے ساتھ ساتھ الماسی صلابت رکھتی ہے اور عشق کی اُس کہربائی طاقت پر بھی جو ہر لمحہ وسیع تر اور سادہ سے پیچیدہ تر ہوتی رہتی ہے جو ایک طرف نسلِ انسانی کی یتیمی ختم کر کے باپ کے بجائے رفیقِ اعلیٰ کا تصور اسے دیتی ہے۔ اور دوسری طرف "انا عبدٗ مثلکم" کہہ کر گلہ کے احترام کو بحال کرتی ہے! یا اجتماعیت کو بچوں کی ٹولی سمجھ کر کسی بڑی حقیقت کے ادراک سے باز نہیں رکھا جا سکتا انہیں کھلونے دیکر بہلایا نہیں جا سکتا ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ انکشافِ راز کے تلخ ترین مقامات سے گزر جائیں گے اس لئے کہ جس مقام سے ہم نہ گزر سکیں وہ ہمیں نگل لیتا ہے اگر گزر جائیں تو اس کی رفعت ہم میں جذب ہو جاتی ہے۔

آگہی کی غارت گری کا تصور بھی ناقابلِ فہم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آگہی کا کوئی مقام غارتگر ہو جس سے ہم آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور شاید اس سے گزر جانے کے بعد اس یقین کی تلاش جاری رہ سکے اور گذشتہ مقام کی غارت گری کی تلافی ہو جائے۔

الوہی نگاہ سے دنیا کا مشاہدہ سفر کا اختتام کیوں بن گیا؟ شاید اس لئے کہ الوہی نگاہ سے دنیا کے مشاہدہ کے بعد الوہی عشق و عمل میں شرکت نہ کی گئی ——— "سیزر کا حق سیزر کو دو" یہ جملہ الوہی عمل میں شرکت کی نفی کرتا ہے ——— خدائی تجلی جس پر نازل ہو وہ اسے عشق و عمل کے دائروں میں

join eBooks Telegram

وسیع کرنا چاہتی ہے۔ اگر وسعت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر پاش پاش ہوجانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں —— وہ مراقبہ کی خود تحلیلی کے مقام سے آگے بڑھ کر حق و ناحق اور حقوق و فرائض کے معرکوں میں خود آشکارائی چاہتی ہے۔ اسی تصادم میں وہ اپنی فتوحات کے دائرے کے مطابق وسیع ہوتی رہتی ہے، بتدریج قوت پذیر ہوتی ہے اور اتنی بلندی تک پہنچ سکتی ہے کہ موت کا کرب آلود سناٹا، طبیعیاتی جبر کی ہر یخ بستہ ظلمتیں سب ہی پگھل کر انسانی تمنا کی کوکھ سے ظہور پذیر زمانے کی رو میں ڈھل جاتی ہیں —— تب یقین ایک مفروضے کی بجائے ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ جب تک انسانی وحدت اپنے ہر رُخ، ہر پہلو کے ساتھ، اپنی رفتار، سمت اور منزل کے ساتھ، ہماری نگاہ میں نہ ہو ہم الوہی وحدت سے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔ اور خدا کی دید کسی مجہول یک طرفہ نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔

مجہول یک طرفہ نقطۂ نظر کا مطلب ہے کہ ہم اپنی پسندیدہ صفات چُن کر ایک خدا تشکیل دیں، جس کی تجلّی ہم تک پہنچے تو ہمارے انفرادی خول سے آگے نہ جاسکے۔ جو صرف عبادت کدوں کا خدا ہو اور گھروں کا، عدل گاہوں کا، ریاستوں کا، لشکروں کا خدا نہ ہو —— جس خدا کے نمائندے کے آگے گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد گناہ ختم ہوجائے۔ بجائے اس کے کہ جو جبلّتیں گناہ کا سرچشمہ ہیں اُنہیں اُن کا مناسب حق دے کر اُن کا ارتفاع عمل میں لائے، اجتماعی قوانین، سیاسی نظم سب مل کر انسان بننے میں انسان کی مدد کریں اور پھر بھی اگر وہ ٹھوکر کھائے تو اعتراف کے ذریعے دل ہلکا کرنے کے بجائے اپنی ذمہ داری کے مقام پر فائز ہو، سزا و جزا کے قانون کو قبول کرے، پچھتاوے کے تصور کے بجائے تلافی کے عمل کو قبول کرے۔

انسان کی مسرت انسان کے خواب (یعنی اُس کی بے خبری۔ جن معنوں میں اُونا مونو نے اسے استعمال کیا ہے) میں نہیں ہے اُس کی مکمل بیداری میں ہے۔ یہ بیداری جو مسرت کی امین ہے بیک وقت اُس کے شعور، جذبہ اور عمل کی بیداری ہے —— بیداری بنیادی کیفیت ہے۔ اور خواب (جن معنوں میں اُونامونو نے استعمال کیا ہے) ایک عارضی کیفیت —— اسی طرح زندگی اور مسرت دائمی کیفیتیں ہیں اور غم اور موت عارضی طور پر حائل ہونے والی کیفیتیں —— زندگی مسرت اور بیداری انسان کا شعوری عمل ہے —— اب یہ سب چیزیں یعنی زندگی، مسرت، بیداری اور عمل آپس میں اس طرح اُلجھ گئیں کہ جب تک ان کے مجموعے کا نام انسان نہ رکھیں یہ سُلجھ نہیں سکتیں۔

میرا خیال ہے کہ میں اس موضوع پر بہک گئی ہوں اس لئے اسکو یہیں چھوڑ دیجیے۔ ان سب چیزوں کا اونامونو کی کہانی سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا انسانی ذہن کے اُفق پر چھائی ہوئی اس دھند سے جس نے صدیوں سے ہمیں گھائل کر رکھا ہے۔"

شفیق فاطمہ شعریٰ

join eBooks Telegram

نقش کراچی

ادبی ڈائجسٹ

نقش، ہر ماہ معیاری رسائل سے انتخاب پیش کرتا ہے۔
نقش، کو پاک و ہند کے عظیم فنکاروں کا تعاون حاصل ہے۔

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اردو، پوسٹ بکس ۳۰۲۷، کراچی ۳

فون نمبر:- ۵۶۱۰۷

join eBooks Telegram

QUARTERLY SOUGHAT

عبدالعزیز خالد کی چند کتابیں

سرودرفتہ	یونان قدیم کی عظیم شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپے
غزل الغزلات	عہد نامۂ عتیق کا نغمۂ سلیمان	ایک روپیہ پچھتر پیسے
دکان شیشہ گر	منظوم ڈرامے	تین روپے
برگ خزاں	منظوم ڈرامے	چار روپے
ورق ناخواندہ	منظوم ڈرامے	تین روپے
سلومی	دوسرا ایڈیشن مع اضافہ ترگوم	تین روپے پچاس پیسے
گل نغمہ	رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی اردو شعر میں	چار روپے
زنجیر رم آہو	طویل و مختصر نظمیں	دو روپے
کلک موج	افکار تازہ	۷ روپے پچاس پیسے
ماتم یک شہر آرزو	با ایڈیشن رلکے کے نوحے	(زیر طبع)
زرداغ دل	نیا ایڈیشن	(زیر ترتیب)

دوآبہ کواپریٹیو پبلیشرز لمیٹڈ

۹۳ نیو کلاتھ مارکیٹ بندر روڈ کراچی

فون ۳۱۳۵۵